14 ت

یکے از مطبوعاتِ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور

دولتِ مغلیہ کی ہیئتِ مرکزی

از

ابنِ حسن

مترجمہ

عبدالغنی نیازی

زیرِ نگرانی

حامد علی خان

مجلسِ ترقیِ ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

The Original Work in English
"The Central Structure of the Mughal Empire"
was published by
Oxford University Press, London

ناشر
کریم احمد خاں معتمد مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع
رہبر پرنٹنگ پریس ، بل روڈ ، لاہور
زیر اہتمام مرزا محمد صادق

باجازت و شکریہ بیگم صاحبہ ابن حسن مرحوم

قیمت: بارہ روپے
۱۹۵۸ء

دیباچہ

مسٹر ابن حسن نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں چند الفاظ ان کی کتاب Central Structure of the Mughal Empire in Northern India پر بطور تعارف لکھ دوں - چونکہ میں ان کا معلم ہوں اور میری ہی نگرانی میں انھوں نے یہ "تھیسس" مرتب کیا ہے جس پر انھیں پی - ایچ - ڈی کی ڈگری عطا کی گئی ہے اس لیے میں تصدیق کر سکتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں گہری تحقیق اور محنت شاقہ سے کام لیا ہے - میرے نزدیک یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ کوئی ماخذ ہندوستانی یا انگریزی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا اور جہاں تک مغلوں کی مرکزی حکومت کا تعلق ہے، اس کی تحقیق اس وسیع پیمانے پر کی گئی ہے کہ اس سے قبل اس کی مثال نہیں ملتی - آیندہ زمانے میں یہ کتاب "آئین اکبری" کے ساتھ ملا کر پڑھی جائیگی اور مغلوں کی تاریخ کے تمام محقق اس کو حرز جاں بنائیں گے -

اس کتاب میں سب سے زیادہ انسانی دلچسپی کی چیز مولف نے یہ لکھی ہے، کہ مغل شہنشاہ مملکت کے نظم و نسق میں کس قدر سرگرم حصہ لیتے تھے اور ایک منظم حکومت کے ذریعے سے اپنی بادشاہی کے نصب العین کی تکمیل میں کیوں کر کوشاں رہتے تھے - اس حکومت کے نظام کو اکبر نے

پایۂ تکمیل تک پہنچایا - یہ شہنشاہ اوقات کار کی جس پابندی کی توقع اپنے وزرا سے کرتا، اس کے مطابق اپنے اوقات بھی منضبط کرتا، اپنا پورا دن کثیر اور محنت طلب مشاغل میں گزارتا۔ طلوع آفتاب کے فوراً بعد رعایا کو "درشن" دیتا، غروب آفتاب کے خاصی دیر بعد تک مصروف کار رہتا - اس کی صبح کی مصروفیتیں مسلسل ساڑھے چار گھنٹے جاری رہتی تھیں۔

مسٹر ابن حسن نے کار و بار مملکت سے اکبر اور اس کے دو جانشینوں کی "غیر حاضری" کے جو وجوہ بیان کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر حاضری صرف علالت طبع یا ماتم تک محدود تھی۔

اس کتاب میں مملکت کے شعبوں کا پورا حال، وزیروں اور عہدہ داروں کے فرائض و وظائف کی پوری تفصیل اور عدلیہ کے نظام کا خاکہ واضح کیا گیا ہے۔ ان موضوعات کے متعلق شاید ہی کوئی ایسا سوال باقی ہو جس کا جواب اس کتاب میں مہیا نہ کر دیا گیا ہو۔ ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ مسٹر ابن حسن اپنی اس تحقیقات کو جاری رکھیں گے اور مغلوں کی صوبجاتی حکومت کے نظام کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچائیں گے۔

لندن ۲۷ ستمبر ۱۹۳۲ء ای - ڈینی زن راس

نوٹ

نہایت تاسف و اندوہ کا مقام ہے کہ ابھی یہ کتاب زیر طبع ہی تھی کہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۵ء کو مولف کا انتقال ہو گیا۔

میں اور مولف کتاب دونوں ۱۹۱۵ء میں ایم اے او کالج
علی گڑھ میں داخل ہوئے تھے۔ اس زمانے سے لے کر آخر تک
ہمارے دوستانہ تعلقات روز افزوں رہے اور بیس برس کے عمیق
ربط ضبط کی وجہ سے میں شہادت دے سکتا ہوں کہ مرحوم کو
از منہ متوسطہ کی تاریخ ہند سے غیر معمولی شغف تھا اور وہ
چاہتے تھے کہ ملک کی تاریخ کے اس دور کے متعلق جو
غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں ان کو دور کر دیا جائے۔ ان
کی بے وقت موت نے اس موضوع کو ایک دیانت دار اور محنتی
محقق سے محروم کر دیا اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ایک قابل معلم
اور راقم الحروف سے ایک بے نظیر دوست چھین لیا۔

مرحوم اس کتاب کی دوسری جلد کے متعلق جس میں وہ مغلوں
کی صوبجاتی حکومت کے حالات مرتب کرنا چاہتے تھے، کچھ
مواد چھوڑ گئے ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ جونہی حالات سازگار
ہوں اس مواد کو شائع کر دیا جائے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی
مستحق تشکر ہیں جنھوں نے اس کتاب کے پروف نہایت توجہ سے
پڑھے اور مسٹر جانکی پرشاد (دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی) کا بھی
دلی شکریہ ہے کہ انہوں نے بالکل جدید اسلوب کے مطابق اس کتاب
کا ایک جامع انڈکس تیار کر دیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن　　　　　حبیب الرحمان

جون ۱۹۳۶ء

فہرس

تصاویر

ہدیۂ تشکر

اس کتاب کے ناشر مندرجہ ذیل حضرات کے شکر گزار ہیں :

۱ - برٹش میوزیم کے ٹرسٹیوں کے ــــ جنھوں نے اپنے ہاں کے بعض مخطوطات کے اقتباسات اور ''سعداللہ خاں'' اور ''دربار شاہ جہاں'' کی تصاویر کو نقل کرنے کی اجازت عطا فرمائی -

۲ - مسز ہیول اور میسرز تھیکر سپنک اینڈ کمپنی لمیٹڈ (۱۹۳۳) کلکتہ کے ــــ جنھوں نے ای - بی - ہیول کی کتاب ''ہینڈ بک ٹو آگرہ اینڈ دی تاج'' سے شاہ جہاں کے دستخط و مہر شاہی نقل کرنے کا موقع دیا - اور

۳ - میسرز برنرڈ کوارچ لمیٹڈ لندن کے ــــ جنھوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان کی تحریروں کی تصویر سر ٹامس آرنلڈ کی کتاب ''بہزاد اور اسکی تصاویر'' سے اخذ کرنے کی اجازت دی -

اختصارات

عفیف	= تاریخ فیروز شاہی -
آئین	= آئین اکبری از ابوالفضل -
اکبر نامہ	= اکبر نامہ از ابوالفضل -
بدایونی	= منتخب التواریخ -
برنی	= تاریخ فیروز شاہی -
بینی پرشاد	= The State in Ancient India
بیورج	= ترجمہ اکبر نامہ از ایچ - ایس - بیورج -
بلاک مین	= ترجمہ آئین از ایچ بلاک مین -
برہمن	= چندر بھان برہمن مصنف چہار چمن -
ڈیلائٹ	= Empire of the Great Mogul
گھوشال	= A History of Hindu Political Theories طبع دوم -
لاہوری	= بادشاہ نامہ -
مآثرالامراء	= مآثرالامراء از صمصام الدولہ -
معتمد	= اقبال نامہ -
صالح	= عمل صالح -
تزک	= تزک جہانگیری -

تمہیدات

حدود بحث

حدود بحث ہمارا موضوع بہ لحاظ جغرافیہ شمالی ھند تک اور بہ لحاظ تاریخ ۱۵۶۰ء (آغاز حکومت اکبر) اور ۱۶۵۷ء (اختتام حکومت شاہ جہان) کے درمیانی زمانے تک محدود ھے۔ بہ لحاظ نفس مضمون ھمیں سلطنت مغلیہ کے صرف مرکزی نظم و نسق سے سروکار ھے۔

اس کتاب کا مقصد اکبر کے عہد میں مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کا ایک خاکہ پیش کرنا اور اس بات کا جائزہ لینا ھے کہ یہ نظام حکومت اکبر کے ان پہلے دو جانشینوں کے زمانے میں کس حد تک عملاً قائم رہا جنھوں نے صدق دل سے اکبر کی حکمت عملی کی پیروی کی، اس کے وضع کردہ اصولوں کو عملی صورت دی، اور اس کے قائم کردہ انتظامات کو ایسی مستقل حیثیت بخشی کہ وہ اس قوت کے زوال کے بعد بھی برقرار رھے جس نے انھیں ابتداءً قائم اور نافذ کیا تھا۔

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ھے۔ پہلے حصے کے دو باب ھیں:۔

(الف) بادشاہ اور مملکت میں اس کی حیثیت

(ب) بادشاہ اور کاروبار حکومت میں اس کا عملی حصہ

پہلے باب سے مقصود اسلامی نظریۂ حکومت یا اس منصب کی تشریح نہیں ہے جسے فقہاے اسلام ''خلافت'' کے نام سے بادشاہ کی ذات سے منسوب کرتے ہیں - یہاں مقصود صرف اس نصب العین کی توضیح ہے جو ایک ہندوستانی بادشاہ کے پیش نظر رہتا تھا ، اُن فرائض کو بیان کرنا ہے جو اُس کے ذمے ہوتے تھے ، ان توقعات کی تفصیل بتانا ہے جنھیں ہندو سیاسی مفکرین اور ان کے ہم عصر مسلم مورخین اس کی ذات سے وابستہ سمجھتے تھے اور خود مغل شہنشاہ اپنی حیثیت کے بارے میں جو تصور رکھتے تھے ، اس کو واضح کرنا ہے -

دوسرے باب میں ان تمام تدابیر کا ذکر ہے جو اکبر نے ہندوستانی نقطۂ نظر کے مطابق فرائض سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں اختیار کیں - اس باب میں ایک ہندوستانی حکمران کے اُس نظام عمل کی بھی تشریح ہے جسے اکبر نے مخصوص ملکی تقاضوں کی تکمیل کے لیے قائم کیا - نیز اس میں بادشاہ سے متعلق رعایا کی توقعات کا ذکر بھی ہے - اسی جگہ ایک فصل میں وہ قانونی ضابطہ بھی مذکور ہے جس کے مطابق فرمان یا احکام شاہی تحریر میں آتے تھے -

دوسرا حصہ عہد اکبری میں وزارت کی از سرنو تنظیم کے متعلق ہے یہاں ہم نے وکیل سلطنت (وزیراعظم) کے مرتبے کی تعین کی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ وہ اختیارات وفرائض جو مسلم ممالک میں وزیر کے عہدے سے وابستہ ہوتے ہیں کس طریقے پر تقریباً یکساں اقتدار، منصب اور حیثیت کے چار وزرا پر تقسیم ہوئے - ان مباحث

کے لیے دوسرے حصے میں حسب ذیل پانچ فصلیں قائم کی گئی ہیں:-

۱- وکیل مملکت---وزیراعظم
۲- دیوان---وزیر مال گزاری و خزانہ
۳- بخشی---وزیر عساکر
۴- میر ساماں---وزیر کارخانہ جات و ذخائر حکومت مرکزی
۵- صدر---وزیر عدل و امور مذہبی

ان فصلوں میں اُن فرائض و اختیارات کے علاوہ جو وزرا کو مختلف محکموں کی صدارت کے رو سے حاصل تھے، یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہر محکمے کا اندرونی کاروبار کس طرح چلتا تھا۔ تمام مباحث کی تائید اس عہد کے تاریخی شواہد سے کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ پانچ فصلیں پوری کتاب کے ایک بڑے حصے پر حاوی ہیں۔ مذکورہ پانچ فصلوں کے علاوہ اس حصے میں ایک فصل اور بڑھائی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے مقابلے میں وزرا کی حیثیت کیا تھی اور ان کے اختیارات کے استعمال پر کیا کیا پابندیاں عائد تھیں۔

تیسرے حصے میں سلطنت کے نظام عدل کا ایک خاکہ دیا گیا ہے۔ یہاں ایک اسلامی مملکت کی اس ہیئت عدلیہ کی از روئے فقہ اسلامی تشریح کی گئی ہے جسے سلاطین مغلیہ نے بطور نمونہ استعمال کیا اور بڑی حد تک برقرار رکھا۔

آخری فصل میں نتائج بحث کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اس کتاب میں سلاطین مغلیہ کے انتظامی شعبوں کا عہد حاضر کے انتظامی شعبوں

سے موازنہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی نہ مغلیہ نظم و نسق میں انتظام سلطنت کے اس اعلیٰ معیار کے آثار تلاش کرنے کی سعی کی گئی ھے جو سائنسی ترقی، لاسلکی آلات اور طیّاروں کے اس موجودہ دور میں قائم ہوا ھے۔ لہذا اس کتاب میں مغلوں کے نظم و نسق سلطنت کا جائزہ نہ تو نئے معیاروں سے لیا گیا ھے اور نہ اسے اس بنا پر ناکارہ ثابت کیا گیا ھے کہ وہ نظم حکومت کے جدید ترین معیاروں پر پورا نہیں اترتا۔

اس کے برعکس اس کتاب کی بنیاد ھی اس خیال پر ھے کہ ھر حکومت کا دستور اور ھیئت نیز اس کے فرائض اور کارناموں کی نوعیت و وسعت بہت بڑی حد تک متعلقہ ملک کی جغرافیائی خصوصیات، اس کے باشندوں کے خیالات، ان کی سیرت اور ان کی فہم و فراست کے معیار پر منحصر ہوا کرتی ھے۔ ایک خاص زمانے میں کسی مخصوص ملک کا نظام حکومت کیا تھا، وھاں کے باشندوں نے اس نظام حکومت کی کس حد تک تائید وحمایت کی اور کس حد تک اس کی مخالفت کی یہ وہ آئینے ھیں جن میں خود ان باشندوں کے خیالات اور ان کی سیرت کا عکس نظر آتا ھے۔ کسی ملک کا نظام سلطنت جتنا زیادہ اُس ملک کی مخصوص ضروریات کے مطابق ھوگا اتنا ھی وہ اس ملک کے باشندوں کے حق میں مفید ھوگا، خواہ وہ ضروریات عسکری ھوں، خواہ سیاسی، خواہ اقتصادی۔ لہذا ان خصوصیات کی توضیح کی غرض سے تمہید کے ایک حصے میں شمالی ھند کے جغرافیائی حالات بیان کر کے یہ بتایا گیا ھے کہ اس علاقے کے باشندوں اور یہاں کے طرز حکومت پر ان حالات کا کیا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ عہد مغلیہ سے تین سو سال قبل تک مسلمانوں کی

حکومت سے متعلق تجربات و معلومات کا خلاصہ بھی اس میں درج کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مغلوں نے کس حد تک ہندوستان کے ماضی کی خصوصیات کو افکار و اعمال میں برقرار رکھا۔ مغلوں کے نظام سیاسی کی تشکیل میں خود اُن کے خیالات و تصورات ذہنی کو کس حد تک دخل تھا، اور کس حد تک اس پر بیرون ہند کی مسلم حکومتوں کے سیاسی طور طریقوں کا اثر پڑا۔

اس موضوع سے بحث کرتے ہوئے میں نے آخر تک اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ اس مواد میں اضافہ کرنا جس سے نتائج مستنبط ہو سکیں، ایسے نتائج کے استنباط سے کہیں بہتر ہے جو ناکافی مواد پر مبنی ہوں۔ میں نے نظریّے مرتب کرنے یا فیصلہ صادر کرنے سے زیادہ اپنی کوششوں کو واقعات کی ترتیب اور ان حالات کی تشریح تک محدود رکھا ہے جن کے ماتحت وہ واقعات ملتے ہیں۔ ہر حصۂ کتاب کے آخر میں جو نتائج درج کئے گئے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جو متعلقہ حصے میں مندرج واقعات کے مطالعے کے بعد قدرةً مستنبط ہوتے ہیں۔

پہلے خیال تھا کہ اس کتاب میں صوبائی نظم و نسق کا ذکر بھی شامل کر دیا جائے اور مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے متعلق بھی ایک باب کا اضافہ کیا جائے لیکن اس موضوع کا مطالعہ کرنے پر جو مواد ہاتھ آیا اس کی فراوانی کے پیش نظر، نیز موجودہ کتاب نے جو ضخامت اختیار کر لی، اس کا لحاظ کرتے ہوئے مذکورۂ بالا عنوانات کا اس کتاب میں شامل کرنا ناممکن نظر آیا۔ لہٰذا مذکورہ موضوعات سے متعلق مواد کو اس

کتاب کے بعد دو مزید جلدوں میں علحدہ علحدہ شائع کیا جائے گا۔

آخر میں مجھے اپنے استاد سر ڈینی سن راس کا شکریہ ادا کرنا ھے کہ اُنھوں نے اس کتاب کی تیاری کے زمانے میں میرے کام میں گہری دلچسپی لی، مجھے ھر موقع پر مفید ھدایات دیں اور نہایت توجہ سے کتاب کے ھر باب کا مطالعہ کرنے میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ میں لندن یونیورسٹی اور جامعۂ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) کا بھی شکر گزار ھوں جن کی مالی امداد کی بدولت یہ کتاب بہ آسانی شائع ھو سکی۔

مآخذ

اس پوری کتاب کی تالیف میں ان اصلی مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے جن میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اُن سے اب تک کسی دوسرے مورخ نے قطعاً کام نہیں لیا۔ جو مواد اس طرح ہاتھ آیا ہے اس میں ہم‌عصر یوروپین سیاحوں کے بیانات کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس کی تصدیق ایسے تاریخی واقعات سے کی گئی ہے جو اس زمانے کے تذکروں کے ہزارہا اوراق میں جابجا منتشر ہیں۔ ان میں سے اکثر کا ترجمہ ابھی تک انگریزی زبان میں نہیں ہؤا تھا۔

جن مآخذ سے کام لیا گیا ہے انہیں آٹھ گروہوں میں اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

(۱) متعلقہ زمانے کے وقائع۔

(۲) ہم عصر فارسی تصنیفات۔

(۳) نظم و نسق مغلیہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والے فارسی مخطوطات۔

(۴) خطوط و مراسلات کے مجموعے۔

(۵) کتب سیر۔

(۶) اصول سیاست پر فقہائے اسلام اور دیگر مصنفین کی کتابیں۔

(۷) یوروپین سیاحوں کی تحریریں -

(۸) تصانیف جدیدہ -

۱ - وقائع

اکبر نامہ | اکبر کے آئین و انتظام سلطنت کے مطالعے کی بنیاد ابوالفضل کے اکبر نامہ پر قائم ہے -

اس سلسلے میں بالعموم آئین اکبری کا ذکر مقدم سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے - مؤخرالذکر کتاب ان تجربات کے نتائج پر مشتمل ہے جو اکبر کے زمانۂ حکومت میں کیے گئے تھے - علاوہ بریں اس کے مندرجہ حقائق مربوط و مرتب نہیں ہیں - اکبر کے دور حکومت کے انتظامی شعبوں کا قیام کس جذبے کے ماتحت ہؤا، ان کے قیام میں کیا مشکلات پیش آئیں، ان وزرا کے فرائضِ منصبی کیا تھے جنھوں نے ان شعبوں کو قائم کیا اور آخرکار انھیں ایک واضح اور قطعی صورت دی؟ یہ تمام امور اسی وقت پوری طرح سمجھ میں آ سکتے ہیں جب اکبر نامہ کے تقریباً سترہ سو صفحات کا مطالعہ، صبر و سکون کے ساتھ اول سے آخر تک کر لیا جائے - یہ دونوں کتابیں اگرچہ اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتی ہیں لیکن ایک دوسری سے غیر متعلق نہیں ہیں اوردونوں ہی کا مطالعہ ضروری ہے، کیونکہ بقول مسٹر مورلینڈ ”دونوں کتابوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جو بجائے خود تمام ضروری معلومات بہم پہنچا سکے - لیکن دونوں کو ملا لیجیے تو تقریباً تمام مطلوبہ مواد مل جاتا ہے“ -

اکبر نامہ نہ صرف اکبر کے عہد حکومت کی معتبر ترین تاریخ ہے بلکہ اس میں مملکت کی تمام متنوع سرگرمیوں کی صحیح صحیح کیفیت بھی مل جاتی ہے کیونکہ اس میں ان کا ایک ایک پہلو صحت اور صراحت سے اجاگر کر دیا گیا ہے۔ مصنف کی امتیازی حیثیت، حکومت کے مختلف انتظامی امور کی بابت اس کا عملی تجربہ، سلطنت کے ہر اہم معاملے سے اس کا ذاتی تعلق، تمام سرکاری کاغذات تک اس کی رسائی، اس کا تبحر علمی اور اس کی حیرت انگیز قوت بیان، یہ سب ایسی خوبیاں ہیں جن کے باعث اس کی دونوں تصنیفات بے انتہا بیش قیمت ہوگئی ہیں۔ مسٹر بلاک مین [BLOCHMANN] کہتے ہیں کہ ''ابوالفضل پر اکثر یوروپین مصنفین خوشامدی ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ان سب باتوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے جن کے بیان کرنے سے اس کے آقا کی شہرت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن حق یہ ہے کہ اگر اکبر نامہ کا سرسری مطالعہ نہیں، تو اس کا غائر مطالعہ ضرور اس الزام کو قطعاً بے بنیاد ثابت کر دیتا ہے...... اس کتاب کا ہر صفحہ اس کی حق پسندی، اس کی صحت معلومات کا شاہد ہے......'' (دیباچۂ آئین۔ صفحہ ۶)

ہر مصنف کا طرز تحریر جدا اور اس کا اسلوب بیان مختلف ہوتا ہے اور وہ اسی وقت اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے جب اس کی تصانیف کا مطالعہ دقیق نظر سے کیا جائے۔ ابوالفضل کا طرز تحریر بعض اوقات یقیناً بہت مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس کے مخصوص جملوں اور خاص خاص محاوروں کی تکرار بالآخر مفہوم کو واضح اور مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔

مثلاً ہم بہ آسانی یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اُن دو بے قصور لڑکیوں کے قتل کو ناروا قرار دیتا ہے جو مالوہ میں ماہم انگہ کے بیٹے ادہم خان کے قبضے میں تھیں اور جنھیں ماہم انگہ نے محض اس لئے قتل کروا دیا تھا کہ کہیں وہ شہنشاہ کے حضور میں راز فاش نہ کر دیں ۔ اکبر اس قصور کو نظر انداز کر دیتا ہے ، لیکن ابوالفضل اپنی کتاب میں اس واقعے کو نظر انداز نہیں کرتا ۔ وہ اسے قلمبند کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی فوراً شہنشاہ کےعفوو درگزر کی تعریف بھی شروع کر دیتا ہے.....

" بنازم بر حوصلۂ دریا آشام کہ .....چنیں خطا ہائے فاحش را نا کردہ انگارد" (جلد دوم - صفحہ ۱۴۳) مطلب بالکل واضح ہے اس واقعے کو ضبط تحریر میں لانے کی دوسری کوئی صورت ممکن نہ تھی اور جس صورت سے ابوالفضل نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے وہ قابل داد ہے ۔ اسی طرح وہ حسین مرزا کی شکست کے بعد گجرات میں اُس کے قتل کو بھی بے جا سمجھتا ہے ۔ حسین مرزا قطعی طور پر اکبر کے حکم سے قتل کیا گیا تھا ۔ ابوالفضل کو اکبر کے کسی فعل پر علانیہ نکتہ چینی کرنے کی مجال نہ تھی، لہذا وہ اپنا مافی الضمیر یوں بیان کرتا ہے کہ اُس کے قتل کی سفارش راجہ بھگوانداس نے کی تھی جو یہ تجویز پیش کرنے میں حق بجانب نہ تھا ۔

اس کی تنقید سے نہ منعم خاں وکیل محفوظ رہتا ہے نہ راجہ ٹوڈرمل ، کوئی شحض خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اُس کی نکتہ چینی سے نہیں بچتا ۔ بنگال میں مظفر خاں کی سیاسی حکمت عملی پر اس کی تنقید، اس کا صوبائی عمّال حکومت کو بغاوت

کا ذمہ دار قرار دینا، اور اُس کے وہ دس دلائل جو اُس نے اپنی رائے کی تائید میں پیش کئے ہیں، نہ صرف اس کی صاف گوئی کے گواہ ہیں بلکہ یہ بات بھی واضح کر دیتے ہیں کہ وہ اصل صورت حال کا کتنا اچھا اندازہ کر سکتا تھا اور ایک دور دراز صوبے کے ذمہ دار عمّال حکومت کے فرائض کے بارے میں اس کا تصور کیا تھا۔

اسی طرح جہانگیر کے طرز عمل پر اس کی نکتہ چینی اور اکبر کے زمانۂ حکومت کے اختتام کے قریب جہانگیر کی روش پر اعتراضات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ ابوالفضل نہایت صاف گو اور صاحب جرأت وقائع نگار تھا۔

اس کتاب کے آئندہ ابواب کے مطالعے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اکبر کے نظم و نسق کے شعبوں نیز ان کے طریقۂ کار سے متعلق اکبر نامہ میں کافی مواد موجود ہے۔

آئین اکبری

آئین اکبری، اکبر نامہ کا تیسرا حصہ ہے۔ مسٹر بلاک مین (BLOCHMANN) نے آئین کے موضوعات پر بالوضاحت روشنی ڈالی ہے۔ آئین میں صرف اکبر کی حکومت کے مختلف محکموں کی تفصیل ہی موجود نہیں بلکہ اُس کی مخلوط نسلوں اور مختلف طبقوں میں بٹی ہوئی رعایا اور حکومت کے باہمی تعلقات کی وضاحت بھی کی گئی ہے...... آئین میں محکوم جماعتوں کے ذکر کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے اور ان کے حالات اس خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ ان جماعتوں کے افراد ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ وہ امور جو اس زمانے میں اہم سمجھے جاتے تھے، وہ کلیے جو اس

وقت مسلمہ تھے، وہ اصول جن پر اس عہد میں عمل ہوتا تھا، وہ توہمات جن میں اس زمانے کے لوگ مبتلا تھے، وہ خیالات جو اس عہد میں رائج تھے، وہ کامیابیاں جو قابل حصول سمجھی جاتی تھیں، ان سب کی نہایت صحیح، واضح اور خوش رنگ تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں،، (دیباچہ صفحہ ۵) تا ہم اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اگر آئین اکبری کے ساتھ اکبر نامہ کا مطالعہ نہ کیا جائے تو وہ نتیجہ نہیں نکل سکتا جس کا ذکر بلاک مین نے کیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ دونوں کتابوں کا مطالعہ ایک ساتھ کیا جائے۔

ابوالفضل کے انتقال کے بعد فوراً ہی اُس کی ناموجودگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اکبر نامہ کے آخری حصے پر جو عنایت اللہ کی تصنیف ہے نظر ڈالتے ہی طرز تحریر کی تبدیلی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس حصے میں نہ ابوالفضل کا سا اُستادانہ اسلوب نگارش ہے، نہ اُس کا سا زور بیان، اور نہ اس کی طرح ناقدانہ جرأت ہی کا کہیں نشان ملتا ہے۔ تاہم اکبر کی زندگی کے آخری ایام اور اس زمانے کے واقعات کے متعلق مستند ترین تصنیف یہی ہے۔

تُزکِ جہانگیری

یہ محض حسن اتفاق تھا کہ جہانگیر نے اپنے حالات اور اپنے عہد حکومت کے بیشتر واقعات خود نوشتہ چھوڑے۔ اپنی ذات اور اپنی حکومت کے متعلق اس کے خود نوشتہ حالات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مختلف جنگوں کے مفصل اور مکمل حالات، ان کے اغراض و مقاصد، دکن میں شاہی فوجوں کی شکستیں، شاہی سپہ سالاروں کی باہم نااتفاقیاں، ان کا جلد جلد تبدیل ہوتے رہنا، فرائض منصبی کے سلسلے میں ان کی کوتاہیاں، ان سب امور کا مفصل ذکر ’’تُزک‘‘ میں ملتا ہے۔

انتظام سلطنت کی بابت معلومات کے لئے یہ تصنیف انمول ہے ۔ اپنے زمانۂ حکومت کے ہر دور میں اور ہر اہم موقع پر جہانگیر پرزور الفاظ میں اپنی یہ دلی تمنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ اکبر کے مقرر کئے ہوئے اصولوں کے مطابق عمل کرے ۔ وہ اپنے باپ کی کامیابیوں پر نازاں ہے اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی مضطربانہ خواہش رکھنے پر بھی ایک قسم کے فخر کا اظہار کرتا ہے ۔ اس نے اپنی حکومت کے تمام انتظامی ضابطوں کا بالتفصیل بیان کیا ہے ۔ تزک میں بادشاہ کے واقعات زندگی ، اس کے روزمرہ کے معمولات اور اسکی ذات سے متعلق تمام امور ، چند مستثنیات سے قطع نظر ، صاف صاف اور پوری دیانت داری کے ساتھ ، بیان کردیے گئے ہیں ۔ مطالعہ کرنے والے کو بالتدریج اس کے بیانات کی صحت پر کامل یقین ہوتا جاتا ہے ۔ اس کی حکومت کے پہلے پندرہ سال اس کی زندگی کے بہترین سال تھے ۔ سولھویں سال کے آغاز کے ساتھ ہی اس کی ناکامیوں ، مصیبتوں اور خرابی صحت کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے ۔ جیسے جیسے اس کی پریشانیاں زیادہ ہوتی جاتی ہیں اس کے خود نوشت حالات میں جزئیات نگاری کا عنصر بھی کم ہوتا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ پریشانیاں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں ۔ یعنی مہابت خان اسے قید کر لیتا ہے ۔ اس کے بعد تزک سے جہانگیر کا ''قلمی'' تعلق منقطع ہو جاتا ہےاور اس میں اس کی جانب سے کچھ نہیں تحریر کیا جاتا ۔ وہ ذلت آمیز واقعات اس قابل نہ تھے کہ انھیں قلمبند کیا جاتا ۔

تزک اس لحاظ سے بھی بہت گراں قدر ہے کہ اس میں سلطنت کے مشہور وزراء اوردوسرے عہدیداروں کے حالات صحیح صحیح بیان کردیے گئے ہیں ''تزُک'' میں ان کے متعلق جو آراء درج ہیں، کسی دوسرے مورخ کی آراء ان کے برابروقیع نہیں سمجھی جا سکتیں۔

اس زمانے کے تاریخی ذخیرے میں ایک دوسرا اہم اضافہ بھی تزُک کی بدولت ہوا۔ یعنی اس میں اجمیر، مالوہ، گجرات، پنجاب اور کشمیر کے شاہی دوروں کے حالات بھی درج ہیں۔ جن سے ہمیں سلطنت کے مختلف حصوں، صوبائی معاملوں، اور دیہات کی صورت حال کا علم بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے اُمور ہیں جن کا ذکر عام طور پر شاہی تذکروں میں نہیں کیا جاتا۔

تزک کا ہر صفحہ جہانگیر کے ذاتی حالات اور اس کی شخصیت کا آئینہ ہے اوراس لحاظ سے یہ کتاب بیش بہا ہے یہی وجہ ہے کہ پروفیسر بینی پرشاد نے اپنی تصنیف تاریخ جہانگیر (THE HISTORY OF JAHANGIR) میں اس سے پوری طرح استفادہ کیا ہے۔ جہانگیر کے انتظام سلطنت اور اُس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق جو مواد ''تزک'' میں ملتا ہے اُسے پہلی مرتبہ اسی کتاب میں استعمال کیا گیا ہے اور اُس کے نظم و نسق کے بارے میں قطعی رائےقائم کرنے کےلئےاس مواد کی جانچ پرتال بڑی ناقدانہ نظر سے کی گئی ہے

(جلوس کے) سولھویں سال تک تزک میں جہانگیر اپنے حالات خود لکھتا رہا لیکن اُس کے بعد جب وہ دکن سے واپس آیا تو یہ کام معتمدخاں بخشی کےسپرد ہوگیا۔ آنیسویں سال تک معتمدخاں جہانگیر کے نام سے حالات قلمبند کرتا رہا۔ کیونکہ خود جہانگیر کی نگرانی میں

یہ خدمت انجام دی جاتی تھی - اُنیسویں سال کے بعد معتمد خاں نے جو کچھ لکھا، اپنے نام سے اور اپنی ذاتی تصنیف اقبال نامہ کے ایک جزو کی حیثیت سے لکھا - مولوی محمد ہادی نے جہانگیر کے آخری زمانے تک حالات قلمبند کر کے اسے مکمل کیا اور سرسید احمدخان کے ہاتھوں مکمل تزک کی اشاعت ہوئی - روجرز (ROGERS) نے اسی کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے لیکن یہ ترجمہ صرف انیسویں سال تک کے حالات کا ہے -

بادشاہ نامہ

اکبر کی طرح شاہ جہان نے بھی اس امر پر خاص توجہ کی کہ اس کے عہد سلطنت کی ایک معتبر تاریخ مرتب ہو جائے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے ایک مستقل عملہ مامور کیا - بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید لاہوری میں اس کی سلطنت کے پہلے بیس سال کے حالات مذکور ہیں - یہ تقریباً ۱۶۰۰ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے جسے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے - اس کے کسی حصے کا ترجمہ بھی اب تک انگریزی میں نہیں ہؤا -

اسی طرز کی دوسری کتاب محمد صالح کمبوہ کی عمل صالح ہے - اگرچہ وہ اتنی ضخیم نہیں ہے تاہم اس کی وہ دو جلدیں جنھیں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال شائع کر چکی ہے اور جن میں شاہ جہان کی سلطنت کے بیس سال تک کے حالات درج ہیں، تقریباً ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں - تیسرا حصہ ابھی تک مکمل طور پر شائع نہیں ہؤا - باقی ماندہ زمانۂ سلطنت کے حالات کے لیے میں نے برٹش میوزیم کے (م-ت- ۲۶۲۲۱) سے مدد لی ہے جو مذکورہ

میوزیم کے اُن مسودات میں سے ایک ہے جو بہترین نقش ونگار سے مزین ہیں۔

صالح نے اس کتاب میں شاہ جہاں کی حکومت کے آخری زمانے تک کے حالات قلم بند کیے ہیں، لیکن اُس کے آخری صفحات میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ ان صفحات میں بادشاہ کی نقل و حرکت اور اس کے زمانے کے خاص خاص حالات کے سوا اور کسی بات کا ذکر نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ عہد حکومت شاہ جہان کے آخری پانچ سال کے حالات کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس عہد سے متعلق دیگر کتب تاریخ سے بھی فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ یہ دونوں مورخ یعنی لاہوری اور صالح شاہی ملازمت میں تھے اور انھیں خاص طور سے ان کتابوں کے لکھنے پر مامور کیا گیا تھا۔ اگرچہ پہلے بیس سال کے تاریخی حالات تمام و کمال بادشاہ نامہ ہی میں قلمبند ہو چکے تھے تاہم صالح نے بھی ان کو اپنی تالیف میں شامل کر لیا ہے۔ جہاں تک تفصیلات کا تعلق ہے صالح کی بہ نسبت لاہوری کی کتاب زیادہ کار آمد ہے لیکن طرز بیان اور ادبی محاسن کے لحاظ سے لاہوری کی بہ نسبت صالح کہیں زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ عہد شاہ جہانی کے شعراء و فضلاء کی فہرستیں بھی شامل ہیں۔

ان کتابوں میں ہمیں شاہ جہانی عہد کے نظم و نسق کے بارے میں کافی مواد مل جاتا ہے اور یہی اُس زمانے کے خاص تاریخی ماخذ بھی ہیں لیکن ان کے مطالعے سے ہماری نظر میں عہد اکبر کے مورخ ابوالفضل کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ ان میں نہ تو

ابوالفضل کا سا فاضلانہ انداز بیان ملتا ہے اور نہ سلطنت کے ذمہ دار و بااختیار عہدہ داروں پر اس کی سی بے باکانہ تنقید۔ تاہم شاہ جہاں کے وقائع نگار بھی اپنے زمانے کے واقعات و عوامل کا مشاہدہ دقت نظر سے کرتے ہیں اور اپنے شہنشاہ کے سوانح حیات بھی نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ انتظام سلطنت میں ان کے بادشاہ نے جو حصہ لیا اسے انھوں نے بھی اسی طرح نمایاں طور پر بیان کیا ہے، جس طرح اکبر کے منظورنظر وقائع نگار نے اکبر کے نظم و نسق کا بیان کیا ہے۔

شاہ جہاں کے تنخواہ دار وقائع نگاروں کی حیثیت میں اور ابوالفضل کی حیثیت میں جو فرق تھا اسی کی وجہ سے اول الذکر اپنی تالیفات میں سلطنت کے اعلی عہدہ داروں پر اس قسم کی جرأت مندانہ اور بے لاگ تنقید نہ کر سکے جیسی اکبر نامہ میں ملتی ہے۔

۲ - متعلقہ عہد کی فارسی تصانیف

مذکورہ بالا تالیفات کے سلسلے میں بعض اور کتابیں بھی ملتی ہیں جو انھیں بادشاہوں کے زمانوں کے بعض دیگر مشہور مورخین کی تالیفات ہیں۔ اکبر کے عہد حکومت کے متعلق نظام الدین کی **طبقات اکبری** اور عبدالقادر بدایونی کی **منتخبات التواریخ** نہایت مفید ہیں۔ ابوالفضل کی طرح یہ دونوں مؤرخ بھی دربار سے وابستہ تھے اور انھوں نے صرف ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو ان کے چشم دید تھے یا جن کا انھیں ذاتی علم حاصل تھا۔

انتظامی معاملات کے متعلق میں نے عبدالقادر کو نظام الدین سے زیادہ مفید پایا ہے۔ بدایونی کی کتاب سے اب تک خاص طور پر اکبر کے عہد کی مذہبی نزاع کے بارے میں استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ بدایونی نے اسے اپنی کتاب میں حنفی عقائد کے ایک سچے علمبردار کی حیثیت سے بہت نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن انتظام سلطنت کے مختلف شعبوں کے متعلق جو بے شمار معلومات اس کی کتاب میں ملتی ہیں، ان کا استعمال پہلی مرتبہ میں نے اپنی اس کتاب میں کیا ہے۔ اکثر وہ تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتا ہے اور بعض اوقات ایسی مفید تفصیلات بھی بہم پہنچاتا ہے جو اکبر نامہ میں نہیں ملتیں۔ مثلاً صدر اعلیٰ کے محکمے کی کارگزاری کے متعلق وہ بہت بیش قیمت معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ اس دور کے متعلق اتنی تفصیل دوسری کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ اگرچہ اس کا شمار خود علمائے دین کے طبقے میں تھا لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس جماعت کے بعض افراد کے اعمال پوری جماعت کی بدنامی کا باعث بن رہے ہیں تو وہ ان پر بھی نہایت بے باکی سے نکتہ چینی کرتا ہے اور انہیں قابل ملامت گردانتا ہے۔ اسی طرح سلطنت کے اعلیٰ افسروں پر اس کی تنقید، ابوالفضل کی تالیف کا، اس باب میں، محض تتمّہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ اس کے بعض مندرجات کی اصلاح بھی کرتی ہے۔ مثلاً ابوالفضل اس امر کے متعلق کچھ نہیں کہتا کہ منعم خاں اور مظفر خاں کے زمانے میں خواجہ جہاں کا رویّہ بہ سلسلۂ انتظام سلطنت کیسا رہا، لیکن بدایونی اسے رشوت ستانی اور بداعمالی پر صاف اور صریح الفاظ میں مطعون کرتا ہے۔ ابوالفضل، قاضی علی بغدادی کی

بہت تعریف کرتا ھے کیونکہ اس کی نظر میں وہ ایک ایسا قابل اور کارگزار حاکم تھا جس نے مختلف اوقات میں مختلف حیثیتوں سے سرکاری خدمات انجام دی تھیں، لیکن بدایونی کی کتاب کے مطالعے سے ظاھر ہوتا ھے کہ وہ ایک ایسا شرانگیز آلہ کار تھا جسے اکبر علمائے دین کے خلاف ھر طرح استعمال کرتا رھتا تھا۔ دیگر معاملات میں اس کے بیانات زیادہ تر ابوالفضل کی تائید ھی کرتے ھیں اور بہ حیثیت مجموعی اس کی کتاب ابوالفضل کی کتاب کا ایک مفید تتمّہ ھے۔ ان دونوں مورّخوں کی کتابوں کے ناقدانہ مطالعے سے ان کے عہد کے اہم واقعات اور اعلیٰ شخصیتوں کی بابت صحیح صحیح رائے قائم کرنے میں بہت مدد ملتی ھے۔

جہانگیر کے عہد سے متعلق معتمد خاں کا اقبال نامہ بھی بہت کار آمد تالیف ھے۔ معتمدخاں جہانگیر کی حکومت کے سولھویں سال میں دربار شاھی سے متعلق ھو کر بادشاہ کے ساتھ ساتھ رھا اور جیسا بیان ھو چکا ھے وہ جہانگیر کے عہد حکومت کے انیسویں سال کے خاتمے تک شنہشاہ کے زیر ھدایت تزک جہانگیری کے لکھنے میں مصروف رھا۔ اس سال تک اس کی وقائع نویسی صرف چند اضافوں کے استثناء کے ساتھ کم و بیش تزک ھی کا خلاصہ ھے۔ مثلاً وہ بیان کرتا ھے کہ جہانگیر کے عہد حکومت کے چوتھے سال میں اعتمادالدّولہ اس وجہ سے اپنے عہدے سے برطرف کر کے قید کر دیا گیا تھا کہ اس کا بیٹا شہزادہ خسرو کی رھائی کی سازش میں شریک تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اس کے بیٹے کو قتل کی سزا دی گئی اور پھر کچھ وقت گزرنے پر اعتمادالدّولہ کو ایک کثیر رقم

بطور جرمانہ ادا کر کے رہائی حاصل ہوئی - حکومت کے انیسویں سال کے بعد کے حالات کے لیے، جب تزک جہانگیری کے قلم بند کرنے کا کام موقوف ہو چکا تھا، معتمد خان کی کتاب ہی واحد مستند ذریعۂ معلومات ہے - جب مہابت خان نے جہانگیر کو اچانک گرفتار کر لیا، اس وقت معتمد خاں بھی فرودگاہ شاہی میں بخشی کی حیثیت سے موجود تھا اور بعد ازاں شہنشاہ کو قید سے چھڑانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں ان میں بھی اس نے عملی حصہ لیا تھا۔ اس حیثیت میں وہ نور جہاں کی تمام سرگرمیوں سے بھی واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ نظم و نسق سلطنت میں نور جہاں کا عمل دخل کتنا ہے - وہ نور جہاں پر اور اس کے بھائی آصف خاں پر، جس نے نورجہاں کے مجوزہ ولی عہد سلطنت کی مخالفت کی تھی، یکساں بے لاگ نکتہ چینی کرتا ہے - وہ نہایت جرأت کے ساتھ اعتمادالدولہ پر بددیانتی اور اس کے جانشین خواجہ ابوالحسن پر بد خلقی (ترش روئی) کا الزام لگاتا ہے -

محمد ہادی نے جب تزک جہانگیری کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تو اس باب میں اس نے زیادہ تر معتمد خاں ہی کی تصنیف سے مدد لی -

مآثر رحیمی میں جہانگیر کے عہد حکومت کے متعلق تو کافی مفید معلومات مل جاتی ہیں، لیکن اس میں ایسی معلومات بہت کم ملتی ہیں جن کا تعلق براہ راست انتظام سلطنت سے ہو -

تہوّر خاں کی زبدۃ التواریخ

(م - ت - ۱۰۰۵۸۰) سے جہانگیر کی تخت نشینی کے بارے میں اہم واقعات اور پیچیدہ حالات کی بابت بہت مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں - اس سلسلے میں

شیخ فرید نے میر بخشی کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں وہ بھی اس میں مذکور ہیں۔

شاہ جہاں کے عہد سلطنت کے معاملات اور عائد سلطنت کی بابت بہت مفید معلومات **تاریخ شاہ جہانی** مولفہ صادق خاں (م-ش-۳۷۴۳) میں ملتی ہیں - یہ ۲۰۱ جزو (Folios) پر مشتمل ہے۔ خود مصنف شش ہزاری ذات و سوار کے اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ شاہ جہاں کی حکومت کے آخری دور کے متعلق جہاں صالح نے بہت اختصار سے کام لیا ہے، صادق خاں بہت قابل اعتبار مورخ ہے۔ آگرہ پر اورنگ زیب کا قبضہ ہوجانے کے بعد شاہ جہاں کی طرف سے اورنگ زیب کے ساتھ تمام گفت و شنید صادق خاں نے کی تھی۔ وہ اپنے آقا کی حکومت کے خاتمے کے بعد اپنی کتاب میں پھر اس کا حال قطعاً قلم بند نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ شہنشاہ کی باقی شش سالہ زندگی جو قید میں کٹی اس کے حالات بیان کرنا بے ادبی اور نمک حرامی ہے۔

''تحریر آں محض بے ادبی و نمک حرامی است''

اس عہد کا دوسرا سب سے زیادہ کار آمد اور مستند مورخ چندر بھان برھمن ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں انتظام سلطنت کس طرح کیا جاتا تھا، اس کی تالیف **چہار چمن** بے حد مفید ہے۔ اس حیثیت میں اکبر نامہ کے سوا اور کوئی دوسری کتاب اس سے بہتر نہیں ہے۔ مؤلف کا واسطہ سرکاری طور پر ان چار بڑے بڑے اشخاص، سے رہا جو عہدشاہ جہانی کے بیشتر حصے میں عہدۂ دیوانی پر فائز رہے۔ مؤلف سے

ان کا رابطہ بہت گہرا تھا۔ سعداللہ خاں کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی شاہی فرامین کے مسودے تیار کرنا بھی اس کے ذمے تھا اور اس حیثیت میں بادشاہ سے بھی اس کا براہ راست تعلق رہتا تھا۔ شاہ جہان کے عہد حکومت میں وہ مسلسل کسی نہ کسی حیثیت میں وزیراعظم کے محکمے سے وابستہ رہا۔ چنانچہ کوئی دوسرا آدمی سلطنت کے اعلیٰ‌ترین محکمے کے اندرونی انتظامات کی بابت رائے ظاہر کرنے میں نہ اس سے زیادہ مستند ہو سکتا ہے اور نہ اس سے زیادہ کسی دوسرے شخص کو محکمۂ مذکور کے انتظامات کی تفصیل سے واقفیت ہی ہو سکتی ہے۔ اسے فارسی زبان کے فاضل کی حیثیت سے بھی ایک ممتاز درجہ حاصل تھا اور اس کا نام اس عہد حکومت کی ممتاز شخصیتوں کی فہرست میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے اس کی کتاب کی قدر و قمیت، زیر نظر تالیف کے سلسلے میں لاھوری اور صالح کی کتابوں سے بھی زیادہ ہے۔ وہ ان وزرائے اعظم کی زندگی اور ان کے خیالات کی بابت عجیب و غریب اور دلچسپ معلومات بہم پہنچاتا ہے، جن کے ساتھ کام کرنے اور ربط ضبط رکھنے کا اسے اتفاق ہوا تھا۔ بادشاہ انتظام سلطنت کی جانب کتنی توجہ کرتا تھا اور نظم و نسق میں وزیر خاص کا کیا حصہ ہوتا تھا، ان باتوں کے متعلق اس کی تصنیف کی اہمیت کتاب ھذا کے آئندہ ابواب کے مطالعے سے واضح ہو جائے گی

(م ۱۸۹۲-۲۳۶ جزو - Folios)

سلطنت مغلیہ کے نظم و نسق کے بیان کے سلسلے میں تاریخ ہند کے کسی مؤرخ نے مذکورہ بالا کتاب سے استفادہ نہیں کیا۔

مذکورہ مسودے کی دوسری نقل مجموعۂ مسودات متفرقہ کی جلد نمبرت ۱۶۸۶۳ (جزو Folios ۱ تا ۸۳) میں موجود ہے۔ اس میں کاتب کا نام بشن ناتھ برہمن کاشمیری تحریر ہے جس نے اس کی نقل عہد شاہ عالم (۱۱۲۳ھ) میں کی ہے۔ تاریخ جام جہاں نما میں مؤلف کے مختصر حالات مذکور ہیں۔ اورنگ زیب کے زمانے میں اس کو دیوان کے دفتر سے الگ کر کے ملکۂ ممتاز محل کے مقبرے کا مہتمم مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ شاہ جہاں کے ایک وفاشعار عہدہ دار کے لئے نہایت موزوں خدمت تھی۔

اس عہد کے متعلق باقی ماندہ فارسی کتب تاریخ چونکہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، اس لئے وہ صرف کتاب کے آخر میں دی ہوئی فہرست کتب میں شامل کر دی گئی ہیں۔

۳ - مسوّدات فارسی متعلّقہ انتظام سلطنت

فارسی تصانیف کی دوسری قسم میں وہ اصل مسودے شامل ہیں جن میں نظم و نسق کے ضابطے اور ایسے دیگر امور مذکور ہیں جن کا تعلق سلطنت کے مختلف محکموں کے داخلی انتظام سے تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم مندرجہ ذیل مسودات ہیں جن سے محکموں کے اس داخلی طریق کار کا اندازہ کرنے میں کافی مدد ملی، جس کا بیان آئندہ ابواب میں درج ہے۔

مسودہ برٹش میوزیم - تتمہ ۶۵۹۹ - دستورالعمل اورنگ زیب -

اس میں اہم انتظامی ضوابط کے علاوہ اس دستورالعمل کا خلاصہ بھی مذکور ہے جس کی پابندی سرکاری کام کی انجام دہی

کے سلسلے میں کی جاتی تھی - یہ دستور العمل حکومت اورنگ زیب کے تیسرے سال تیار کیا گیا تھا - اس مسودے میں جو ضوابط درج ھیں وہ مرکزی نظم و نسق کی بہ نسبت صوبائی نظم و نسق کے لئے زیادہ مناسب ھیں - تاھم اس میں میر ساماں کے تحت مختلف کارخانوں اور سرکاری گوداموں کے طریق کار کی جتنی تفصیلات مذکور ھیں، اتنی اس قسم کے کسی دوسرے مسودے میں نہیں ملتیں - (جزو - ۵۸ تا ۱۰۹)

ت - ۶۵۹۸ - مذکورۂ بالا مسودے کی دوسری نقل ھے اور اس کا عنوان بھی وھی ھے - اس جلد کی اھمیت اس کے دوسرے حصے کی وجہ سے ھے، جو بجائے خود ایک الگ کتاب ھے اور جس کا ذکر فہرست میں نہیں ھے - (جزو ۱۲۹ تا ۲۰۸) جزو ۱۲۹ پر اس کا نام دستور العمل لکھا ھے لیکن وہ ضوابط عالمگیری کی نقل ھے جو دراصل ایک بالکل الگ کتاب ھے اور جس کا ذکر نیچے درج ھے -

ش - ۱۶۴۱ - اس کا نام جیسا کہ اوپر ذکر ھوا، ضوابط ھے اور یہ ان ضابطوں کا دوسرا خلاصہ ھے جو اورنگ زیب کی حکومت کے چونتیسویں سال میں مرتب ھوئے تھے - یہ کتاب مذکورۂ بالا کتب کے مقابلے میں بہت گراں قدر ھے - اس میں مباحث بھی نسبتاً زیادہ ھیں اور حکومت مرکزی کے مختلف محکموں سے متعلق مفید تفصیلات بھی بیشتر ھیں - فارسی اعداد سے اندازہ ھوتا ھے کہ اس کے جزو کی تعداد ۱۸۹ ھے لیکن یہ اعداد پنسل سے لکھے ھوئے اکثر انگریزی اعداد سے مختلف ھیں - ان میں سے ۶۷ جزو میں ضوابط کے علاوہ یہ بھی مذکور ھے کہ دیوان، میر بخشی

اور میر ساماں کے محکموں کے افسروں کے درمیان کام کس طرح تقسیم ہوتا تھا - علاوہ بریں ان میں منصب داروں کے مشاہروں کے متعلقہ ضوابط بھی ان ترمیمات کے ساتھ درج ہیں جو شاہ جہاں کے زمانے میں کی گئی تھیں۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے ممتاز وزرائے اعظم اپنے روزمرہ کے فرائض منصبی میں جس معمول کے پابند تھے اس کی تفصیل جزو ۸۹ تا ۹۷ میں ملتی ہے - مسودے کے باقی حصے میں شاہ جہاں کے ماتحت والیان ریاست اور وزراء کے خطابات، نیز صوبائی مالگزاری کے گوشوارے، دارالحکومت اور بعض اہم شہروں اور سرحدی چوکیوں کے درمیانی فاصلے اور اورنگ زیب کے عہد حکومت کے اہم واقعات کا خلاصہ درج ہے -

ت-۶۵۸۸- اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - پہلے حصے میں اکبر کی اصلاحات مالگزاری، مندرجہ اکبر نامہ و منتخب التوریخ (بدایونی) کا خلاصہ، صوبائی مالگزاری کے نقشے اور (صوبوں کے) درمیانی فاصلے درج ہیں۔ دوسرے حصے میں اورنگ زیب کے اہم اقوال نیز عہد شاہ جہانی کے متعلق بعض حقائق درج ہیں جنھیں اورنگ زیب نے اپنے نقطۂ نظر سے بیان کیا ہے - تیسرے حصے میں وہ ضوابط مذکور ہیں جو زیادہ تر حساب نویسی اور حسابات کے ان متعدد نقشوں کی تیاری سے متعلق ہیں جن کی دیوان کے محکمے میں ضرورت ہوتی تھی - تیسرا حصہ جزو ۸۶ تا ۹۸ پر مشتمل ہے اور اس حصے کے کاتب کا خط اول الذکر دونوں حصوں کے خط سے مختلف ہے -

ش- ۱۶۹۰- یہ دستورالعمل کی دوسری نقل ہے جو مذکورہ بالا نقول کے کافی عرصے بعد تیار ہوئی ہے - معلوم ہوتا ہے

که لکھنے والے کی غرض، سلطنت مغلیه کے ضوابط کا خلاصه بیان کرنے کی بجائے یه هے که شمالی هندوستان کے مسلم بادشاهوں کی مختصر تاریخ بیان کر دی جائے۔ تاهم جس حصے میں شاه جهان کی حکومت کا ذکر هے وه اس کی حکومت کے وزراء اور معتمدین کے مختصر سوانح حیات معلوم کرنے کے لئے بهت مفید هے۔ دیگر ''دستوروں'' کی طرح اس میں بهی صوبوں اور ان کی مالگزاری کے نقشوں کی فهرستیں موجود هیں۔ اس میں ۱۹۷ اوراق هیں۔

ش - ۲۰۱۱ - ملازمین محکمۂ مالگزاری کی رهنمائی کے لئے یه ایک سرکاری دستورالعمل هے جسے چهتر مل نے مرتب کیا تها۔ اس کا نام **دیوان پسند** هے۔ مصنف نے دیباچۂ کتاب میں انتظام مالگزاری کے متعلق اپنا ذاتی تجربه بیان کیا هے۔ یه کتاب چار حصوں پر مشتمل هے اور اس میں کل ۲۱۴ صفحات هیں۔ اس میں عهد مغلیه کے وه ضوابط مالگزاری مذکور هیں جو شمالی هندوستان میں مدت دراز سے رائج تهے۔ مؤلف نے اس کے هر حصے کو نهایت شرح و بسط سے لکها هے۔ وه هر اصطلاح کی توضیح و تشریح مثالوں کے ساتھ کرتا هے۔ معلوم هوتا هے که هندوستان کی تاریخ لکھنے والوں میں سے کسی نے بهی اس مسودے سے استفاده نهیں کیا۔ میں نے اپنی ضرورت کے مطابق اس سے پوری طرح فائده اٹهایا هے، لیکن یه کتاب شاهان مغلیه کے نظام مالگزاری اور صوبائی نظم و نسق کے لئے زیاده مفید هے۔

ت - ۶۵۸۵ - اس کا نام **تاریخ شاکرخانی** هے جو شاکرخاں ابن شمس الدوله لطف الله خاں صادق نے محمد شاه کے عهد حکومت میں

لکھی تھی۔ اس کتاب میں زیادہ تر اسی عہد کے سیاسی حالات مذکور ہیں لیکن ضمناً ان انتظامی معاملات کے متعلق بھی بہت مفید معلومات مل جاتی ہیں جن کا تعلق سابق حکومتوں سے تھا۔ اس میں بعض پرانے واقعات کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ مثلاً ایسے واقعات کا جو اکبر کے عہد میں بہ زمانۂ وکالت منعم خاں پیش آئے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اکبر کے آئینی ضابطوں کی تمام ضروری تفاصیل پر اس زمانے تک عمل کیا جاتا تھا، جب یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کے تمام مندرجات اس کے مؤلف کے چشم دید واقعات پر مبنی ہیں جو سلطنت کی قابل رحم حالت پر افسوس بھی کرتا ہے اور اس صورت حال کو جو اس وقت موجود تھی مذموم بھی قرار دیتا ہے۔ یہ کتاب جس زمانے پر روشنی ڈالتی ہے اس کے متعلق تمام ضروری مواد آئندہ ابواب میں مناسب مقامات پر شامل کر لیا گیا ہے۔

ت - ۲۲۸۳۱ - اس میں صوبوں، سرکاروں اور جاگیروں کا حال تاریخی واقعات کے ساتھ مندرج ہے اور یہ صوبائی نظم و نسق کے متعلق بہت مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر دستورالعمل شہنشاہی مرتبہ منشی ٹھاکرلال ۱۱۰۳ھ درج ہے، لیکن تتمے میں ۱۱۹۲ھ تک تمام شاہان مغلیہ کے نام تاریخ وار درج ہیں۔

ت - ۶۵۸۶ - حصہ چہارم میں اکبر کے زمانے سے شجاع الدولہ کی گورنری کے زمانے تک انتظام حکومت بنگالہ کا حال درج ہے۔

ش - ۱۸۱۳ - مراۃالاصطلاح - اس مسودے کے بیشتر حصے میں انند رام مخلص کے قلم سے شاعرانہ اصطلاحوں اور ادبی جملوں کی شرح درج ہے ، لیکن جزو ۲۶ تا ۳۴ میں انتظام سلطنت کے متعلق مفید حقائق بھی مذکور ہیں - ان میں عہدہ داروں کی تنخواہوں اور منصبوں کے متعلقہ قوانین و ضوابط ، نیز عطائے خطابات کے قاعدوں اور وکیل سلطنت کے مرتبے کی تصریح بھی مذکور ہے -

ش - ۲۰۲۶ - دستور العمل کی دوسری نقل ہے جو اورنگ زیب کے عہد حکومت کے بعد تیار کی گئی تھی -

ش - ۱۹۰۶ - اس میں منصب داروں کی تنخواہوں اور ان کے تدریجی مراتب کی فہرست بصورت جدول درج ہے - اسے نجف علی خاں نے تیار کیا تھا - اس کا نام **شرح مناصب** ہے اور اس میں کتاب کے متعلقہ موضوعات کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں -

ت - ۶۶۰۳ - جزو ۴۰ تا ۴۸ - اس میں ان اصطلاحات کی ایک فہرست ہے جن کا استعمال مالگزاری وصول کرنے کے سلسلے میں ہوتا تھا - اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام کے استعمال کے لئے خواجہ یسین نے مرتب کیا تھا -

ت - ۷۶۸۹ - (انشاء) اور ت - ۹۶۹۷ - (جزو ۱ تا ۱۶) ان میں سرکاری دستاویزوں، غیر فوجی ٹھیکوں اور مختلف درجوں کے اشخاص کے نام خطوط کے نمونے دیے گئے ہیں - یہ دونوں مخطوطات اس لحاظ سے بھی بہت کارآمد ہیں کہ ان سے حکام کے فرائض اور ان کے کام کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے -

ت - ۶۵۸۰ - مرآۃ احمدی - مصنفه علی محمد خاں صوبه گجرات کی مربوط و مسلسل تاریخ ہے جس میں ۱۱۷۴ھ تک کے حالات درج ہیں جب که مرہٹوں کو بمقام پانی پت شکست ہوئی تھی - اس کتاب کا مولّف عہد حکومت محمد شاہ کے اختتام کے قریب گجرات کا دیوان مقرر کیا گیا تھا - لیکن وہ آٹھ یا نو سال کی عمر ہی سے برہانپور میں رہتا تھا، جہاں وہ اپنے زمانے کے واقعات کی ایک تاریخی یادداشت بھی مرتب کرتا رہتا اور دوسرے قابل اعتماد اشخاص سے بھی تاریخی معلومات حاصل کر کے جمع کرتا رہتا تھا - یه کتاب بہت ضخیم اور ۳۶۰ جزو (Folios) پر مشتمل ہے - میری کتاب کے لئے یه تالیف اس وجه سے اہم ہے که مولّف نے حتّی الامکان اپنی کتاب میں ان تمام فرامین کی نقل شامل کی ہے جو مختلف بادشاہوں کے عہد حکومت میں مذکورہ صوبے کو بھیجے گئے تھے - ان فرامین کا تعلق متفرق امور سے ہے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے که ایک دور دراز صوبے کے داخلی انتظام میں مرکزی حکومت کا کتنا دخل تھا - علاوہ ازیں مولّف نے صوبے کے داخلی انتظام کا جس تفصیل سے بیان کیا ہے وہ کسی دوسری جگه نہیں ملتی - میں نے اس کتاب سے پوری طرح استفادہ کیا ہے اور میرا خیال ہے که صوبائی انتظامات کے موضوع پر، نیز یه سمجھنے کے لئے که اورنگ زیب کی حکومت کے ختم ہوتے ہی کیونکر یه سارا نظام یک بیک درہم برہم ہو گیا، یه کتاب بے حد مفید ہے - صوبه گجرات کا زوال خود مولّف کے زمانے میں کس طرح ہوا، یه بھی اس نے به تفصیل بیان کیا ہے - کتاب کے آخری اوراق میں یه بات بھی اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے که مغلوں کے زیرنگیں صوبوں کے بڑے شہروں کا انتظام کیوں کر ہوتا تھا -

اس کے ایک حصے کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے اور اس کا نام ہے : *Political and Statistical History of Gujrat* by James Bird لیکن یہ کتاب کے اتنے قلیل حصے کا ترجمہ ہے کہ اس سے نہ اصل کتاب کی اہمیّت کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ اس بات کا کہ اس میں معلومات کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

واضح رہے کہ میں نے اپنی اس فہرست میں ان نسبتاً کم اہم مسودات کا نام شامل نہیں کیا جن سے اس کتاب کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ ان میں سے اول الذکر چار مخطوطات کو ''ای ٹامس'' نے صرف اس حد تک استعمال کیا ہے کہ ان سے صوبائی مالگزاری کے نقشوں کے اعداد اخذ کر کے اپنی کتاب *The Revenue Resources of the Mughal Empire* میں نقل کر دیے ہیں۔ اور ''مسٹر اروین'' (Irvine) نے کتاب *The Army of the Mughals* کے لیے مذکورہ چار مخطوطات کے علاوہ ایک اور مسودے (ش-۳-۱۸۱۳) سے بھی استفادہ کیا ہے۔ پروفیسر سرکار نے *The Mughal Administration* کی تالیف کے سلسلے میں صرف ایک مسودہ (ش-۱۶۴۱) استعمال کیا ہے۔ اس کا ذکر انھوں نے اس کتاب میں ''ماخذ'' کے تحت صفحات ۴۳ و ۴۴ پر کیا ہے۔

٤ - خطوط

مذکورہ بالا ماخذ کے علاوہ اس عہد کے خطوط کے مجموعے بھی معلومات کا ایک ذریعہ ہیں۔ مجھے بھی خطوں کے حسب ذیل مجموعوں سے بہت مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں :—

اجرٹن-٦٩٥-لطیفۂ فیضی۔ یہ فیضی کے خطوط ہیں جنہیں خود اس کے چچیرے بھائی نورالدین نے جمع کر کے شائع کیا۔

ت - ٦٥٤٨ - مکاتبات علامی ابوالفضل- شائع کردہ عبدالصمد افضل محمد -

ت - ١٦٨٦٣ _ حصہ دوم - جزو ۸۴ تا ۱۰۳ - اس میں بھی ابوالفضل کے خطوط سے اخذ کیے ہوئے حصے شامل ہیں -

ان دونوں بھائیوں کے خطوط دیگر امور کے علاوہ اس لحاظ سے بھی بہت مفید ہیں کہ ان سے ریاستہائے دکن اور سلطنت مغلیہ کے باہمی تعلّقات کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ملک کے ان حصوں کی کیا حالت تھی جہاں جہاں کا ان دونوں بھائیوں نے سفر کیا تھا ، نیز دربار اکبری کے ادبی ماحول کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے - انڈیا آفس لائبریری کے نمبر ۲۸۳ میں خطوط ابوالفضل سے متعلق ایک فرہنگ الفاظ بھی شامل ہے -

ت - ٢٦١٤١ - انشاء برهمن _ مذکورہ بالا چہار چمن کے مولّف کی تالیف ہے - اس مجموعے میں وہ تمام عرضداشتیں شامل ہیں جو مولّف نے شاہ جہاں کے حضور میں پیش کی تھیں اور وہ تمام خطوط بھی موجود ہیں جو اس نے ان وزراء اور ان کے معتمدین کو لکھے تھے جن سے اسے قریبی واسطہ رہ چکا تھا - متعلّقہ امور کو مولّف نے ان خطوط کے علاوہ چہار چمن میں بھی بیان کیا ہے - باقی حصے کے مطالعے سے اعلیٰ ملازمین کے باہمی تعلقات ، ان کی معاشری مجالس اور اس زمانے کے ادبی ماحول پر بھی روشنی پڑتی ہے -

ش - ۱۷۸ -- بہار سخن -- یہ محمد صالح کمبوہ وقائع نگار شاہ جہاں کے مضامین نثر کا مجموعہ ہے -

ش - ۱۷۷ اور ۱۸۸۸۱ - مجموعۂ خطوط اورنگ زیب -
اس مجموعہ میں اورنگ زیب کے وہ خطوط بھی شامل ھیں جو اس نے اپنی تخت نشینی کے قبل اور اس کے بعد شاہ جہان کو لکھے تھے -

ت - ۱٦۸۵۹ - عرضداشت - اس میں مظفر خان جہاں کے وہ خطوط ھیں جو اس نے شاہ جہاں کو لکھے تھے اور وہ جوابات بھی ھیں جو شہنشاہ کی جانب سے موصول ہوئے - شاہ جہاں کی حکومت کے جس زمانے میں یہ خط لکھے گئے اس کے متعلق ان میں بہت مفید معلومات ملتی ھیں - مولّف اپنے ایک خط میں شاہ جہان پر کھلم کھلا اعتراض کرتا ھے کہ وہ اپنے صوبجاتی حکام پر اعتماد نہیں کرتا اور اسی بات کو مذکورہ حکام کے درمیان کامل یک جہتی نہ ہونے کی خاص وجہ قرار دیتا ھے - اسی طرح ایک دوسرے خط میں نہایت بے باکی سے ایک مہم کی کمان پر اپنے تقرر کی مخالفت کرتا ھے - اس وقت مصنّف ضعیف العمر تھا اور گوالیار کے گورنر کے عہدے پر مامور تھا - اگرچہ اس کے قبل وہ فوج میں بھی کافی مدت تک ملازمت کر چکا تھا - مذکورہ عرضداشت کے آخری حصے میں وہ خطوط شامل ھیں جو اس نے اپنے دوستوں کو لکھے تھے اور وہ بھی ھیں جو ان کی طرف سے اسے موصول ہوئے تھے - ان دوستوں میں بعض زمیندار بھی شامل تھے - مجموعے میں اس کے ایک ایسے دوست کے خطوط بھی ھیں جو کہیں میر عدل کے عہدے پر مامور تھا - ان میں بعض ایسے مقدمات کی بابت بہت مفید معلومات درج ھیں جن کی سماعت خود اس نے کی تھی -

۵ - کتب سیر

یہ ایک دوسری نوعیت کی تصانیف ہیں - ان میں ہمیں اعلٰی حکام امرائے سلطنت کے سوانح حیات، بادشاہ کے ساتھ ان کے تعلقات اور ان کے ذاتی کارناموں کے متعلق مزید معلومات ملتی ہیں - یہ معلومات متعلقہ عہد کی دیگر تصانیف میں نہیں ملتیں -

ماثر الامراء - صمصام الدولہ کی مشہور و معروف شائع شدہ کتاب ہے - اس کے تین حصے ہیں جن میں سلطنت مغلیہ کے امراء اور اعلٰی حکام کے سوانح حیات درج ہیں - اس کتاب کا خاص نقص یہ ہے کہ اس میں نہ ان ماخذ کا ذکر ہے نہ ان ذرائع کا جن سے معلومات حاصل کی گئی ہیں - اس مشکل کو حل کرنے کے لیے میں نے اپنے زیر مطالعہ اصل ماخذ کی مدد سے وہ سوانح حیات خود مرتب کئے جن کی مجھے اپنے کام کے لئے ضرورت تھی - لیکن آخر میں میں نے محسوس کیا کہ ماثر کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ اس میں بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو موجودہ ممکن الحصول کتابوں میں نہیں ملتیں - اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن مستند کتب سے مولف نے اپنی کتاب کے سلسلے میں معلومات حاصل کی ہیں ان میں سے اکثر مفقود ہو چکی ہیں -

م - ش ۲۳۳ - ارشاد الوزراء - مولفہ صدر الدین محمد - اس میں مسلم وزیروں کی مختصر سوانح عمریاں درج ہیں - جزو ۶۴ و ۶۵ میں سلطنت مغلیہ کے بعض مشہور و معروف وزرا کے حالات مذکور ہیں - مولف بالعموم شدید طنز کے ساتھ اپنی رائے

کا اظہار کرتا ہے اس کتاب پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے - لیکن ہم جانتے ہیں کہ مصنف کا باپ زبردست خاں ، اورنگ زیب کے زمانے میں اودھ کا صوبہ دار تھا -

م - ت - ۱۶۷۰۳ - تذکرۃالامراء - مصنفہ کیول رام - اس میں بھی امرائے سلطنت کے مختصر سوانح حیات اورنگ زیب کے عہد حکومت تک درج ہیں - اس کتاب کے دو حصے ہیں جن میں الگ الگ مسلم اور ہندو امراء کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں ان میں امراء کے نام ان کے مرتبے کے لحاظ سے ترتیب وار درج کئے گئے ہیں - یہ کتاب حکام کی درجہ بدرجہ ترقیوں اور ان کے تدریجی فرائض منصبی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے بہت مفید ہے - اس کے آخری حصے میں متفرق موضوعات پر مختصر اظہار خیال ہے -

م - ش - ۲۰۳ - امیر احمد رازی کی مشہور و معروف تصنیف ہفت اقلیم جو اکبر کے عہد سلطنت میں مکمل ہوئی اور جس میں کثیرالتعداد اشخاص کے سوانح حیات علاقہ وار مذکور ہیں -

ت - ۱۶۸۶۳ - چہار چمن - جو عہد شاہ جہانی کے چندر بھان برھمن کی تصنیف ہے - اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے - اس میں بھی وزرائے شاہ جہانی کے مختصر سوانح حیات مذکور ہیں -

٦_ کتب متعلقہ اصول سیاست

اس کتاب کے اُن حصوں کی تیاری میں جو اصول سیاست سے متعلق ہیں اور جن میں سلاطین اور وزرائے سلطنت کے فرائض منصبی سے بحث کی گئی ہے مندرجۂ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے -

م - ش - ۲۵۳ - سُلُوک الملُوک - ایک مختصر رسالہ ہے جس میں شریعت اسلامی کے مطابق حکومت کرنے کا طریقہ مذکور ہے - اس موضوع پر یہ مفید ترین کتاب ہے اس کا مصنف فضل بن روزبہان اصفہانی حنفی المذہب تھا۔ اس نے نظام مملکت اسلامیہ کے ہر جزو سے بحث کی ہے اور ہر موضوع کی بابت مشہور و معروف فقہائے اسلام کے خیالات کا خلاصہ درج کیا ہے - یہ رسالہ پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے صفحات کی تعداد دو سو (۲۰۰) ہے۔ اس کے مصنف نے الحاودی کی تصنیف احکام سلطانیہ سے پوری طرح استفادہ کیا ہے -

ت۔ ۷۶۱۸۔ ذخیرۃ الملوک۔ اسی موضوع پر علی بن شہاب ہمدانی کی تصنیف ہے - اس میں دس ابواب ہیں جن میں ابواب پنجم و ششم فرائض سلطانی، حقوق رعایا اور تصور خلافت کی بابت ہیں - یہ کتاب آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف معلوم ہوتی ہے -

ش۔ ۲۵٤ ۔ سلوک السلطنت - (فن حکمرانی) مصنفہ غزالی - یہ اصل نسخہ کا ترجمہ ہے جو آٹھویں صدی ہجری میں کیا گیا ہے - اس میں ۱۷ صفحات ہیں -

ش - ۲۵٦ - اس میں وہ مشہور نصائح ہیں جو خواجہ نظام الملک نے اپنے فرزند فخرالملک کو ایک وزیر کے فرائض منصبی کی بابت کیے ہیں -

ش - ۱۹۲۰ ۔ آثار الوزراء - اس میں مختلف مسلم حکومتوں کے مشہور و معروف وزراء کے حالات زندگی، تیمور اور اس کے قریبی جانشینوں کے عہد تک مذکور ہیں - یہ کتاب بہت مفید معلومات

کا ذخیرہ ہے۔ اس میں وزرا کے ایسے اقوال درج ہیں جو ان کے تجربات زندگی کا عطر ہیں۔

آداب سلطنت و وزارت۔ اس کے مصنف کا نام درج نہیں۔ اس میں سلاطین و وزرائے سلطنت کے فرائض منصبی بیان کیے گئے ہیں۔ غالباً یہ کتاب دسویں یا گیارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہے۔ اسے ۱۸۸۳ء میں۔ C. H. Scheffer نے بہ زبان فرانسیسی مرتب کر کے پیرس سے شائع کیا۔

احکام سلطانیہ۔ عربی زبان میں فن حکمرانی پر مشہور و معروف مسلم فقیہ الماوردی کی تصنیف ہے۔ چونکہ انگریزی میں اس کا کوئی ترجمہ موجود نہیں ہے، میں نے اس کے فرانسیسی ترجمے سے استفادہ کیا ہے۔

مقدمہ تاریخ ابن خلدون۔ متعلقہ موضوع پر عربی میں بہت مشہور کتاب ہے لیکن اس کا بھی ترجمہ ابھی تک انگریزی میں نہیں کیا گیا۔ فرانسیسی اور اردو میں البتہ اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ مختلف مسلم ممالک کے انتظام سلطنت اور اس کے مختلف شعبوں کے مطالعے کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

سیاست نامہ۔ یہ نظام الملک کی تصنیف ہے جو الپ ارسلان اور ملک شاہ کا وزیر تھا، جن کے عہد حکومت میں وہ مذکورہ عہدے پر تیس سال تک مامور رہا۔ یہ کتاب فارسی میں شائع ہو چکی ہے۔ (م۔ت۔ ۲۳۵۱۶)

۷۔ یورپین سیاحوں کے سفر نامے

یہ تحریریں بہت مفید ذریعۂ معلومات ہیں اور ان سے تصدیق و تصحیح حالات کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان کے بیان کردہ

حالات بادشاہوں اور ان کے درباروں سے، نیز ان شہروں اور قصبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی انھوں نے سیر کی۔ علاوہ ازیں ان کا تعلق ان اعلیٰ حکام سے ہے جن سے انھیں سابقہ پڑا۔ اس لحاظ سے یہ سفرنامے نہ صرف مفید ہیں بلکہ ان سے مزید معلومات متعلقہ امور کی بابت حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک ملکی انتظام کا تعلق ہے، نہ ان سیاحوں کی معلومات صحیح معلوم ہوتی ہیں نہ ان کی تحریروں کے مطالعے سے کوئی مفید مدد ملتی ہے۔ حتیٰ کے فادر مانسریٹ جیسا شخص جس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا لکھتا ہے کہ ''جاگیریں موروثی ہوتی تھیں'' اور ''ابوالفضل وزیر اعظم تھا'' (صفحات ۸۰ و ۸۹) میں نے مندرجہ ذیل سیاحوں کی تحریروں سے پوری طرح استفادہ کیا ہے :-

فادر مانسریٹ	بہ عہد اکبر	۱۵۸۰ء تا ۱۵۸۲ء
ہاکنز	بہ عہد جہانگیر	۱۶۰۹ء تا ۱۶۱۱ء بمقام آگرہ
فنش (Finch)	"	۱۶۱۰ء
فنش	"	۱۶۱۱ء بمقام لاہور
سر ٹامس رو	"	۱۶۱۵ء تا ۱۶۱۸ء بمقام اجمیر و گجرات
ایڈورڈ ٹیری	بہ عہد جہانگیر	۱۶۱۶ء تا ۱۶۱۹ء
ڈیلائٹ (Delaet)	"	۱۶۲۵ء

اس کی تحریرات کا ماخذ وہ حالات ہیں جو اس عہد کے سیاحوں نے قلمبند کیے ہیں۔

پلسارٹ	بہ عہد جہانگیر	۱۶۲۲ تا ۱۶۲۷ء بمقام آگرہ

برنیر قریب اِختتام حکومت شاہ جہاں ۱۶۵۸ء بمقام احمد آباد و شاہ جہاں آباد۔

ان سب میں فادر مانسریٹ سب سے زیادہ مستند ہے اور مفید معلومات بہم پہنچاتا ہے وہ حالات کا مشاہدہ دقیقہ رس نظر سے کرتا اور انہیں من و عن بیان کر دیتا ہے۔ وہ تفصیل ہی کا نہیں، صحت بیان کا بھی شائق ہے۔ ان باتوں کے سوا جن کا تعلق ہندوؤں یا مسلمانوں کے مذہب سے ہے اور جن کے متعلق ظاہر ہے کہ اس کے خیالات تعصب سے پاک نہیں ہو سکتے، باقی تمام باتیں جنہیں وہ اپنے ذاتی مشاہدات کے بعد بیان کرتا ہے، بہت بڑی حد تک قابل اعتبار ہیں۔ وہ مختلف مواقع پر ابوالفضل کا ذکر کرتا ہے جس سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تعلقات کی وجہ سے وہ مختلف امور کی بابت مفید معلومات حاصل کر سکا۔ اکبر کی مجالس شوریٰ، ان میں غور و خوض کا طریقہ، مباحثے جو اس کی موجودگی میں ہوئے، اکبر کا طریقۂ عدل گستری اور مجرموں کے متعلق اس کے احکام سزا، ان تمام باتوں کو مصنف نے جس طرح بیان کیا ہے اس سے حالات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ متعدد دیگر امور کی بابت اس کی تحریروں نے مجھے بعض ایسے مفید معلومات سجھائے جنہیں میں تحقیق و تدقیق کے بعد تاریخی واقعات سے صحیح ثابت کر سکا۔ اس اس کے بعد ڈلائٹ کی تحریروں کا درجہ ہے جنہیں انتظام سلطنت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے استعمال کرنا منفعت سے خالی نہیں ہے۔ سر ٹامس رو کی تحریروں میں دربار سے متعلقہ امور کے علاوہ کچھ زیادہ مذکور نہیں ہے۔ ٹیری بحیثیت مجموعی زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے اور اس کے کسی ایسے بیان کو صحیح سمجھ لینا بعید از احتیاط ہے، جس کی تصدیق کسی دوسرے ہم عصر مورخ کے

بیان سے نہ ہوتی ہو - سر ولیم فوسٹر نے اپنی کتاب کے دیباچے میں جن ذرائع معلومات کا ذکر کیا ہے ان میں سورت کی افواہیں بھی شامل ہیں- پلسارٹ (Pelsaert) کے طریقۂ تنقید اور اس کے طرز استدلال کی وجہ سے اس کے تذکرے کی قدرو قیمت بہت کم رہ جاتی ہے- مشاہدے کی حد تک برنیر ذہانت کا ثبوت دیتا ہے لیکن دقت یہ ہے کہ وہ یہاں کی ہر بات کو فرانسیسی حالات کی روشنی میں جانچتا ہے اور ہمیشہ فرانسیسی نقطۂ نظر کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے-

بہر حال یہ تحریریں بہت مفید معلومات بہم پہنچاتی ہیں اور پوری جانچ پرتال اور چھان بین کے بعد انہیں اس کتاب میں شامل کرکے ان سے پورا فائدہ آٹھایا گیا ہے-

۸ - نئی کتابیں

میں نے مغلوں کے زیر نظر عہد کے جدید مورخوں کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے، لیکن تکرار سے بچنے کے لئے صرف ان کے نام مشمولہ فہرست کتب میں درج کر دیے گئے ہیں- اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دیباچے کا وہ حصہ جس میں سلطنت دہلی کا ذکر ہے اور تمام باتیں جو سلاطین دہلی کے انتظام سلطنت کی بابت مختلف مقامات پر مذکور ہیں، متعلقہ عہد کے اصلی ذرائع سے ماخوذ ہیں- ان میں سے حسب ذیل کتابوں کا ذکر کافی ہوگا:-

(۱) طبقات ناصری-
(۲) تاریخ فیروز شاہی مصنفہ برنی
(۳) اسی نام کی دوسری کتاب مصنفہ سراج عفیف
(٤) تاریخ مبارک شاہی اور
(٥) تاریخ داؤدی

جغرافیہ اور اس کا اثر باشندگان ملک اور طرز حکومت پر

خاکہ

جغرافیہ اور اس کے اثر کی نوعیت
طبعی حالات کے لحاظ سے ہندوستان کے حصے۔
شمالی ہند، اس کے حدود اربعہ، کوہستان ہمالیہ، میدانی علاقے، کوہ وندھیا چل کوہستان ہمالیہ کے اثرات:-

(۱) ایک طویل خط دفاع پر ہندوستان کا تحفظ

(۲) اس کے درّوں کے ذریعے وسط ایشیا کے ساتھ رابطہ اور اور اس رابطے کی نوعیت۔

(۳) میدانی علاقوں کو ندیوں اور بارش کے پانی کی بہم رسانی۔

میدانی علاقوں کی خصوصیات:-

وسیع، ہموار، آب آورد باریک مٹی سے بنے ہوئے زرخیز پہاڑوں اور میدانوں کا اثر لوگوں کے پیشوں، عادتوں، سرگرمیوں اور ان کے عام نظریات زندگی پر، طرز حکومت اور خصوصیات حکومت پر ان چیزوں کے اثرات۔

حالات جو بادشاہی کی نشو و نما کے لیے ساز گار ہوتے ہیں۔ بادشاہی ایک سیاسی ضرورت بن جاتی ہے۔
بادشاہی حکومت کی طرز و خصوصیات۔
حکومت کی سرگرمیاں جغرافیائی تقاضوں کی پابندی کرتی ہیں۔
جغرافیائی حالات اور روایات ملکی کے مطابق حکومت کے فرائض معین ہوتے ہیں۔

کوہ وندھیاچل کا اثر اور جارحانہ اقدامات کی پالیسی۔

نتائج —

اثر کی نوعیت۔انسانی ''اختیار'' پر کسی شخص کا ایمان خواہ کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو، وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی کامیابی و ناکامی کا انحصار ایک بڑی حد تک اس کے ماحول پر بھی ہوتا ہے۔ ان متعدد اثرات میں جو ماحول کے مفہوم میں داخل ہیں، جغرافیائی اثرات سب سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔

جغرافیائی حقائق تاریخ کے دھارے کو بدل دیتے ہیں۔ انسان کی غذا اور اس کی دیگر ضروریات کو مقامی آب و ہوا معین کرتی ہے۔ سطح زمین کے طبعی حالات اور سمندر اور پہاڑ اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کسی علاقے کے باشندے کون سے پیشے اختیار کریں۔ جس جغرافیائی ماحول میں لوگ زندگی بسر کرتے ہیں، اسی کے زیر اثر ان کے خیالات اور عقائد کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔ ایسے ساحل پر قبضہ جس میں جہازوں کے لئے محفوظ قدرتی بندرگاہیں ہوں اور ایسی سرحدوں کے زیر اثر جو باشندوں کو محفوظ یا دوسری اقوام سے غیر متعلق رکھتی ہوں، باشندگان علاقہ کی سیرت، ان کی سرگرمیوں، دیگر اقوام کے ساتھ ان کے ربط و ضبط اور غیر ملکی خیالات سے پیدا ہونے والے اثرات کی حدیں معین ہوتی ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم کسی ملک کے جغرافیائی حالات کو نظر انداز کر کے اس کی تاریخ کو نہیں سمجھ سکتے۔ کسی ملک کی تاریخ، اس کے باشندوں کی سیرت، اور اس کے عام اداروں نیز تہذیب و تمدن کی ترقی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کا جغرافیائی پس منظر تیار کر لینا ضروری ہے اور قبل اس کے کہ کوئی بات بیان کرنے یا کوئی نظریّہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے اس پس منظر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا لازم ہے۔

ارد گرد کے براعظموں اور سمندروں کے اثرات کو ملحوظ رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے کسی اور ملک کی تاریخ اور اس کے باشندوں کی زندگیوں پر اُس کا جغرافیائی محل وقوع، ہندوستان پر اس کے جغرافیائی محل وقوع سے زیادہ یقینی طور پر اثر انداز نہیں ہوا۔[1]

ہندوستان بلحاظ جغرافیہ و تاریخ تین حصوں میں منقسم ہے، شمالی ہند، جو کوہستان ہمالیہ اور سلسلہ وندھیاچل کے درمیان واقع ہے۔ سطح مرتفع دکن، جو نربدا کے جنوب میں دریا۔ کرشنا اور دریائے تنگ بھندرا تک پھیلا ہوا ہے اور وہ علاقہ جو مذکورۂ بالا ندیوں کے جنوب میں واقع ہے۔

شمالی ہند: ان حصوں میں سے پہلا حصہ جو ویدوں کے عہد میں آریاورت کے نام سے مشہور تھا اور بعد ازاں ہندوستان کہلایا، ملک کا وہ حصہ ہے جس کے ساتھ ہماری کتاب کے موضوع کا خاص تعلق ہے۔ شمالی ہند کا میدان، کوہستان ہمالیہ کے ذیلی سلسلوں اور سلسلۂ وندھیاچل کے درمیان واقع ہے۔ اس کے مشرق میں دریائے گنگا اور برھمپتر کا مثلث (ڈیلٹا) اور اس کے مغرب میں دریائے سندھ کا ڈیلٹا واقع ہے۔

کوہستان ہمالیہ: کوہستان ہمالیہ شمالی ہند کی طویل شمالی سرحد پر نہ صرف دہری دفاعی دیواروں کے مترادف ہے، بلکہ اس کے مشرقی اور مغربی سروں سے ایسے پہاڑی سلسلے نکل کر جنوب

۱۔ ہندوستان (دنیا کے قدرتی حصے مطبوعہ ۱۹۰۴) مولفہ سر ٹی۔ ایچ ہولڈش صفحہ ۱۔

کی طرف پھیلتے ھیں جو ھندوستان کی شمال مشرق اور شمال مغربی سرحدوں کی حفاظت کرتے ھیں[۱] -

شمالی مغربی گوشے میں جہاں سے وہ سلسلہ مائل بہ جنوب ھوتا ھے ، ایک درّہ بن گیا ھے جس سے گزر کر دریائے کابل ھندوستان میں داخل ھوتا ھے - اسی حصے میں دیگر مشہور درّے بھی ھیں جن کے ذریعے ھندوستان کے تعلقات وسط ایشیا سے قائم ھیں - اس حصے کے سوا باقی تمام شمالی سرحد پر سلسلۂ کوہ ھمالیہ نے ھر زمانے میں ھندوستان کی حفاظت کی ھے - لیکن یہ استثناء کافی اھم ھے کیونکہ شمالی ھندوستان پر جتنے حملے ھوئے انھیں درّوں سے ھوئے ھیں -

شمالی ھندوستان کی قدیم تاریخ اور اس کی وہ تاریخ جو زمانۂ وسطیٰ سے متعلق ھے ، بالخصوص دو جغرافیائی حقیقتوں پر مبنی ھیں - پہلی یہ کہ شمال مغربی پہاڑی سلسلہ پوری طرح حملہ آوروں کی روک تھام نہیں کر سکتا - دوسری یہ کہ جب ایک مرتبہ حملہ آور پہاڑی درّوں سے گزر کر ملک میں داخل ھو جاتا ھے تو کوئی جغرافیائی موانع ایسے نہیں جو اسے آگے بڑھنے سے روک سکیں-

ایک طرف زرخیز وادی اور وسیع کھلے میدان ھیں جہاں قدرتی نعمتوں کی فراوانی ھے اور دوسری جانب ان میدانوں کے شمال میں پہاڑی علاقہ ھے جہاں آب و ھوا سرد اور زمین نسبتاً

---

۱ - شمال مشرق سرحد پر شمالی برما کی وحشی اقوام کے حملوں سے حفاظت کرتے ھیں اور شمال مغربی سرحد پر یہ سلسلے میدان کی پوری سرحد پر سمندر تک پھیلے ھوئے ھیں -

کم زرخیز ہے۔ ان حقائق پر نظر ڈالتے ہی ہمیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ میدان میں رہنے والوں اور مذکورہ پہاڑی علاقوں میں بسنے والوں کے تعلقات کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔ جہاں بنجر پہاڑی علاقے اور زرخیز میدان ایک دوسرے سے ملحق ہوتے ہیں وہاں عملاً ہمیشہ یہی پرانی انگریزی کہاوت دہرائی جاتی ہے۔ ؎

"پہاڑی بھیڑیں بے شک لذیذ تر ہوتی ہیں
مگر وادی کی بھیڑیں ان سے موٹی ہیں
اسی لئے ہم نے یہ مناسب سمجھا
کہ وادی کی بھیڑوں کو اٹھا لے جائیں"

اسی کھلے ہوئے پہاڑی راستے اور کوہستانی و میدانی حالات کے فرق نے ہمیشہ ہندوستان پر غیر ملکی حملوں کو دعوت دی۔ انہیں کے باعث ویدوں کے زمانے کے آریائی قبائل ہندوستان میں داخل ہوئے جنھوں نے ہندوستانی معاشرے کو نسلی امتیاز کے سانچے میں ڈھالا اور انہیں کی بدولت یونانی یہاں آئے جو ہندوستان کے فنون لطیفہ پر اپنے اثرات چھوڑ گئے۔ انہیں حالات کے باعث اہل سیتھیا اور آخر میں مسلمانوں کے حملے بھی ہوئے جن کے اثرات آریائی اثرات سے کم گہرے نہ تھے۔ ہندوستان کی ثقافت اور اس کی گزشتہ تہذیب مذکورۂ بالا اسباب ہی کی پیداوار ہے اور اسی طرح یہاں کی تمام پیچیدگیاں بھی انہیں اسباب کا نتیجہ ہیں۔

غرضکہ بہ لحاظ تاریخ اور بہ لحاظ نظم و نسق کوہستان ہمالیہ سے ہندوستان کو فائدے بھی پہنچے اور نقصانات بھی۔ ان

کی موجودہ کیفیت کو حکومت اور باشندگان ملک کی سرگرمیوں کی نوعیت متعین کرنے میں خاص دخل ہے کیونکہ وہ اس طویل شمالی خط دفاع پر نہ بیرونی خطرات سے قطعاً محفوظ ہی ہیں اور نہ انہیں ہر وقت اس طرف سے خطرہ ہی لاحق رہتا ہے۔

دنیا کے تمام ممالک میں پہاڑوں کو اہمیت حاصل ہے، لیکن ہندوستانی اقتصادیات کا دار و مدار ہی بہت بڑی حد تک پہاڑوں کی موجودگی پر ہے۔ حتیٰ کہ وہ نظم و نسق کے طریقوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ "ہندوستان کے دریاؤں کا وجود، اس کے آبی ذخیروں اور بہت بڑی حد تک آب باراں کی تقسیم، اس کے مختلف علاقوں میں زرخیزی زمین کے مختلف درجے، ملکیت یا لگان داری کے اصول، کاشت کے طریقے، اس کی آبادی اور اس کے درمیان ذرائع آسائش کی متناسب تقسیم، ان تمام باتوں کے لئے ہندوستان اپنے پہاڑی سلسلوں کا رہین منت ہے"[۱]۔

میدان اعظم: ان پہاڑی سلسلوں کے جنوب میں ایک وسیع میدان واقع ہے جس کا طول شرقاً غرباً تقریباً ۱۷۰۰ میل اور جس کی سطح ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہایت ہموار اور مسلسل ہے۔ اس میدان میں تین بڑے بڑے دریا یعنی سندھ، گنگا اور برہمپتر اپنے معاون دریاؤں کے ساتھ بہتے ہیں۔ اس طرح مذکورہ پہاڑی سلسلوں اور دریاؤں نے باہم مل کر ملک کے اس وسیع ہموار میدان کو بے انتہا زرخیز بنا دیا ہے۔

۱- جوزف چاٹلے (Administrative Problems of British India, 1910) صفحہ ۴ اور سر جان اسٹریچی (India, Its Administration and Progress) صفحہ ۳۱۔

باشندگان ملک کے اخلاق و عادات پر مذکورہ بالا باتوں کے اثرات

زمین کی زرخیزی کی وجہ سے باشندگان ملک کثیر تعداد میں زراعت کو بطور پیشہ اختیار کرتے اور اس کے باعث دیہات میں آباد ہوتے ہیں۔ اس طرح ملک کی آبادی گاؤں میں تقسیم ہو جاتی اور اس کی متعلقہ اراضی سے وابستہ رہتی ہے۔ یہی باتیں لوگوں کے اخلاق و عادات وضع کرتی ہیں۔

زراعت کا پیشہ تمام دوسرے پیشوں سے زیادہ لوگوں کو ایک قسم کی قدامت پرستی سکھاتا ہے، انھیں خطرات میں پڑنے اور کسی مہم کو سر کرنے کا شوق باقی نہیں رہتا اور جہاں ان کی ضروریات کے مطابق زیادہ مشقت و محنت کے بغیر ہی غلہ مل جاتا ہے وہاں ان میں ایک قسم کی قناعت پسندی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

معتدل آب و ہوا میں چونکہ قدرت کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہنے کے لئے زیادہ انتظامات کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے وہ لوگوں کی ضروریات کو محدود اور ان کی زندگی کو سادہ بنا دیتی ہے۔

ایک ہی جگہ جم کر رہنا، زمین سے گہری وابستگی اور حصول معاش کے لئے زمین کی محتاجی، یہ تمام باتیں لوگوں کو رفتہ رفتہ ایسے تمام خطرات سے گریز کرنے کا عادی بنا دیتی ہیں جن کی وجہ سے ان کی پر سکون زندگی میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اس طرح کاشتکار بلحاظ عادت، بلحاظ پیشہ اور بلحاظ مفاد ذاتی امن پسند بن جاتا ہے۔ وہ بمشکل جنگ کے لئے تیار ہوتا ہے اور اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں لڑائی جھگڑے سے گریز کرتا ہے، لیکن

اس کے ساتھ ہی ہمیشہ ایسے موقعوں پر جب ملک میں امن مفقود ہو، وہ ہر اس قوت کا ساتھ دینے کے لئے تیار رہتا ہے جو ملک میں امن بحال کرنے کے قابل ہو۔

اس میلان طبع کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ طاقتور غیر ملکی حملہ آور جن میں سلطنت کے مقامی دعویداروں کو شکست دینے اور ملک میں امن و امان بحال کرنے کی اہلیت و قوت ہوتی تھی، کیوں شمالی ہندوستان کے عام باشندوں کی مخالفت اور کسی دوسری قسم کی دشواری کے بغیر مذکورہ علاقے پر اپنا قبضہ و اقتدار قائم کرنے میں ہمیشہ یکساں طور پر کامیاب ہوتے رہے۔ اس علاقے میں کمزور حکومتوں اور نااہل حکمرانوں کے جلد جلد زوال پزیر ہوجانے کا باعث بھی لوگوں کا یہی میلان طبع ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

طرز و خصوصیات کا حکومت پر اثر

شمالی ہندوستان کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں دریا آورد مٹی کی بہت بڑی مقدار ہے جس کی وجہ سے وہ بہت زرخیز ہے۔ اس میں نہ اونچی پہاڑیاں ہیں اور نہ کسی قسم کے دوسرے ناقابل عبور جغرافیائی موانع جو لوگوں کی آمد و رفت یا کسی فوج کی آزادانہ نقل و حرکت میں سدّ راہ بنیں۔۱

انھیں حالات کے تقاضوں کے مطابق ملک کی سیاسی تقسیم ہوتی ہے۔ یہاں کسی ایک مرکز پر قبضہ و اقتدار قائم کر لینے کے بعد

---

۱ میدان اعظم کی خصوصیات کی بابت رچرڈ اسٹریچی کے وہ مشہور و معروف خیالات ملاحظہ فرمائیے جن کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے اور جنھیں موصوف نے ''ایشیا'' پر اپنے مضمون مطبوعہ انسائکلوپیڈیا برٹنیکا میں قلم بند کیا ہے۔

فاتح ہمیشہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ حسب مقدور اپنی فوجوں کو آگے بڑھاتا چلا جائے، یہاں تک کہ پورے میدانی علاقے پر اس کا قبضہ مکمل ہو جاتا ہے۔

ایک مرکز سے اتنے وسیع رقبے کو فتح کرنے کی مشکلات اور اپنی فوجوں کو مختلف سمتوں میں مصروف رکھ کر ان کی طاقت کو تقسیم کر دینے کا خطرہ ایسی باتیں ہیں جو فاتح کو اس بات پر آمادہ کر دیتی ہیں کہ اگر مقامی سردار و حکمران اس کی پیش قدمی پر سر اطاعت خم کر دیں تو وہ ان کی اطاعت گزاری کو قبول کر لے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جگہ جگہ کثیر التعداد نیم آزاد سرداروں کو مقامی طور پر اپنا اقتدار و اثر قائم رکھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ شمالی ہند کی گزشتہ تاریخ میں علی العموم اور مسلمانوں کے عہد سلطنت میں بالخصوص، یہاں فوجی سرداروں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں کیوں موجود ہیں۔

جب پورا میدان ایک مرکزی حکومت کے براہ راست اقتدار کے زیر نگیں آجاتا ہے تو اس پر تسلط قائم رکھنے کے لئے کافی فوجی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ضرورت داخلی و خارجی خطرات کے اندیشوں کی وجہ سے زیادہ شدید ہو جاتی ہے، بالخصوص جبکہ ملک کے اندر ایسے فوجی حکمران موجود ہوں جو مرکزی حکومت کی کمزوری یا غلطیوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہوں۔

یہ حالات اس بات کے مقتضی ہیں کہ مرکزی حکومت یعنی ملک کی سب سے زیادہ طاقتور حکومت کا طبعی میلان فوجی طرز کی

جانب ہو اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بہت چاق چوبند اور دشمنوں کی طرف سے محتاط رہے۔

جہاں فوجی طاقت میں کمی آئی اور حکومت ذرا غافل ہوئی فوراً اس کا زوال شروع ہو گیا۔ وہ علاقے جو مرکز سے دور ہوتے ہیں یکے بعد دیگرے مرکز کے دائرۂ اقتدار سے نکل جاتے ہیں اور ہر موقع پر مرکز کا اقتدار و وقار کم ہوتا جاتا ہے۔ علاقہ وسیع ہو تو اس کے دور دراز حصوں پر کمزور حکومت کی گرفت قوی نہیں رہتی۔ قدرتی وسائل کی فراوانی اور رقبہ کی وسعت دونوں ملکر مرکزی حکومت کے مختلف حصوں کے لئے، مرکز سے کٹ کر الگ الگ خود مختار سلطنتوں یا ریاستوں میں تبدیل ہو جانے کا کام آسان بنا دیتی ہیں۔ اس صورت حال پر بالآخر ''ہر سرے سردارے و ہر درے دربارے'' کی مثل صادق آتی ہے۔

اس امن و امان کو بھی جو ہر نوزائیدہ خود مختار علاقے میں کسی طاقتور بانئی سلطنت کے طفیل لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے، بہت جلد خانہ جنگیاں اور جارحانہ لڑائیاں برباد کر دیتی ہیں اور رفتہ رفتہ پھر تمام ملک میں انتشار اور بدنظمی پھیل جاتی ہے، تا آنکہ یا تو سلطنت کے مقامی دعویداروں میں سے کوئی ایک جو سب سے زیادہ طاقتور ہو، امن و امان قائم کرتا اور ملک کے لاکھوں کروڑوں باشندوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیتا ہے یا کوئی غیر ملکی حملہ آور نمودار ہوتا ہے اور وہاں اپنی حکومت قائم کر لیتا ہے۔ چنانچہ شمالی ہندوستان کی تاریخ مرکز کی طرف مائل اور مرکز سے نفور قوتوں کی باہمی کشمکش کی تاریخ ہے۔

''مرکز میں ایک حکومت قائم کرنے کے خیال میں اور علٰحدہ پسندگی کے زبردست میلان میں مدتوں مسلسل آویزش رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں کبھی چھوٹی بڑی سلطنتیں مختلف مدتوں کے لئے قائم ہو جاتی تھیں اور کبھی پورا علاقہ لا تعداد چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ایک گورکھ دھندا بن جاتا تھا''۔[1] اشوک اور ہرش کی سلطنتیں اور ان کا فطری انجام، سلطنت دہلی کا قیام اور گزشتہ سلطنتوں کے مانند اس کا عروج و زوال، بعد ازاں سلطنت مغلیہ کا قیام اور پھر اس کا بھی وہی انجام جو دوسری سلطنتوں کا ہوا، ان اثرات و عوامل کے پختہ ثبوت ہیں جو ملک کی جغرافیائی حالت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مذکورہ اثرات و عوامل برابر قائم رہے یہانتک کہ عصر حاضر میں فطرت کو مسخر کر لیا گیا۔

اس طرح ایک طرف تو جغرافیائی حالات باشندگان ملک کے پیشے اور ان کی سرگرمیوں کی نوعیت و وسعت کا تعین کرتے تھے اور دوسری طرف یہی حالات سکون خاطر کے ساتھ زندگی گزارنے کو دشوار بھی بنا دیتے تھے۔ لہٰذا امن کی شدید ضرورت کا احساس، اور امن قائم رکھنے کی دشواری وہ خاص عوامل ہیں جو ہمیشہ اس بات کے مقتضی رہے ہیں کہ خود مختار قوتیں امن کی ضامن بنی رہیں۔ حفاظت کی ضرورت ہی بادشاہی کے قیام کی خاص محرک ہوتی ہے اس لئے تحفظ ہی بادشاہ کا سب سے بڑا فرض قرار پاتا ہے۔ ہندوؤں میں تمام قدیم سیاسی مصنفوں کا اصل موضوع بحث اور ہر

---

۱ - گھوشال - صفحہ ۱ -

بادشاہ کے سامنے خاص الخاص حل طلب مسئلہ ہمیشہ یہی حفاظت کا مسئلہ رہا ہے - حفاظت اتنی بیش قیمت چیز سمجھی جاتی تھی کہ ''مہابھارت میں بھی شاہی فرض کو اخلاقی اقدار کے لحاظ سے چاروں ذاتوں اور چاروں 'ورنوں' کے مجموعی فرائض کے برابر سمجھا جاتا تھا''[1] ''اس ریاست کو جس کا کوئی بادشاہ نہ ہو ڈاکو مغلوب کر لیتے ہیں ، ان کا (یعنی باشندگان ریاست کا) کوئی اخلاقی معیار قائم نہیں ہو سکتا اور لوگ ایک دوسرے کو نگل جاتے ہیں'' -[2] ''دو شخص مل کر کسی ایک کو لوٹتے ہیں اور بہت سے آدمی مل کر ان دو کو لوٹ لیتے ہیں ، جو شخص غلام نہیں اسے غلام بنا لیتے ہیں'' -[3] حفاظت کی اہمیت پر زور دینے کے لیے لوگوں کو تاکید کی گئی ہے کہ جب بادشاہ کی طاقت رو بہ زوال ہو اور معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جائے تو وہ خود اپنے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھائیں اور اگر ضرورت ہو تو کسی ایسے شخص کی اطاعت بھی قبول کر لیں ''جو خواہ شودر ہی کیوں نہ ہو مگر یہ اہلیت رکھتا ہو کہ سماج کو نراج سے بچا سکے'' -

بادشاہی کی ضرورت - بادشاہی کا قیام ایک سیاسی ضرورت تھی اس لیے ہندوؤں کا معاشری نظام اس کی تائید کرتا تھا - چار ذاتوں میں معاشرے کی تقسیم اور چاروں کا ایک دوسرے کی امداد کا محتاج رہنا ، ایسی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے یہ ناممکن تھا کہ کوئی ایک جماعت اتنی طاقتور ہو جائے کہ بادشاہ کو ہٹا کر

---

۱ - گھوشال - صفحہ ۶ (بینی پرشاد بھی دیکھیے صفحات ۲۶ اور ۲۷ - بادشاہت کی خصوصیات) -

۲ - گھوشال صفحہ ۱۲۰ - ۳ - گھوشال صفحہ ۱۲۱ -

باقی تین جماعتوں پر خود غلبہ حاصل کر سکے۔ دوسری طرف ذات پات کے اصول کی وجہ سے معاشرہ ایسے طبقات میں تقسیم ہو جاتا تھا جو ایک دوسرے سے ہمیشہ علٰحدہ رہنے پر مجبور تھے۔ اس صورت حال نے جمہوریت کی نشوو نما کا امکان بھی باقی نہ رکھا کیونکہ جمہوریت کا پہلا اقتضا یہ ہے کہ سب لوگوں کو ایک دوسرے کے برابر تسلیم کیا جائے۔[1] ملک کی وسعت، فاصلے کی مشکلات، دیہاتی علاقوں میں آبادی کا منتشر رہنا، وہ امور تھے جن کی موجودگی میں نہ نمائندہ اداروں کے فروغ کی گنجائش تھی، نہ اس جذبہ عمل کے پیدا ہونے کی، جو نمائندہ اداروں کے قیام کا مقتضی ہوتا ہے۔ ان حالات کے تحت شمالی ہندوستان میں کسی نہ کسی بادشاہی کا ہر وقت موجود رہنا ایک ناگزیر ضرورت بن گئی۔

جغرافیائی حالات کی اس یکسانی اور پیشے کی یک رنگی نے لوگوں کی عادات، ضروریات، رسوم اور خیالات و عقائد کو بھی یکساں اور یک رنگ بنا دیا۔ ایک ھی جگہ زندگی گزارنے اور روز مرہ کی زندگی کو ایک ھی ڈھب پر بسر کرنے کی وجہ سے ان عادات و رسوم نے روایات کی صورت اختیار کر لی اور پھر وہ روایات اتنی مستحکم ہو گئیں کہ کوئی طاقت ان میں مداخلت نہ کر سکی۔

ہندوؤں کا مذہب بھی ان کے نظریہ حیات پر اثر انداز ہوا کیونکہ مذہب کی رو سے ان کا عقیدہ ہے کہ بہ لحاظ ذات وہ جس فرقے میں پیدا ہوتے ہیں، مرتے دم تک اسی فرقے سے متعلق رہنے پر مجبور ہیں۔ اس طرح مذہب اور رسم و رواج نے رفتہ رفتہ ایک

---

۱ - ''ذات پات کا اصول عظمت انسانی کے منافی ہے''۔ بینی پرشاد صفحہ ۱۱ -

سخت اور ناقابل ترمیم دستور حکومت کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ ممکن ہی تھی اور نہ مناسب۔ ان حالات میں حفاظت اور رواداری بادشاہ کے ابتدائی فرائض بن گئے۔

حکومت کی سرگرمیاں جغرافیائی تقاضوں کی پابند ہوتی ہیں۔

فریضۂ حفاظت اور وہ مشکلات جو اس سے وابستہ تھیں فوجی انداز کی حکومت کی متقاضی تھیں۔ زراعت کی وسعت اور ملک کے تقریباً ۹۰ فی صد باشندوں کا کاشتکار ہونا ایسے امور تھے جن کی وجہ سے حکومت کی آمدنی زمین کے لگان پر ہی منحصر تھی۔ لہٰذا جرّار فوجیں ہر وقت موجود رکھنا یا اُن کی فراہمی کا انتظام اور مالگزاری کی تحصیل حکومت کے اہم ترین فرائض شمار ہونے لگے۔ ہموار میدانوں اور جہازرانی کے قابل دریاؤں کی وجہ سے اندرونی تجارت کے لیے سہولتیں مہیا تھیں۔ شمال مغربی درّوں کی وجہ سے جو ہندوستان کو وسط ایشیا سے ملاتے تھے اور مغرب و مشرق میں واقع بحری بندرگاہوں کے سبب دیگر ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کیے جا سکتے تھے۔ اس کے لیے حکومت کی توجہ کی ضرورت تھی تاکہ اچھی سڑکیں بن سکیں، مال تجارت کے بہ حفاظت نقل و حمل کا انتظام ہو سکے اور گھریلو صنعت و دستکاری سرپرستانہ امداد سے محروم نہ رہے۔

یہ لازم تھا کہ ندیوں سے سیراب ہونے والے زرخیز علاقے میں آبادی گھنی ہو اور وہ مختلف پیشوں اور سرگرمیوں کا مرکز بن جائے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ تمام کاروبار سلطنت کا مرکز بھی وہیں قائم ہو اور وہ کم زرخیز اور قلیل آبادی والے علاقوں کی بہ نسبت اس کی زیادہ توجہ کا مرکز بنیں۔ لہٰذا تاریخ میں بلوچستان اور اڑیسہ

جیسے پہاڑی اور ناہموار علاقوں یا سندھ جیسے ریگستانی علاقے کی بہ نسبت پنجاب ، دوآبہ اور آبادی برہمپتر کا زیادہ نمایاں بن جانا بالکل قدرتی امر تھا۔

اس کے برعکس یہ بھی لازم تھا کہ پہاڑی باشندے اپنی مخصوص حیثیت اور رائج الوقت فن حرب کی نوعیت کے طفیل میدانوں میں رہنے والے امن پسند لوگوں کی بہ نسبت زیادہ تکلیف دہ ہوں۔ ان علاقوں کے سرداروں کا جنگجو ہونا، حکومت کے لئے ہر وقت پریشانی کا باعث بنا رہنا اور بہ حیثیت مجموعی ملک کے امن و امان کے لئے ایک زبردست خطرہ ہونا قدرتی تھا۔

بنگال، بہار یا گجرات جیسے دور دراز صوبے بھی کافی وسائل مزاحمت رکھنے اور مرکز سے دور واقع ہونے کی وجہ سے حکومت کے لیے دشواری کا باعث بن جاتے تھے۔ یہ صوبے ایک طاقتور حکومت کے حق میں قوت بازو لیکن کمزور حکومت کے لیے وجہ مصیبت ہوتے تھے۔

کوہ وندھیا چل کا اثر۔ سلسلۂ کوہ وندھیا چل شمالی میدان کی جنوبی سرحد پر واقع ہے۔ اس کے مذکورہ محل وقوع کی وجہ سے حکومت اس طرف سے حملے کا کوئی شدید خطرہ محسوس کیے بغیر آزادی و کامیابی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتی تھی۔ لیکن چونکہ شمالی میدان اور وہ حصۂ ملک جو مذکورہ سلسلۂ کوہ کے جنوب میں واقع ہے پوری طرح ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہ تھے اس لئے دفاع نامکمل تھا۔ ان پہاڑی سلسلوں کی وجہ سے ملک کے ان دونوں حصوں کے درمیان آسانی سے آمد و رفت بھی نہیں ہو سکتی تھی لیکن ایسے دلیر و با ہمت اشخاص کے لیے جو ضروری

ساز و سامان سے لیس ہوتے تھے ان پہاڑوں کے درّے ہمیشہ کھلے رہتے تھے - لہٰذا شمالی علاقے کی حکومت بھی جب اپنی مشکلات کو حل کر کے میدانی علاقوں میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی تو ہمیشہ اس لالچ سے بہ آسانی مغلوب ہو جاتی تھی جو وندھیا چل کے پہاڑی سلسلوں کی نوعیت اس کے سامنے پیش کرتی تھی - اس امر واقعہ سے حکومت کی سرگرمیوں کی ایک نئی خصوصیت اور دکن کے حملوں اور جنگوں کی تاریخ کی صراحت ہوتی ہے - یہ سلسلۂ کوہ ہر بادشاہ کے سامنے متوقع فتوحات کا ایک وسیع میدان پیش کرتا تھا جس کے باعث جارحانہ جذبے کی تخلیق ہوتی تھی اور جو حکومت کی فوجی نوعیت کو اور زیادہ مستحکم بنا دیتا تھا - اس کی وجہ سے محصولات ملکی بھی بہت بڑھ جاتے تھے اور بالآخر سیاسی اداروں کی قوت کارکردگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی تھی -

نتائج - یہ ہیں وہ جغرافیائی تقاضے جن کے مطابق شمالی ہندوستان کے تاریخی واقعات رونما ہوتے رہے ہیں اور جن سے قدیم و متوسط عہد کی شاہی حکومتوں نے یکساں طور پر اپنا ربط قائم رکھا ہے - ہر وہ بادشاہ جو ابتدائی مشکلات حل کر کے امن و امان قائم کر سکا ، جو امن و سکون کے ساتھ کاشتکاری ، تجارت اور بیوپار کرنے کی سہولتیں مہیا کرتا رہا اور جو تمام اعلیٰ و ادنیٰ طبقات آبادی کے ساتھ شفقت آمیز مربیانہ سلوک کر سکا وہی اس ندیوں اور پہاڑوں کی سر زمین میں ''عہد زرّیں'' کا علمبردار بن سکا -

کسی بادشاہ یا اس کی حکومت سے اس سے زیادہ کسی بات کی توقع نہیں کی جاتی۔ اسے لوگوں کی اصلاح و ترقی کے لئے مزید کوشش و جانفشانی کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ صرف مذکورہ بالا صورت حال مستحکم طور پر پیدا کر دے اور بعد ازاں اپنی رعایا کو اس کے پسندیدہ تصور و معیار کے مطابق سادگی، خوش حالی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے دے۔ رعایا پوری طرح ایسے بادشاہ کی فرمانبردار و اطاعت گزار رہتی ھے چونکہ سیاسی ضرورت، ان کا پیشہ، ان کی روز مرہ کی زندگی، ان کا مفاد اور ان کا مذہب سب اسی امر کے مقتضی ہوتے ہیں کہ اس اطاعت میں کمی نہ ہو۔

غرضکہ ان حالات میں بادشاہی کا قیام عمل میں آتا ھے جو مخصوص مقاصد کے لئے ایک زبردست فوجی طاقت اور کامل سیاسی اختیارات کی حامل ہوتی ھے۔ جب تک وہ مقاصد پورے ہوتے رہیں، باشندگان ملک بے چون و چرا اس کی اطاعت و حمایت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب بادشاہ غفلت یا ظلم یا زیادتی کی وجہ سے اپنا فرض انجام دینے کے قابل نہیں رہتا تو وہ اس بات کا مستحق بھی نہیں رہتا کہ اختیار و اقتدار حکومت اس کے ہاتھوں میں رہے۔ لہٰذا اس کی سلطنت میں افتراق و انتشار شروع ہو جاتا ھے جس میں باشندگان ملک سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں یہانتک کہ ملک کو طوائف الملوکی سے بچانے کے لئے پھر کوئی نیا طاقتور شخص نمودار ہو جاتا ھے اور یہ چکر اسی طرح جاری رہتا ھے۔

یہ تھے وہ عوامل و اثرات اور یہ تھے وہ حالات و واقعات جن کے سانچوں میں شمالی ہند کی تاریخ ڈھل کر تیار ہوئی اور جنھوں نے اس کی روایات و خصوصیات کی تعمیر کی۔

مسلمانوں کی حکومت

کے

تین سو سال

تجربات اور نتائج

سیاسی حالات - چندر گپت، اشوک اور ہرش کی حکومتوں کی وہ عظمت ساتویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھی، جس نے شمالی ہند کو اس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ متحد کر دیا تھا، مگر یہ اتحاد اپنی تخلیق کی ذمہ دار قوت کے زوال کے ساتھ ہی فنا ہو گیا اور معمول کے مطابق انتشار و افتراق پیدا کرنے والی قوتیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ملک متعدد چھوٹی بڑی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان ریاستوں کی حدود، ان کی فوجی طاقت سے معین ہوتی تھیں اور ان کے جارحانہ اقدامات کو صرف ان کی حریف ریاستوں کی طاقت روک سکتی تھی۔ ان آزاد و خود مختار ریاستوں کا وجود، جن کی غرض کسی اعلیٰ و ارفع مطمح نظر کی بقا، یا نگہداشت نہ تھی، ایسی باھمی رشک و رقابت کی تخلیق کا موجب بن گیا جس نے نت نئی آویزشوں کا دروازہ کھول دیا۔ جس میدانی علاقے میں یہ ریاستیں اپنے مستقبل کے منصوبے بناتی اور ان کی تکمیل کے لئے سر گرم عمل تھیں، اس کی جغرافیائی حالت بھی ان کے اپنے مقاصد کے لئے سازگار تھی اور ان کے حوصلوں کو ہر وقت بلند سے بلند تر رکھتی تھی۔

مسلمانوں کے عہد حکومت سے قبل ''چار سو سال سے ملک میں چھوٹی چھوٹی اور بلحاظ تاریخ غیرمعروف ریاستیں قائم تھیں''۔[۱] اس زمانے میں ہندوستان کی وہی حالت تھی جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جرمنی کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راجپوتوں کے شاہی خاندان ایک ایک کر کے اسی طرح ختم ہو گئے جس طرح جرمن ریاستیں فرداً فرداً نپولین کے سامنے سپر انداز ہو گئی تھیں۔ فرق یہ ہے کہ جرمنی کبھی کامل طور پر کسی غیر ملکی قوم کے ہاتھوں مفتوح و مغلوب نہ ہوا تھا لیکن شمالی ہند مستقل طور پر غیر ملکی تسلط سے مغلوب ہو گیا''۔[۲]

اس صورت حال کے اسباب اس زمانے کے ہندوؤں کے سیاسی و معاشرتی حالات کے پیش نظر ظاہر ہیں۔ ''چکرورتن''[۳] (چکرورتی) کا لقب حاصل کرنے کی تمنا میں راجپوت حکمران باہمی رقابتوں اور خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے ان کی قوت ایسی منتشر ہو گئی کہ ان کے لئے متفق و متحد ہو کر کام کرنے کا امکان تک باقی نہ رہا ۔ ذات پات کی سخت پابندی کے باعث معاشرہ اور بھی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو گیا اور ان گروہوں میں ایک دوسرے سے علحدہ رہنے کی ایسی ذہنیت پیدا ہو گئی کہ کسی کو مشترک مفاد کا خیال تک نہ آتا تھا ۔ اس طرح لوگوں کی جنگی طاقت بہت کم رہ گئی اور ان میں قومی جذبہ نہ

---

۱ - بینی پرشاد صفحہ ۳۰۵ -

۲ - C. V. Vaidya—*Downfall of Hindu India*, pp. 362-63

۳ - جس کتاب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس کے صفحہ ۸ پر درج ہے ''چکرورتن'' وہ شخص کہلاتا ہے جو کماری پورہ سے جھیل بندوسار تک ملک فتح کر لے -

پیدا ہو سکا۔ ''ہندو مملکت، اپنی تنگ خیالی، تنگ نظری اور دنیا بھر سے الگ تھلگ رہنے کے باعث رفتار زمانہ کا ساتھ نہ دے سکی اور پے در پے غیر ملکی حملوں کو روکنے کے لیے اپنے داخلی وسائل حفاظت کی تنظیم نہ کر سکی۔ بالآخر تیرھویں صدی عیسوی میں اس کا جہاز ان طوفانوں کی نذر ہوگیا جن کے مقابلے کی طاقت اس میں باقی نہ تھی''۔[1]

سلطنت دہلی - ایک آزاد و خود مختار طاقت کے طور پر دہلی میں سلطانی حکومت کے قیام سے شمالی ہند میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوا جس نے وہاں کی سیاسیات کا رخ بالکل بدل دیا۔ اپنی غیر ملکی فوج اور اپنے غیر ملکی طبقۂ امراء کے ساتھ اس نئی سلطنت کو مخصوص قسم کی مشکلات پیش آئیں۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود جو مذہب، نسل تہذیب و تمدن اور زبان کے پیدا کردہ تھے، نئے حکمرانوں اور آریا ورت کے باشندوں کے درمیان دو باتیں مشترک تھیں۔

دو مشترک امور - اول۔دونوں کی خواہش یہی تھی کہ امن قائم کیا جائے اور انتشار و افتراق پیدا کرنے والے اسباب کو ختم کر کے ایک ایسی سیاسی وحدت قائم کی جائے جو ملک کو غیر ملکی حملوں اور جنگجو مقامی جماعتوں یا گروہوں سے محفوظ رکھنے کی ضامن ہو۔ یہ وہ کام تھا جسے راجپوت سردار انجام نہ دے سکتے تھے۔ پورے شمالی ہند کو مسخر کیے بغیر اس مقصد کا حصول ناممکن تھا۔ حاکم و محکوم کے مشترک مفاد کی وجہ سے

---

۱ - بینی پرشاد - صفحہ ۵۱۳۔

جہاں سلاطین دھلی کو ایک طرف ان خود غرض حکمرانوں اور سرداروں کو مغلوب کرنے کے سلسلے میں کافی سہولتیں حاصل ہوئیں جن کی وجہ سے ملک میں جنگ و جدال کا سلسلہ لامتناھی بن گیا تھا، وھیں دوسری طرف خود سلاطین دھلی کو بھی اپنی ھندو رعایا سے برتاؤ میں اپنے مذھبی، نسلی یا قومی طرز عمل اور افکار کو تبدیل کرنا پڑا۔ مسٹر ویدیا بھی ھندو مملکت کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے اسی نتیجے پر پہنچے ھیں گو ان کا استدلال مختلف ھے: "......باشندگان ھند نے بحیثیت مجموعی قومی جد وجہد میں کبھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ انھوں نے ھمیشہ پس و پیش کیے بغیر غیر ملکیوں کی اطاعت قبول کر لی۔ خاص کر اس لیے .... کہ مسلمان فرمانرواؤں نے اپنے مذھب کی اشاعت کے لیے کسی جبر و اکراہ سے کام نہ لیا۔[۱]

امن و امان اور ملک میں واحد سیاسی طاقت ۔ قیام امن کا کام شمس الدین التتمش اور بلبن کے ھاتھوں انجام کو پہنچا۔ اول الذکر نے اپنے ھم مذھب حریفوں کو شکست دے کر آریہ ورت کی فتح مکمل کر لی اور موخرالذکر نے نئی سلطنت کو منظم و مستحکم کر کے ھر حیثیت و نوعیت کے مقامی سرداروں کی سرگرمیوں کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ ان دونوں کی کوششوں سے ایک ایسی طاقتور سلطنت وجود میں آگئی جس نے خود اپنے قیام کو حق بجانب ثابت کر دیا، جس کی بدولت ملک اور باشندگان ملک کو امن و امان نصیب ھو گیا اور جس نے انھیں یہ سکھا دیا

---

۱ ۔ مذکورہ بالا کتاب مصنفہ سی۔ وی۔ ویدیا صفحہ ۳۶۵۔

کہ وہ صرف ایک طاقت کا احترام کریں اور خطرے کے وقت صرف اسی کی مدد پر بھروسا رکھیں۔

دوسری مشترک بات یہ تھی کہ حکمران قوم اور محکوم دونوں بادشاہی طرز حکومت کے قائل تھے۔ ہندوؤں کی طرح حکمرانوں کا خود بھی ایک مذہبی قانون تھا جو مستبد حکمرانوں کی مطلق العنانی پر کچھ پابندیاں عائد کرتا تھا۔ شمالی ہندوستان کے خاص حالات میں امن کے قیام اور اسے بحال رکھنے کے مشکل کام کے صلے میں لوگ اس بات کو ایک ناگزیر برائی سمجھ کر گوارا کر لیتے تھے کہ حکمران قیام امن کے لئے شورش پسندوں سے جیسا سخت سلوک بھی مناسب سمجھے روا رکھے۔ بادشاہ کے ان اختیارات کا سرچشمہ خواہ مذہب ہوتا، خواہ 'بادشاہوں کا ''الٰہی حق''، خواہ احکام خداوندی کی تعمیل اور خواہ سیاسی ضرورت، نتیجہ ایک ہی رہتا۔ نئے حکمران اور باشندگان ملک دونوں اس ضرورت سے بخوبی واقف تھے اور اپنی اپنی جگہ دونوں کو اس کا عملی تجربہ تھا۔

سلطنت کے لئے تین خطرے

سلطنت کو بالخصوص تین خطروں سے محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ اول شمال و مغرب سے بیرونی حملہ آوروں کا خطرہ۔ دروازہ کھلا تھا اور خود فاتحین اس کی مثال قائم کر چکے تھے۔ دوم خود حکمران جماعت کے منچلے افراد کی ہوس ملک گیری اور ان کی طرف سے باغیانہ اقدامات کا خطرہ۔ بادشاہ کے حواریوں اور مصاحبوں میں ہر فرد کو بادشاہ کی طرح بزور شمشیر تخت و تاج حاصل کرنے

کا حق حاصل تھا - سلطنت کسی کی دسترس سے باہر نہ تھی - لوگ نہایت خوشی سے ہر ایسے شخص کی امداد پر کمر بستہ رہتے تھے جو حصول سلطنت کے لئے ذرا سی جرأت ، بیباکی اور موقع شناسی سے کام لیتا تھا - سوم اثر و قوت رکھنے والے مقامی لوگوں کی سرکشی کا خطرہ جو نو زائیدہ سلطنت کے خلاف کسی وقت بھی متحد ہو سکتے تھے - یہ لوگ حکمران طبقے کی کمزوری اور غلطیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے -

ان خطرات کی وجہ سے اور ملک کے عجیب و غریب حالات اور باشندگان ملک کی ضروریات کے باعث حکومت مجبور تھی کہ اپنے قیام و استحکام کے لیے اپنی فوجی طاقت پر تکیہ کرے اور حکمران طبقے کے افراد کو خواہ خوف دلا کر خواہ شفقت و عنایت کے ذریعے سے اس طرح اپنا مطیع و فرمانبردار بنا کر رکھے کہ نہ انھیں مخالفت کا کوئی موقع ملے نہ رعایا میں کسی قسم کا اشتعال پیدا ہو -

حکمت عملی - مختصر یہ کہ فوجی طاقت ، اتحاد مرکزی اور رعایا کے معاملات میں عدم مداخلت ، یہ تین اصول سلاطین دھلی کی رھنمائی کرتے تھے - ان کی تاریخ انھیں تجربوں ، کوششوں اور جانفشانیوں کی تاریخ ھے جو مذکورۂ بالا مقاصد کے حصول کے لئے انھوں نے کیں -

پہلا تجربہ - یہ تجربے تعداد میں تین تھے - پہلا تجربہ جو شمس الدین نے کیا ، یہ تھا کہ اس نے سلطنت کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصہ ایک ایک امیر کے سپرد کر دیا - یہ علاقے جاگیردارانہ فرائض و حقوق کے اصول پر عطا کیے گئے تھے -

فوجی سرداروں میں ملک کو اس طرح تقسیم کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں تحفظ سلطنت سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور انھوں نے مقامی جنگ جو عناصر کو قابو میں رکھنے کے لئے فوجی چوکیاں قائم کیں۔ اس کے علاوہ شمس الدین نے پر خلوص حامیان سلطنت کی ایک جماعت بھی تیار کی اور اسے مرکز ہی میں رکھا۔ اس جماعت کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے فوجی سرداروں کی طاقت اور سرگرمیوں پر دباؤ قائم رہے کیونکہ فوج اور ملک کے وسائل آمدنی انھیں سرداروں کے درمیان منقسم تھے۔ تاریخ میں وفاداران سلطنت کی یہ جماعت ''چالیس وفاداروں کی جماعت'' کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تدبیر نہایت معقول تھی اور خاندان غلاماں کے عہد حکومت میں اس پر نہایت اچھی طرح عمل درآمد ہوا۔ اس طریقے سے حکمراں خاندان کو بہت تقویت حاصل ہوئی اور جانشینان شمس الدین کی کمزوریوں کے باوجود سلطنت اسی کے خاندان میں رہی۔ سلاطین کا رد و بدل سلطنت کے مفاد کے لیے کیا جاتا تھا۔ کمزور و ناکارہ بادشاہوں کو بر طرف کر کے طاقتور اور قابل تر بادشاہوں کو تخت پر بٹھایا جاتا تھا۔۱ اس تجربے کی وجہ سے حصول تاج و تخت کا حوصلہ رکھنے والے مسلم افراد کی تعداد بہت کم رہ گئی اور یہ رسم قائم ہو گئی کہ بادشاہت ایک ہی خاندان میں رہے۔

لیکن اس تدبیر اور تجربے کی کامیابی مرکزی ''جماعت وفاداران'' اور صوبائی فوجی سرداروں کے اتحاد پر منحصر تھی۔ رفتہ رفتہ

۱۔ ایسی تبدیلیوں کے لئے طبقات ناصری کے صفحات ۱۸۲، ۱۸۵، ۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۷ اور ۲۰۱ دیکھیے۔

یہ بات ناممکن ہو گئی اور ''چالیس وفاداروں'' کی جماعت کے غلبہ و اقتدار پر حکمران طبقے کی دیگر جماعتیں ناک بھوں چڑھانے اور اس کی مخالفت کرنے لگیں۔[1]

یہ کشمکش جاری رہی یہاں تک کہ سلطان ناصر الدین کے وقت میں بلبن کو غلبہ و اقتدار حاصل ہوا۔ وہ ان چالیس میں سے ایک تھا۔ اس نے نہ صرف انتشار و افتراق پیدا کرنے والے اشخاص کو مغلوب کیا بلکہ خود بادشاہ کو بھی اپنے زیر اثر کر لیا۔ جیسا کہ برنی لکھتا ہے ''سلطان را نمونہ می داشت و پادشاہی خود میراند''[2] (یعنی سلطان برائے نام سلطان رہ گیا اور حکومت (بلبن) کرنے لگا)۔ اس کی حکمت عملی شمس الدین کی حکمت عملی کے بالکل بر عکس تھی۔ اس نے دربار سلطانی کی طاقتور جماعت کو تخت سلطانی کے لیے ایک زبردست خطرہ تصور کیا اور اپنے طویل زمانۂ اختیار و اقتدار میں یعنی بہ حیثیت نائب سلطنت اور بہ حیثیت سلطان اس نے آہستہ آہستہ اس جماعت کو ختم کر دیا، یہاں تک کہ تمام قلمرو میں کوئی جماعت ایسی باقی نہ رہی جو بادشاہ کو اپنی مرضی پر چلاتی رہتی یا بوقت ضرورت اسے تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر سکتی۔

بلبن سلطنت کو ایک خاندان میں رکھنے کا قائل تھا اور اس نے مذکورہ جماعت کو اسی لئے کچل دیا کہ اپنے خاندان کا مفاد محفوظ رہے۔ لیکن اس طرز عمل سے اس واحد طاقت کا خاتمہ

۱۔ مذکورہ جماعت کا غلبہ و اقتدار کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے برنی کی کتاب کے صفحات ۲۵ و ۲۶ دیکھیے۔

۲۔ ایضاً صفحہ ۲۷۔

ہو گیا جو خطرے کے وقت سلطنت کے لیے باعث تقویت ہو سکتی تھی اور کمزور و نا اہل حکمرانوں کے زمانے میں اسے دشمنوں سے بچا سکتی تھی - بلبن کا یہ اقدام تباہ کن ثابت ہوا اور اس کی وفات کے بعد پانچ سال کے اندر اندر اس کے خاندان کی حکومت ختم ہوگئی -[1]

جلال الدین خلجی کی تخت نشینی اور اس کے طریقۂ حصول تخت و تاج ، دونوں باتوں سے ایک خاندان میں حکومت قائم رہنے کی روایات کو سخت نقصان پہنچا - جلال الدین کے قتل اور علاء الدین کی تخت نشینی سے تشدد کی ابتدا ہوئی - اگرچہ اس نے کامیاب حکومت اور معقول انتظام سلطنت کے ذریعے سے اپنے فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی اور تخت و تاج کے وقار میں حقیقۃً اضافہ کر دیا ، تاہم اس کی وجہ سے جو نقصان سلطنت کو پہنچ گیا وہ ناقابل تلافی تھا - جو مثال اس نے قائم کی تھی اس کی تقلید خود اس کے رشتہ داروں نے اس کی زندگی ہی میں کی -[2] اس کے منظور نظر نائب نے اس کے بیٹوں کو بر طرف کرنے کی نہایت دلیرانہ ، مگر ناکام کوشش کی - اس کے بیٹے مبارک شاہ کا نائب بھی اسی کے نقش قدم پر چلا اور اپنے آقا کو بر طرف کر کے خود تخت نشین ہو گیا - اگرچہ وہ اپنی حکومت کو قائم نہ رکھ سکا لیکن اس کی حرکتوں کی بدولت خاندان خلجی کی تباہی

---

۱ - تاریخ فیروز شاہی مصنفہ برنی صفحہ ۱۲۳ (کارنامۂ بلبن) اس کی وفات کے بعد لوگ اسے حامی بیکساں سمجھتے تھے - صفحات ۱۳۷ و ۱۳۸ - ۱۵۱ اور ۱۷۱ بھی دیکھیے - ''اس کے (جلال الدین خلجی کے) انتقال کو ابھی تین سال سے زیادہ نہیں گزرے ہیں - لیکن مجھے اس ایوان میں اس کے درباریوں میں سے تین یا چار افراد سے زیادہ نظر نہیں آتے'' (صفحہ ۱۷۹) -

۲ - برنی صفحہ ۲۸۲ عاکت خان ، ملک عمر اور ملک منگو -

مکمل ہو گئی اور اس کے بجائے خاندان تغلق بر سر اقتدار آگیا۔ اس طرح ایک خاندان میں سلطنت باقی رہنے کا قاعدہ جس پر خاندان غلاماں میں اچھی طرح عملدرآمد ہوچکا تھا ، ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اور پھر کبھی اسے بہ نظر وقعت نہیں دیکھاگیا۔ ملک کافور کی کوششوں اور ملک خسرو کی کامیابیوں نے نسلی برتری کے اصول کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ قیام سلطنت کے باقی ماندہ زمانے میں حکمران خاندانوں کی جلد جلد تبدیلی اور زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے امرائے سلطنت کی باھمی لڑائیاں اسی میلان کا نتیجہ تھیں ، جس کا شمس الدین نے اپنی تدبیر سے سد باب کرنا چاھا تھا۔

شمس الدین کی حکمت عملی کا دوسرا جزو یہ تھا کہ اس نے وسیع اختیارات مقامی فوجی سرداروں کے ھاتھوں سے نہ چھین کر ان کا ذاتی وقار قائم کر رکھا تھا۔ لیکن علاءالدین خلجی نے اس طریقے کی عملاً مخالفت کی۔ اس کی انتظامی اصلاحات ، جاگیروں کا واپس لے لینا ، ایک مستقل مرکزی فوج کا قیام ، اس کا نظام جاسوسی ، ان سب باتوں کی غرض و غایت یہی تھی کہ بلبن کی قائم کردہ حکمت عملی کو فروغ حاصل ہو۔ بلبن اور علاءالدین کی حکمت عملی کا نتیجہ یہ ھوا کہ ان کے عہد میں کوئی ایسا شخص پیدا نہ ھوا جو غیر معمولی اوصاف سے متصف ھوتا اور ایک فرد بھی اس طرح ممتاز نہ ھوا جس سے ایسے کارھائے نمایاں کی توقع ھو سکتی جو بعض اوقات شاھی حکومتوں کے دور میں جلیل القدر اشخاص انجام دیا کرتے ھیں۔ علاءالدین بلبن کے نقش قدم پر چلا

اور اس کے خاندان کا بھی وہی حشر ہوا جو بلبن کے خاندان کا ہوا تھا ۔۱

دوسرا تجربہ ۔ دوسرا تجربہ فوجی جاگیروں کو جاگیر داری سے متعلقہ حقوق و فرائض کے ساتھ باقی رکھنے ، لیکن جاگیرداروں کو مالیۂ سلطنت کی حد تک مرکزی حکومت کے سامنے جواب دہ بنانے کے متعلق تھا ۔ لہٰذا ان کے لئے اپنی آمدنی کا حساب محکمۂ وزارت میں پیش کرنا لازم قرار پایا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہان تغلق کے عہد حکومت میں اس طریقے پر مسلسل عملدرآمد ہوتا رہا ۔ اپنے محکمۂ مال کو محمد تغلق کی تاکید تھی کہ حسابات طلب کرنے میں جاگیرداروں سے مؤدبانہ برتاؤ کیا جائے ۔ اس تاکیدی حکم سے فوجی سرداروں کی بلند حیثیت پربھی روشنی پڑتی ہے ۔۲ سلطان محمد بن تغلق نے اس طریقے پر خوب عمل کیا اور قطعاً اپنی صوابدید کے مطابق اس نے مقررہ رقوم کے عوض مختلف اشخاص کو مختلف علاقے عطا کر دیے ۔ فیروز تغلق نے فوجی سرداروں کے وقار میں اضافہ کرکے انہیں بادشاہ کی تائید و حمایت پر رضا مند رکھنے کا پرانا طریقہ اختیار کیا ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی انہیں اپنے حسابات سے حکومت کو باخبر رکھنا پڑتا تھا ۔ البتہ جب فیروز کی وفات کے بعد ملک میں بد نظمی پھیلی تو فوجی سرداروں نے تمام پابندیوں سے آزادی حاصل کر لی اور ملک کے سیاسی حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی کامل خود مختاری کو

---

۱ ۔ خاندان علاء الدین کے زوال کی بابت دیگر ہمعصر مؤرخین کی رائے معلوم کرنے کے لیے برنی کی کتاب کا صفحہ ۳۷۸ دیکھئے ۔

۲ ۔ برنی صفحہ ۴۳۱ ۔

مدت دراز تک قائم رکھا - چنانچہ بہلول لودھی کو بھی چار و ناچار یہی صورت حال برقرار رکھنی پڑی -

تیسرا تجربہ- بہلول نے شمالی ہندوستان میں قبائلی اصولوں کے مطابق حکومت کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ تیسرا تجربہ تھا - اس میں بادشاہ خود بھی دیگر سرداروں کی طرح ایک سردار کی حیثیت رکھتا تھا جسے دوسرے سرداروں کی رضا مندی سے اقتدار سلطنت سونپ دیا جاتا تھا -۱ اس صورت حال نے شاہی حکومت کے وقار کو بہت نقصان پہنچایا ، مگر سکندر لودھی اپنی وسیع تر قلمرو اور کثیر تر وسائل آمدنی کے باوجود اس صورت حال میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے سے قاصر رہا - اس کے فرزند ابراہیم لودھی نے جو اس کا جانشین بھی تھا ، اپنے فوجی سرداروں سے الجھنے کی جرات کی لیکن اس سے وہ ایسی مصیبت میں گرفتار ہؤا کہ سلطنت بھی اس کے ھاتھ سے نکل گئی -۲

غرضکہ سلطنت دھلی کی تاریخ شاہی حکومت اور ملک کے جاگیرداروں کی اس باھمی کشمکش کی داستان ھے جس کی صورت مختلف اوقات میں مختلف رھی - اس کشمکش کے دوران میں بادشاھت اس مرکزی وحدت سے محروم ھوگئی جو ایک غیر ملک میں اس کے تحفظ کے لئے ضروری تھی - خود ان ترکوں نے بھی جو ابتدائی

---

۱ - دیکھیے داؤدی ورق ۷ - جس میں بیان کیا گیا ھے کہ امراء سلطنت کے درمیان اس کی کیا حیثیت تھی -

۲ - داؤدی ورق ۵۳ اور ورق ۵۹ برائے مخالفت امراء - ورق ۶۲ برائے اھلیت و کارگزاری ابراھیم - ورق ۶۱- میدان جنگ میں اس کی شجاعت "دگر سوئے روم آں خود نامردیست نہ کار سر خرویاں رو زردیست"

دور میں شمس الدین کے بعد بر سر اقتدار آئے اس مرکزی وحدت کو برقرار رکھنے کی زیادہ فکر نہیں کی - جب ملک ان کی مخالفت کے قابل نہ تھا وہ آپس ھی میں بر سر پیکار رھے اور صرف ذاتی مفاد یا حصول تخت و تاج کی ھوس ھی امراء کے پورے طبقے کے دل و دماغ پر مسلط رھی - حصول اقتدار کی یہ کشمکش مقامی جنگ جو افراد کی امداد کے بغیر جاری نہیں رکھی جا سکتی تھی - لہٰذا ایسے اشخاص علاءالدین خلجی ھی کے زمانے سے اس میں شریک کر لیے گئے - فیروز تغلق کی وفات کے بعد ان اشخاص نے نمایاں حیثیت اختیار کر لی اور بالآخر پندرھویں صدی عیسوی میں یہ لوگ از سرنو طاقتور ھوگئے - لیکن ٹھیک اس وقت جب ان کے دلوں میں اقتدار شاھی حاصل ھو جانے کی امیدیں بندھ رھی تھیں ، بابر کی اتفاقی کامیابی نے جو اسے بمقام پانی پت اور بعد ازاں بمقام کنواھہ حاصل ھوئی ، ان کے حصول اقتدار کے خوابوں کا خاتمہ کر دیا -

شاھی حکومت کی اس طرز کے سوا جسے صرف حکمران جانتے تھے یا ان کی رعایا ، کسی دوسری طرز یا کسی قسم کے دستور کے بغیر ایک وسیع ملک پر حکمرانی کے جو تجربات ان سلاطین نے کئے ان میں سے ھر تجربہ بجائے خود قابل قدر تھا اور اس میں شک نہیں کہ شمس الدین ، بلبن ، علاءالدین ، فیروز تغلق اور بہلول لودھی نے جو طریقے خود وضع کرکے اختیار کیے وہ ملک کے فائدے کے لیے تھے اور ملک کے لیے ان کی حکومت اور کارگزاری مفید بھی ثابت ھوئی لیکن اس کے باوجود یہ تجربے نہ اصل مشکل کو حل کرسکے اور نہ کوئی ایسی بات پیش کرسکے جس سے آئندہ

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے کوئی قطعی یا مستقل مدد مل سکتی۔

نتائج۔ انھوں نے ہر قسم کی نئی نظیریں قائم کیں اور پرانی روایات میں سے کوئی ایسی نہ تھی جسے انھوں نے کبھی نہ کبھی رد نہ کر دیا ہو۔ حکمران خاندانوں کی متواتر تبدیلیوں کی وجہ سے سلطنت میں ''یک خاندانی حکومت'' کے اصول کو استحکام نصیب نہ ہو سکا اور کسی ایک خاندان میں بھی جانشینی سے متعلق خاص روایات قائم نہ ہو سکیں۔ ہر شخص تخت پر قبضہ کرسکتا تھا۔ بادشاہوں کے پے در پے قتل نے ان کی ذات سے وابستہ تقدس کے عقیدے کا بھی خاتمہ کر دیا۔ خفیہ قتل کی سازشیں وزراء کے لیے بادشاہوں سے اور بادشاہوں کے لیے وزراء سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئی تھیں[1]۔ شاہی حکومت کا وقار مٹ گیا تھا اور اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی دوسری طاقت رونما نہ ہوئی تھی[2]۔

کسی حکمران خاندان یا کسی بادشاہ نے عوام اور حکومت کے درمیان براہ راست رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔ ملک

۱- دیکھیے تاریخ مبارک شاہی صفحات ۲۵۱ تا ۲۵۴ اور ۲۶۱ و ۲۶۲ سرورالملک کی سازشوں سے سلطان مبارک شاہ قتل ہؤا اور اس کے جانشین محمد شاہ کی کوششوں کا نتیجہ سرورالملک کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

۲- شمس الدین کی طرح فیروز تغلق نے بھی خاندان غلاماں کا تجربہ دھرایا۔ لیکن اس کے بعد یہ تجربہ بھی ناکام رہا۔ خاندان غلاماں کی بابت تاریخ فیروز شاہی مصنفہ عفیف۔ صفحہ ۲۸۶ دیکھیے۔ مختلف محکمہ صفحہ ۲۷۰ بہ حیثیت تیر انداز و تیغ زن صفحہ ۲۷۱ عہدہ دار ۲۷۲۔ دیوان عرض۔ عمادالملک۔ بادشاہ کا ایک غلام صفحہ ۳۴۳ و ۴۴۴۔ اس کی حیثیت۔

تاریخ مبارک شاہی۔ اوراق ۱۶۲ - ۱۶۴ - ۱۷۱۔ سلطان فیروز کے بعد دارالحکومت میں ان کا تسلط۔ اس کا نتیجہ۔ ورق ۱۸۰۔

کو فوجی جاگیروں میں تقسیم کرنے کے طریقے نے جس پر (علاءالدین خلجی کے مختصر دور حکومت میں اس کے محدود رقبے کو چھوڑ کر) پورے ملک میں ہمیشہ عمل رہا تھا ، اس قسم کے براہ راست رابطے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رکھی تھی - لہٰذا سلطنت کو بہ حیثیت مجموعی عوام کی حمایت کبھی حاصل نہ ہو سکی - اپنے سردار سے وفاداری یا بادشاہ کی نمک حلالی کا خیال صرف ان لوگوں کے دلوں کو گرماتا تھا جو واقعی نمک حلال ، شریف اور خدا ترس تھے -

مسلمانوں میں اتحاد باہمی کا نام و نشان نہ تھا - انھوں نے تخت سلطنت کو مشترک میراث کبھی نہ سمجھا نہ کبھی اس کی حمایت کے لئے متحد ہوئے - عوام میں بہ حیثیت مجموعی نہ کبھی قوم پرستی کی حس کا کوئی سراغ ملا نہ کبھی کسی مرحلے یا نازک موقع پر انھوں نے قومی جذبے کے زیر اثر کام کرنے کا کوئی ثبوت دیا -

بابر نے اس ملک کو اور اہل ملک کو جس حالت میں پایا ، اس کا واضح نقشہ اس نے پیش کیا - اس سے ہم خوب سمجھ سکتے ہیں کہ جب مغل یہاں وارد ہوئے تو انھیں کس صورت حال سے سابقہ پڑا اور کس قسم کے لوگوں سے عہدہ برا ہونا پڑا -[1]

بابر کو کسی قسم کی اصلاح کا وقت نہ مل سکا اور ہمایوں کو بھی اس کی ابتدا کرنے کا موقع حاصل نہ ہوا - چنانچہ ان کے زمانے میں پرانا نظام ہی قائم رہا - ہمایوں کی شکست ، اس کا اخراج اور بعد ازاں اس کا دوبارہ ملک کو فتح کرلینا ، ان تمام باتوں نے

۱- بابر نامہ - جلد ۲ - صفحات ۱۹۵ تا ۲۰۸ اور ۲۴۱ تا ۲۴۷ -

اس حقیقت کو کہ شاہی خاندانوں کی زندگی صرف چند روزہ ہوتی ہے ، اور واضح کردیا ۔ نیز اس سے حکمران قوم کی باھمی نا اتفاقیوں کے نتیجے پر بھی مزید روشنی پڑی ۔

شیر شاہ تمام اختیارات کو بادشاہ کی ذات میں مرکوز کردینے کا حامی تھا ۔ علاءالدین کی طرح وہ اس بات کا مخالف تھا کہ ملک میں کوئی دوسری طاقتور جماعت بھی پیدا ہو ۔ اس نے ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے کسی ایسی جماعت کے قیام کی کوئی گنجائش ھی باقی نہ رھی لیکن اس کا زمانۂ حکومت اتنا قلیل تھا کہ اس تجربے پر پوری طرح عملدرآمد نہ کیا جاسکا ۔ تاھم اس کی اصلاحات نے اس کے جانشینوں کو عمل کی راھیں سجھا دیں ۔

شمالی ھندوستان میں مسلمانوں کی سہ صد سالہ حکومت کے تجربات و نتائج کی روشنی میں تعمیر نو کا کام اکبر کے لئے مقدر ہو چکا تھا ۔

حصه اول

باب اول

بادشاہ اور مملکت میں اس کی حیثیت

خاکہ

مملکت کی ابتدا : ہندوؤں اور مسلمانوں کا تصور ۔

بادشاہ کی ضرورت : معاشرے کی حفاظت و نگہداشت ۔

بادشاہ ، ایک مطلق العنان فرمانروا :۔ بلحاظ اقتدار و اختیار مملکت کا اعلیٰ ترین فرد ۔

عنصر تقدس (نظریۂ ظل اللّٰہیت) : اس نظریے کی تبلیغ سے سیاسی مفکرین کی غرض ۔

اوصاف سلطانی : ابوالفضل کی رائے ۔

ابوالفضل کا 'سلطان کامل' : 'حاکم عادل' کے متعلق اس کا تصور ۔ اس کے مقررہ معیار کی تائید اکبر ، جہانگیر اور شاہ جہان نے کی ۔

اتفاق (سبب مجہول) کا عنصر : کامیابی کا دارو مدار کلیۃً بادشاہ کی شخصیت اور وقت کی سیاسی ضروریات پر تھا ۔

مملکت کی ابتدا

ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کے عہد اقتدار میں مملکت کا نظریہ، شاہی حکومت کا نظریہ تھا۔ بادشاہ کی ذات ہی تمام افکار سیاسی اور فرائض مملکت کا محور سمجھی جاتی تھی۔ سیاسی مفکرین کی تصانیف میں بھی جہاں انھوں نے اپنے خیالات ونظریات بیان کئے ہیں اس بات کا ذکر نمایاں ہے کہ جغرافیائی حالات اور ان کی عجیب وغریب خصوصیات کا شدید تقاضا یہی تھا کہ ملک میں وسیع پیمانے پر امن و امان قائم رکھا جائے جیسا کہ دیباچے کے پہلے دو حصوں میں بالتصریح بیان کیا جا چکا ہے۔

قیام امن کی شدید ضرورت ہی مملکت کی تشکیل اور بادشاہ کی موجودگی کی مقتضی ہوتی ہے۔ مہابھارت اور شانتی پرون میں یہی کہا گیا ہے۔ نیز منو اور کوتیلیا کے خیال کے مطابق بھی معاشرے کو طوائف الملوکی کی لعنت سے محفوظ رکھنے کے لیے شاہی اقتدار ضروری ہے کیونکہ پرانے زمانے میں بھی وہ لوگ جن کا کوئی بادشاہ نہ ہوتا تھا " تباہ ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کو اس طرح نگل جاتے تھے جس طرح بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں "[۱] لوگ نشے کے استعمال، طمع، غیض و غضب اور عیاشی جیسی برائیوں میں مبتلا ہو کر بالکل ناکارہ ہو گئے۔ " دنیا میں انتشار پھیل گیا اور ویدوں کے ساتھ ساتھ عدل و انصاف کا بھی خاتمہ ہو گیا "[۲] ' حکمران کے بغیر لوگ تباہ ہو رہے تھے "[۳] کیونکہ

۱ - گھوشال مہابھارت صفحہ ۱۷۴ - بینی پرشاد مہابھارت صفحات ۲۷ تا ۲۹ نظریہ -

---

۲ - یو این گھوشال- شانتی پرون صفحہ ۱۷۶- منو صفحات ۴۷ و ۵۷ -
۳ - بینی پرشاد، ابتدائے مملکت صفحہ ۹۵ بیان کوتیلیا -

''بادشاہ کی غیر موجودگی میں زبردست زیردستوں کو نگل جاتے ہیں''۔۱
''جس طرح آفتاب و ماہتاب کے طلوع نہ ہونے سے دنیا پر گہری تاریکی چھا جاتی ہے، جس طرح مچھلیاں تھوڑے پانی میں اور چڑیاں محفوظ جگہ کے لیے ایک دوسرے سے لڑ لڑ کر تباہ و برباد ہو جاتی ہیں' اسی طرح یہ لوگ بادشاہ کے بغیر تباہ و برباد ہوں گے اور بے چرواہے کے گلے کی طرح ان کا بھی نام و نشاں باقی نہ رہے گا''۔ ۲

مسلم فقہا و مصنفین بھی اس کے جواز میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں لیکن اپنے طرز پر۔ ملک میں امن اور معاشرہ میں ضبط و نظم قائم کرنے کے سلسلے میں انسان کی خود غرضی اور اس کی سرکش فطرت خاص طور پر رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ ادنیٰ اوصاف اور ناکارہ اخلاق مثلاً ظلم و جور، نا انصافی و سرکشی، فطرت انسانی کے جزو بن چکے ہیں۔ لہذا حکم الٰہی یہ ہے کہ لوگوں میں ایک 'حاکم عادل' ہونا چاہیے جو اعمال بنی آدم اور احوال اہل علم کی رہنمائی کرے اور انہیں مامون و مصون رکھے۔۳ حاکم عادل کو بر طرف کر دینے پر تلواریں بے نیام ہو جاتی ہیں اور خون کی ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ جو زبردست ہوتا ہے وہ من مانے کام کرتا ہے۔ گویا نیستان میں ایک آگ لگ جاتی ہے جو ہر خشک چیز کو جلا کر خاک کر دیتی ہے اور خشک درختوں کے قریب ہونے کی وجہ سے ہرے بھرے درخت بھی جل کر خاک ہوجاتے ہیں''۔۴ ابوالفضل بھی اسی خیال کے ساتھ ابتدا کرتا ہے۔ ''اگر سلطان کا وجود نہ

---

۱ - گھوشال - بیان کوتیلیا - صفحہ ۱۵۴ -
۲ - شانتی پرون صفحہ ۶۸ بحوالہ گھوشال صفحہ ۹۰ -
۳ - ذخیرۃ الملوک - اوراق ۲۸--۲۹ م-ت ۶۱۸ ۷ -
۴ - سیاست نامہ صفحہ ۶ -

ہوتا تو فتنہ فساد کے طوفان سے کبھی نجات حاصل نہ ہوتی۔ نہ خود غرضی و نفس پرستی کا قلع قمع ہوتا۔ لاقانونیت اور نفسانیت سے مغلوب ہو کر نوع انسانی قعر ہلاکت میں گر جاتی - دنیا......سے فارغ البالی رخصت ہو جاتی اور تمام کرۂ ارض ایک دشت بے آب و گیاہ بن کر رہ جاتا "۔[۱]

بادشاہ کی ضرورت

چونکہ طوائف الملوکی، انتشار ملکی، انسان کی جبلی خود غرضی اور طاقت ور افراد کے مظالم ہی کی وجہ سے بادشاہ کی ضرورت کا جواز پیدا ہوا لہذا "رعایا کی حفاظت کرنا" خاص الخاص فریضۂ سلطانی قرار پایا۔ "انسان کے لئے پہلے بادشاہ کی ضرورت ہے، پھر بیوی کی اور اس کے بعد دولت کی۔ کیونکہ ملک میں جب تک بادشاہ نہ ہو، انسان اپنی بیوی اور دولت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا"۔[۲] "جو بادشاہ اپنی رعایا کی اچھی طرح حفاظت کرتا ہے اسے رعایا کی ہر چھ نیکیوں میں سے ایک کا ثمرہ ملتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان کی حفاظت نہیں کرتا تو اسی نسبت سے ان کی برائیوں کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی ہے"۔[۳] "بادشاہ حکومت کی آمدنی خدمت تحفظ کے صلے میں وصول کرتا ہے"۔[۴] "ایسا بادشاہ جو اپنی رعایا کی پوری طرح حفاظت نہیں کرتا زمرۂ سلاطین میں ایک چور کی حیثیت رکھتا ہے"۔[۵]

---

۱ - آئین ـ صفحہ ۲ بلاک مین حصہ اول باب ۲- نیز آئین صفحہ ۲۹۰- (اسی قسم کی دلیل کے لیے)۔

۲ - شانتی پرون ۵۷، صفحہ ۴۱ -

۳ - شانتی پرون ـ بحوالہ گھوشال صفحات ۹۰ اور ۱۸۰ -

۴ - کوتیلیا ـ بحوالہ گھوشال صفحہ ۱۳۷ -

۵ - منو ـ حصہ ہفتم صفحہ ۱۴۴ گھوشال صفحہ ۱۸۰ -

حاکم عادل کا فرض ہے وہ طاقتور اشخاص کو کمزوروں پر دست تظلم دراز کرنے سے روکے۔[1] شرانگیزی ، ایذا رسانی اور سرکشی و بغاوت کا دروازہ ایک سلطان ہی بند کر سکتا ہے۔ خدا کے حکم سے لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف بیٹھ جاتا ہے تاکہ وہ اس کے عدل کے زیر سایہ امن کے ساتھ زندگی بسر کریں اور دعا کریں کہ اس کا دور حکومت زندہ و پائندہ رہے۔[2] "عدل سلطانی کی روشنی میں بعض اشخاص بخوشی شاہراہ اطاعت اختیار کرتے ہیں۔ بعض شاہی سیاست سے مرعوب ہو کر (ظلم و ستم سے) کنارہ کش ہوتے ہیں اور ضرورت سے مجبور ہو کر صراط مستقیم پر چلتے ہیں۔"[3] شاہ جہاں کے نزدیک پادشاہی یہ تھی کہ خالق کی دولت و امانت یعنی رعایا کو آرام کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جائے۔ سلطان کی جواں مردی کمزوروں کی فلاح و بہبود اور اللہ کی پرستش کرنے والوں کی حمایت میں صرف ہونی چاہئے۔[4]

رعایا کی حفاظت اور قیام امن کے انتظامات مکمل ہو جانے کے بعد برکتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ قیام امن و امان کے بعد پیدا ہو جانے والے خوش آیند حالات جو ان مصنفین نے بیان کئے ہیں ان سے ضمنی طور پر یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ فرائض سلطانی اور

---

۱ - ذخیرۃ الملوک ۔ اوراق ۸۸ ، ۸۹ -

۲ - سیادت نامہ ۔ صفحہ ۵ -

۳ - آئین ۔ صفحہ ۲ بلاک مین - حصہ اول ۔ باب ۲ -

شاہی خاندان کے نزدیک رعایا کی حفاظت بمنزلہ عبادت کے ہے -

اکبر نامہ ۔ جلد دوم صفحہ ۱۳۲ -

۴ - لاہوری ۔ جلد اول صفحہ ۳۸۷ و صفحہ ۳۲ - (حصہ دوم) خط بیگم صاحب (محبوب دختر شاہ جہاں) بنام اورنگ زیب -

مملکت کی سرگرمیوں کے بارے میں ان کا تصور کیا تھا۔ ''لوگ اپنے مکانوں کے دروازے بند کیے بغیر ہی سوتے ہیں، عورتیں زیور پہن کر محافظ مردوں کے بغیر سڑکوں پر بے خوف و خطر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ لوگ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے بجائے ایک دوسرے سے نیکیاں کرتے ہیں۔ تینوں طبقے بڑی بڑی اور مختلف قسم کی قربانی کرتے ہیں۔ فن زراعت اور تجارت جن پر اس دنیا کا دارو مدار ہے، اچھی حالت میں ہیں''۔[1] اسی طرح ابوالفضل کی رائے ہے کہ ''خلوص، صحت، پرہیزگاری، انصاف، اطوار شائستہ، وفا شعاری، صداقت اور ترقئی اخلاص ایک سچے بادشاہ کی حکومت کی برکتیں ہیں''۔[2] وہ ہر وقت مملکت کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے اور اسے صحت مند رکھنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے اقتدار کو ظلم و ستم کے مٹانے، رعایا کی فطری صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور ان کی اہلیتوں سے کام لینے کا ذریعہ بناتا ہے۔ چنانچہ یکدلی و یکجہتی کے پرتو سے انسانوں کے مختلف غیر منظم گروہ یک جان و یک قالب ہو جاتے ہیں۔[3] حکومت و قوت اور شمشیر و تسخیر کا مقصد رعایا کی حفاظت و نگرانی ہے۔ یہ نہیں کہ ان کے ذریعے سیم و زر حاصل کرکے خزانے معمور کئے جائیں یا تاج و تخت کو آراستہ کیا جائے''۔[4] ''سلاطین عادل کے دل امن پرستوں کے لیے ایک قلعۂ آہنین اور جوشن آسانی کے مترادف ہوتے ہیں،[1] لیکن باغیوں اور شریروں کے لیے وہ

---

۱ - شانتی پروَن ۔ بحوالہ گھوشال صفحہ ۹۱ ۔

۲ - آئین ۔ صفحہ ۲ بلاک مین ۔ حصہ اول صفحہ ۳ ۔

۳ - آئین ۔ صفحہ ۴ بلاک مین ۔ حصہ اول صفحہ ۴ ۔

۴ - اکبر نامہ ۔ جلد سوم صفحہ ۴۹۷، بیورج ۔ صفحہ ۷۰۵ - سال سی و یکم مکتوب اکبر بنام والئ توران ۔

ایک تیغ جاں ستاں اور خنجر خونچکاں کا حکم رکھتے ہیں"۔[1]
شاہان عادل کی تمام آرزوؤں کا مرکز یہی ہوتا ہے کہ نوع انسانی اور اللہ کی کل دیگر مخلوق امن و اطمینان کے ماحول میں رہے، خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اور نیک زندگی بسر کرنے کی کوشش میں دل و جان سے لگی رہے"۔[2]

غرضکہ عوام کا وجود، ان کی مرفہ الحالی، معاشری ادارات، اور اصول اخلاق و مذہب سب منصب بادشاہی پر انحصار رکھتے ہیں۔ لہٰذا بادشاہ کی اہمیت پر جس قدر زور دیا جائے، بجا ہے۔ وہ اپنے دائرہ اثر میں (بلحاظ عظمت و اختیار) اعلیٰ ترین فرد بن جاتا ہے۔ اس کی ذات تمام اختیارات و اعزازات شاہی کا مظہر ہوتی ہے اور "بادشاہت کے ساتوں اجزائے ترکیبی اس کی واحد شخصیت میں مجتمع ہو جاتے ہیں"۔

عنصر تقدس | سیاسی مصنفین و فقہا نے شاہی منصب کو اہم ہی نہیں بتایا بلکہ ان حالات سے مجبور ہو کر جن میں وہ اپنی زندگی بسر کر رہے تھے، اس میں عنصر تقدس کو بھی قصداً شامل کر دیا، تاکہ شاہی اختیارات کو تقویت حاصل ہو۔ اس طرح بادشاہ کی اطاعت ایک مذہبی فریضہ بن گئی۔ منو کی رائے ہے کہ بادشاہ کا خمیر دنیا کے محافظ عناصر ہشت گانہ سے تیار کیا جاتا ہے، "اس لئے بلحاظ نورانیت وہ تمام مخلوق میں ممتاز ہوتا ہے"۔ وہ انسانی صورت میں ایک بہت بڑا دیوتا ہوتا ہے۔ بھیشم کے خیال میں

۱ - اکبر نامہ ۔ جلد سوم صفحہ ۳۶۶، بیورج - صفحہ ۷۰۳۔
۲ - اکبر نامہ ۔ جلد سوم صفحہ ۳۹۸، بیورج - صفحہ ۷۵۷۔

بادشاہ وشنو بھگوان کی روح اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ ” یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا ایک انسان کے سامنے یوں سر تسلیم خم کرتی ہے جیسے کسی دیوتا کے سامنے“۔[1] کوتیلیا کی رائے میں بادشاہ اندر دیوتا اوریم دیوتا کے ہمرتبہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تحقیر نہ کرنا چاہئے۔[2] ابوالفضل کے خیال میں ”پادشاہی خدا کا درخشاں نور اور آفتاب عالمتاب کی ضیاء ہے.... زمانہ حال کی اصطلاح میں اسے فر ایزدی کہتے ہیں اور زمانۂ قدیم میں اسے پر عظمت حلقہ نور کہتے تھے۔ یہ روشنی بلا واسطہ خدا کی طرف سے بادشاہوں کو عطا ہوتی ہے اور اس کو دیکھ کر انسان ان کے حضور میں سر اطاعت خم کر دیتا ہے“۔[3] داؤد باغی کی معافی کے سلسلے میں اکبر کہتا ہے۔ ” بہ حیثیت ظل اللہ مابدولت طلب و وصول کم، مگر داد و دھش زیادہ کرتے ہیں۔ عفو خطا کے بعد ہمارے دل میں انتقام کا جذبہ باقی نہیں رہتا“۔[4] شاہجہان اپنے فرمان میں جو عادل خاں کے نام ہے خود کو سایہ خدا کہتا ہے (ما کہ سایۂ خدائیم)۔[5]

ضروری اوصاف شاہی

پادشاہ کے اس قدر رفیع المرتبت ہونے کے پیش نظر اس کے اوصاف بھی ایسے ہونے چاہیں کہ وہ اپنے شاہی فرائض سے کماحقہ، سبکدوش ہو سکے۔

---

۱ - گھوشال صفحات ۱۸۱ تا ۱۸۳ -
۲ - گھوشال صفحہ ۱۳۴ -
۳ - آئین - صفحہ ۲ بلاک مین حصہ اول صفحہ ۳ -
۴ - اکبر نامہ - جلد سوم - سال نہدہم- صفحہ ۹۷ بیورج صفحہ ۱۳۶-
۵ - لاہوری - جلد اول صفحہ ۱۷۴ سال نہم -

کوتیلیا کا معیاری بادشاہ ''دندانتی''[۱] کے مطابق فرمانروائی کرکے عہد زرین کی تخلیق کرتا ہے - ابوالفضل کے قائم کردہ معیار کا اندازہ اس کے ان مختلف خیالات کے مطالعے سے ہوتا ہے، جن کا اظہار اس نے اپنی ضخیم تصنیف میں مختلف مواقع پر کیا ہے - وہ اس عقیدے کو صحیح نہیں سمجھتا کہ محض نسلی برتری کے باعث یا اس وجہ سے کہ آباواجداد بادشاہ تھے کسی شخص کو بادشاہت کا خاص حق حاصل ہو جاتا ہے - وہ اکبر کے خلاف مرزا حکیم کے عزائم و مساعی کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے، کیونکہ اس کی رائے میں ''نسلی امتیاز، دولت اور اپنے گرد ایک گروہ جمع کر لینا کسی شخص کو اس منصب جلیل کا مستحق نہیں بنا دیتا''-[۲] پادشاہی کو عطیۂ الٰہی قرار دیتے ہوئے وہ پادشاہ کے لئے بہت وسیع و عالم گیر اوصاف کا تعین کرتا ہے - اس کا قول ہے کہ ''نور پادشاہی کی بدولت بادشاہ میں بے شمار اوصاف حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں - مثلاً رعایا کے ساتھ شفقت پدری جس کے سایہ عاطفت میں ہزارہا انسان تسکین پاتے ہیں - دریا دلی جس میں شاہانہ ہمت اور خداداد عزم شامل ہیں - کسی مجرم کی بلند شخصیت بادشاہ کو مرعوب نہیں کر سکتی - نہ وہ حقیر و کم مایہ اشخاص کی ضروریات و خواہشات کی طرف سے غافل ہوتا ہے - روز افزوں توکل - بادشاہ خدا کو کارساز حقیقی جانتا اور اپنے آپ کو محض ایک ذریعہ یا

---

۱ - بینی پرشاد - صفحہ ۲۱ (نظریہ حکومت) اس کے لغوی معنی ''علم جبر و تشدد'' ہے - اس کا ترجمہ عام طورپر نظریہ سیاست کیا جاتا ہے - لیکن بہتر یہ ہے کہ فن حکمرانی کیا جائے -

۲ - اکبر نامہ - جلد سوم صفحہ ۳۸۵ - بیورج صفحہ ۴۲۱ -

وسیلہ سمجھتا ہے ۔ اس طرح اسباب کی پراگندگی اس کی جمعیت خاطر کو درہم برہم نہیں کر سکتی ۔ طاعت و عبادت ۔ اپنے منصوبوں کی کامیابی بادشاہ کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی ، نہ کسی قسم کی ناکامی پر وہ اس سے رو گرداں ہوتا ہے ۔[1]

جب ابوالفضل چشم دید تاریخی واقعات کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو تفصیل نگاری و قطعیت کا خیال زیادہ رکھتا ہے اور خطیبانہ مبالغہ آمیزی سے کم کام لیتا ہے ۔ مرزا حکیم کی کوششوں کے سلسلے میں جن کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے وہ کہتا ہے '' پادشاہی خدا کا ایک عطیہ ہے اور جب تک کسی شخص میں کئی ہزار صفات حسنہ جمع نہ ہو جائیں یہ نعمت عطا نہیں کی جاتی ''۔ ان ' صفات قدسی ' میں اولوالعزمی ، عالی ظرفی ' ہمہ گیر استعداد ' کمال تحمل ' قابل تعریف فہم ' جبلی رحم و کرم ' فطری جرأت ' انصاف پروری ' راست بازی ' جفا کشی ' نیک چلنی ' انتہائی غور و خوض کی اہلیت اور خطاؤں کو نظر انداز کر دینے کی قابل تعریف عادت بھی شامل ہے ۔[2] ایک دوسرے موقع پر ابوالفضل شاہی صفات کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور مذکورہ بالا صفات میں چند دیگر اوصاف کا اضافہ کرکے اپنے معیار کے مطابق شاہی اوصاف کی فہرست مکمل کرتا ہے ۔ باہمت ' عادل ' کشادہ دل ' عفو پرور ہونے کے علاوہ بادشاہ کے لئے لازم ہے کہ وہ مذہبی اختلافات سے بلند و برتر ہو ۔ مذہبی اختلافات

---

۱ - آئین ۔ صفحہ ۴ بلاک مین حصہ اول صفحہ ۳ ۔

۲ - اکبر نامہ ۔ جلد دوم صفحہ ۲۸۵ ۔ پادشاہوں کی نیک نیتی اور ان کے مناسب برتاؤ کی اہمیت - اکبر نامہ ۔ جلد سوم کے صفحہ ۳۹ پر بھی بیان کی گئی ہیں ۔

اسے ان فرائض کی انجام دھی سے باز نہ رکھیں جو مختلف جماعتوں کے متعلق اس پر عائد ہوتے ھیں۔ اس کی قلمرو میں سب آرام سے زندگی بسر کریں تاکہ خدا کا سایہ سب پر اپنی تجلیات نازل کر سکے۔ اس کے دل میں اپنی ساری رعایا کی محبت روز افزوں رھنا چاھیے۔ اس پر لازم ھے کہ پہلے خوب غور و خوض کرے پھر وہ قدم اٹھائے جو مناسب حال ھو۔ اسے تقلید سے نفرت کرنا چاھیے۔ اس کی نظر میں تحقیق پسندی ھمیشہ مقدم ھو اور دلیل پرستی اس کی رھنمائی کرتی رھے۔[1]

غرضکہ ابوالفضل کے معیاری پادشاہ کو مختلف مذاھب کا خیال تک نہ آنا چاھیے۔ اسے صرف تقاضائے وقت کے مطابق کام کرنا چاھیے۔ اسے خود تحقیق سے کام لینا چاھیے اور کسی کی تقلید نہ کرنی چاھیے۔ اس طرح اسے اسلامی قانون اور حدیث کو اپنی حکومت کے لئے بطور ضابطہ استعمال کرنے سے کوئی سروکار باقی نہیں رہ جاتا اور مذھب کی پابندی اس طرح ختم ھو جانے پر ابوالفضل زیادہ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کرتا ھے۔ ”ان اوصاف کے باوجود اگر وہ (پادشاہ) ھمہ گیر رواداری سے کام نہ لے تو ھرگز اس قابل نہیں کہ بادشاھت کے منصب عالی پر فائز رھے۔ اگر وہ لطف و کرم کے لیے تمام طبقہ ھائے انسانی اور جملہ فرقہ ھائے مذھبی کو ایک نظر سے نہیں دیکھتا، اگر وہ کسی کے لئے حقیقی ماں اور کسی کے حق میں سوتیلی ماں کا حکم رکھتا ھے تو ھرگز عزت و عظمت کا سزاوار نہیں“۔[2]

---

۱ - اکبر نامہ - جلد سوم صفحات ۳۵۲ - ۳۵۳ بیورج صفحہ ۶۸۰ -
۲ - اکبر نامہ - جلد دوم صفحہ ۲۸۵ - بیورج صفحہ ۴۲۱ -

بادشاہ کی اس حیثیت کو اکبر کے ایک خط میں جو شاہ فارس کو بھیجا گیا تھا، خاص طور پر واضح کیا گیا ہے۔ ''نوع انسانی خدا کی امانت اور اس کا خزانہ ہے لہذا تمام طبقات انسانی کو یکساں نظر محبت سے دیکھنا لازمی ہے۔ خدا کی رحمت کا تعلق ہر مسلک و مذہب سے ہے۔ لہذا انسان کو لازم ہے کہ وہ مسلک ''صلح کل'' کے گلشن بے خزاں میں داخل ہونے کی انتہائی کوشش کرے۔ خدائے لا یزال کا جود و کرم سب کے لئے عام ہے لہذا بادشاہوں کے لئے جو خدا کا سایہ ہوتے ہیں ضروری ہے کہ وہ اس اصول کو نظر انداز نہ کریں''۔[۱]

معیاری بادشاہ | اس طرح ابوالفضل کا معیاری بادشاہ یا 'حاکم عادل' ایک عقلمند، روشن خیال، انصاف پسند اور خدا ترس انسان ہوتا ہے، یعنی وہ تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے، تمام فرقوں اور مذہبوں کو عزیز رکھتا ہے، اپنی رعایا کا نگہبان اور کمزوروں کے حق میں ایک آہنی قلعہ اور روحانی زرہ ہوتا ہے۔ وہ ایسا حکمران ہوتا ہے جو اپنی رعایا کے ''مراتب کا لحاظ رکھتا ہے''،[۲] جو لوگوں کی قوت عمل کو بیدار کرتا، ہر اچھی بات کے لیے ان کی صلاحیتوں سے کام لیتا، ان کے مختلف گروہوں کو متحد کر کے انھیں یک جان و یک قالب بنا دیتا ہے اتحاد و اتفاق کو ''یک دلی و یک جہتی کے پرتو'' کے ذریعے سے حاصل کرتا اور ''صلح کل'' کو اپنا حصول زندگی بناتا ہے۔

---

۱ - اکبر نامہ - جلد سوم صفحہ ٦٥٩ -

۲ - ایسا حکمران جو اپنی رعایا کو اعلیٰ قدر مراتب انعام و اکرام دے اور اس طرح ان میں امتیاز و مراتب کو قائم رکھے -

وہ ''ظل اللہ'' ہوتا ہے اور خدا سے براہ راست ہدایت حاصل کرتا ہے۔ وہ صرف خدا سے ڈرتا اور اسی کی ذات پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ خدا سے مدد طلب کرتا ہے اور اس کی مدد اسے حاصل بھی ہوتی ہے۔ وہ ہر کامیابی کو خدا کی ذات سے منسوب کرتا ہے۔ اس کی نظر میں خدا کارساز حقیقی ہے اور بادشاہ صرف ایک ذریعہ یا وسیلہ ہوتا ہے۔ دنیا کے پردے پر وہ اپنے حلقۂ اثر میں اعلیٰ ترین فرد ہوتا ہے۔ بہ حیثیت حکمران وہ مطلق الاقتدار ہوتا ہے اور اس کے اختیار میں کوئی دوسرا شخص شریک نہیں ہوتا، کیونکہ ''عقلاء مرتاض اور ماہرین سیاست جو انسان فانی کی راحت و فراغت کا لحاظ رکھتے ہیں'' اس راحت و فراغت کو ''ایک حکومت، ایک حکمران، ایک رہنما، ایک مقصد اور ایک خیال سے وابستہ سمجھتے ہیں''۔[1]

جہانگیر بھی بادشاہت کو خدا کا عطیہ سمجھتا تھا۔ شہزادہ خسرو کی بغاوت اور اس کے طرفداروں کے متعلق وہ کہتا ہے، '' انہوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ بادشاہت اور جہانبانی ایسے امور نہیں ہیں جنھیں چند ناقص العقل اشخاص اپنی ناکارہ کوششوں کے ذریعے سے طے کریں۔ خالق عادل ہی یہ نعمتیں اس شخص کو عطا فرماتا ہے جسے وہ اس عظیم الشان اور عالی مرتبت منصب کا اہل سمجھتا ہے اور ایسے ہی شخص کو خلعت شرف عطا فرماتا ہے''۔[2]

---

۱ - اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۴ بیورج صفحہ ٦ -

۲ - تزک - صفحہ ۲۴ -

شاہ جہاں نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر شاہ صفوی کو جو خط لکھا ہے اس میں ایک عادل حکمران کے ضروری اوصاف کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔[۱] جہاں تک عملی نظم و نسق اور اس کے اصولوں کا تعلق ہے شاہ جہاں ابوالفضل کا تقریباً ہم خیال تھا۔

لیکن جہانگیر اور شاہجہاں دونوں کم از کم نظری طور پر اپنے آپ کو مسلمان بادشاہ تصور کرتے ہیں۔ وہ خود کو قانون اسلامی کی پیروی سے آزاد نہیں سمجھتے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے متعدد موقعوں پر کیا ہے۔[۲]

ابوالفضل نے جو معیار قائم کیا اسے اکبر کی پوری تائید حاصل تھی۔ اس کے طویل عہد حکومت میں اس معیار کو جانچنے کا پورا موقع مل گیا۔ وہ نہ صرف اپنے اصولوں کو پوری طرح رائج کرنے میں کامیاب ہؤا بلکہ اس نے انھیں دوسروں کے لئے بھی نمونہ بنا دیا۔ اس نے نظم و نسق کے ہر شعبے پر اپنی حکمت عملی کے ایسے گہرے نقوش چھوڑے جو اس کے بعد بھی مدت مدید تک قائم رہے۔ جہانگیر و شاہ جہاں اس کے نام اور اس کے کام کی عزت کرتے تھے۔ وہ ان کے لئے ایک قابل فخر نصب العین اور قابل تقلید نمونے کا حکم رکھتا تھا۔

---

۱ - لاھوری - جلد اول صفحات ۲۸۴ ، ۲۸۵ -

۲ - لاھوری - جلد اول صفحہ ۱۳۰ (حصہ دوم) شاہ جہاں کا فرمان قطب الملک کے نام جس میں اس نے قطب الملک سے بعض ایسی باتوں کو ترک کر دینے کا مطالبہ کیا ہے جو سنیوں کے عقائد کے خلاف تھیں۔ اس بات سے قطعی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ (سال نہم) -

اتفاق یعنی سبب مجہول کا عنصر

لیکن ایسی خود مختارانہ بادشاہی کے توسل سے ، جس کا کوئی واضح دستور حکومت نہ ہو اور جس میں حسب ضرورت مؤثر آئینی تحفظات بھی نہ ہوں ، مذکورۂ بالا اصولوں پر کامیاب عملدرآمد ور مذکورہ نصب العین تک رسائی بہرحال بادشاہ کے افتاد مزاج اور وقت کے سیاسی تقاضوں پر منحصر رہتی ہے -

مذکورۂ بالا بادشاہوں نے نظم و نسق کے باقاعدہ محکموں کی مدد سے اپنے نصب العین تک پہنچنے کی جو کوششیں کیں اور ان کوششوں میں انہیں جس حد تک کامیابی ہوئی ، صفحات آئندہ میں اسی پر روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے -

باب دوم

بادشاہ اور کار مملکت

خاکہ

تقسیم اوقات۔

جھروکۂ درشن اور اس کی اہمیت۔

دیوان خاص و عام۔ امور سلطنت جو وہاں انجام پاتے تھے۔

(۱) جانوروں کا معائنہ۔

(۲) کارخانوں کا کام۔

(۳) تقررات و شرف باریابی۔

(۴) جنگی قیدی، وغیرہ۔

ضابطۂ کار جس کی پابندی دیوان میں کی جاتی تھی۔

غسل خانہ (خلوت گاہ)

اس کی اہمیت۔ امور مملکت جو وہاں انجام دئے جاتے تھے۔

"شاہ برج" اور امور سلطنت کی انجام دہی۔

اجلاس جو تیسرے پہر یا شام کو منعقد ہوتے تھے۔

عدل و انصاف کے لئے مخصوص دن۔

روزمرہ کے نظام کار کی باقاعدہ پابندی۔

کار سلطنت پر توجہ۔

تقسیم اوقات | بادشاہ خلیفۃ اللہ ہوتا ہے اور اسے حکومت کرنے کا حق اللہ کی طرف سے ملتا ہے۔ بادشاہی خدا کی نعمت ہے اور بادشاہ خدا کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے۔ خلعت شاہی اسی کو زیبا ہوتی ہے۔ وہ اپنے حلقۂ اثر میں اعلیٰ ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ حکومت کا صدر، افواج مملکت کا سپہ سالار، سرچشمۂ عدل، مقنن اعلیٰ اور ملک میں آخری و قطعی فیصلے کا اختیار رکھتا ہے۔ نعمت خداوندی کے حامل کی حیثیت سے اس پر خدا کی عبادت اور اس کا شکریہ واجب ہوتا ہے اور بادشاہوں کے لئے بہترین عبادت یہی ہے کہ وہ اپنی رعایا سے متعلقہ فرائض بحسن و خوبی انجام دیتے رہیں۔[1]

ابتدا ہی سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ شمالی ہند کا ہر قابل و بیدار مغز حکمران امور مملکت اور انتظام سلطنت کی جزئیات پر پوری توجہ کے ساتھ غور کرتا تھا۔ میگا ستھینز شہادت دیتا ہے کہ بادشاہ کا تمام وقت اپنی رعایا کے لئے وقف ہوتا تھا۔ اس کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔[2] مسلمانوں کے عہد حکومت میں، علاؤالدین تمام اختیارات حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے علاوہ، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی خود توجہ کرتا اور اپنا تمام وقت امور سلطنت کی انجام دہی میں صرف کرتا تھا۔ معمولی سے معمولی چیز کا نرخ وہ خود مقرر کرتا تھا۔ وہ بازار کے نرخوں پر اپنے ملازموں اور خانہ‌زادوں کے ذریعے سے نگرانی رکھتا تھا۔[3] ابن بطوطہ نے بالتفصیل بیان کیا ہے کہ

۱۔ اکبر نامہ جلد دوم۔ صفحہ ۲۰۷۔

۲۔ بحوالۂ بینی پرشاد۔ صفحہ ۱۸۱۔ اسٹرابو کہتا ہے کہ بادشاہ دن میں کبھی نہیں سوتا تھا اور تمام دن سماعت مقدمات میں مصروف رہتا تھا۔

۳۔ برنی صفحہ ۳۱۸۔

محمد تغلق کے دربار میں کس طرح کام ہوتا تھا۔[1] سکندر لودھی انتظام سلطنت پر خود نگرانی رکھتا تھا اور اس کے متعلق تمام معاملات سے باخبر رہتا تھا۔[2] شیر شاہ آپ اپنا وزیر تھا یعنی وزیر کے فرائض خود انجام دیتا تھا۔ لیکن اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ یہ لوگ اپنے روزمرہ کے کام میں کسی خاص نظام عمل کی پابندی بھی کرتے تھے یا نہیں۔

انضباط امور سلطنت کے ساتھ ساتھ اکبر نے اپنے اوقات کار کے انضباط کی بھی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ اس نے اپنے روزمرہ کے کاموں سے متعلق ایک نظام عمل مقرر کر لیا اور اس کی ایسی پابندی کی کہ وہ اس کے خاندان کے لئے ایک نمونہ بن گیا اور اس کے جانشینوں نے بھی اسی کی پیروی کی۔ ابوالفضل نے اسے آئین میں درج کیا ھے۔ نیز اکبر نامہ میں بھی متعدد مواقع پر اس کا ذکر آیا ھے۔ لیکن دونوں میں کافی اختلاف ھے۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اسے اکبر کے عہد حکومت ھی میں کم از کم دو مرتبہ تبدیل کیا گیا تھا۔[3] تاھم یہ بات قطعی ھے کہ اکبر امور سلطنت کی انجام دھی کے لئے تین مرتبہ خلوت سرا سے برآمد ھوتا تھا۔

پہلی مرتبہ بعد طلوع آفتاب درشن کے لئے۔ جس کے بعد ھی دربار عام منعقد ھوتا تھا اور لوگ براہ راست حضور شاھی میں باریاب ھوتے تھے۔

---

۱ - ابن بطوطہ صفحہ ۱۹۷-

۲ - تاریخ مبارک شاھی - م - ورق ٥ -
تاریخ داؤد - م - ورق ۲۲ -

۳ - اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۲٥٦ - سال بست و سوم اور صفحہ ۱۷ - سال سی و یکم

دوسری مرتبہ دوپہر کے بعد جب وہ ان جانوروں کا معائنہ کرتا تھا جن کا انتظام مرکزی حکومت کے سپرد تھا۔ اس کے بعد وہ کارخانہ جات کا کام اور اسی طرح کے دیگر امور کا ملاحظہ کرتا تھا۔ کام زیادہ ہونے کی صورت میں وہ غروب آفتاب کے بعد تک دربار کرتا تھا۔

دن کا درمیانی وقت محکمۂ حرم شاہی کے امور پر حرم کے اندر صرف ہوتا تھا۔ یہاں بیگمات اور دیگر معروضہ گزار خواتین حرم کے معاملات پر توجہ کی جاتی تھی۔[1]

رات کا وقت نجی مجالس (غیر سرکاری) کے لئے وقف تھا۔ جن میں ''علماء وفضلا اور جوئندگان حق'' جمع ہوتے اور مختلف موضوعات پر بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ بعض دفعہ امور مملکت بھی رات کے وقت انجام دیے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں صرف متعلقہ عہدہ داران سلطنت اور چند دیگر خدمت گاروں ہی کو حضوری کی اجازت ہوتی تھی۔[2]

اکبر عموماً رات گئے تک بیدار رہتا اور پھر گانا سننے کے بعد خوابگاہ میں جاتا تھا۔ جہانگیر نے اپنے روزمرہ کا کوئی نظام عمل اپنی تزک میں درج نہیں کیا لیکن چونکہ وہ اکبر اور اس کے مقررہ کردہ اصولوں کی پیروی کمال اشتیاق سے کرتا تھا، اس نے اکبر کے روزانہ نظام کار کی پیروی بھی یقیناً کی ہوگی۔ اس خیال کے علاوہ اس عہد کے متعدد واقعات اور ان مغربی سیاحوں کے بیان کردہ حالات جو جہانگیر

۱ - اکبر ۲۴ گھنٹے میں صرف دوپہر یعنی ٦ گھنٹے زنانخانے میں صرف کرتا تھا۔

۲ - آئین صفحہ ۱۰۰-

کے عہد میں ہندوستان آئے، شہادت دیتے ہیں کہ وہ اکبر ہی کے دن بھر کے معمول کی پیروی کرتا تھا۔

شاہ جہاں امور مملکت کے ہر پہلو پر کافی توجہ صرف کرتا تھا۔ جہانگیر کے زمانۂ حکومت کے آخری ایام میں انتظام سلطنت کی خرابی اور شاہ جہاں کے مخالف عناصر کی موجودگی نے ضرور اسے غیر معمولی طور پر ہوشیار رہنے پر مجبور کیا ہوگا۔ اس کے عہد حکومت کے واقعہ نگاروں نے اس کے روز مرہ کے معمول کار کو ابوالفضل کی بہ نسبت زیادہ صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حالانکہ وہ اکبر کے طریقے کے مطابق ہمیشہ دن میں تین مرتبہ دربار منعقد کرتا تھا لیکن اس نے نظام کار میں ٹھوس تبدیلیاں کر دی تھیں اور اپنے پیش رو حکمرانوں سے زیادہ وقت دربار میں صرف کرتا تھا۔

لوول کہتا ہے کہ کسی ملک کی حکومت کو سمجھنے کے لئے صرف اس کے اداروں کی ہیئت ظاہری معلوم کر لینا کافی نہیں ہے، بلکہ یہ جاننا ضروری ہے کہ پورے نظام پر کس طرح عملدرآمد ہوتا ہے اور ''حالانکہ یہ بات خاص طور پر لوگوں کے کردار اور ان کی عادات اور سابقہ روایات پر منحصر ہے لیکن اس پر تفصیلات . . . . کا بھی کم اثر نہیں پڑتا، جنھیں معمولی سمجھ کر عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے''۔[1]

ہمارے پاس جو مواد موجود ہے، اگرچہ ہم اس کی مدد سے مغلوں کے نظم و نسق کے ہر شعبے کا اس تفصیل کے ساتھ جائزہ

---

۱ - *Continental Governments and Parties*, p. 1

لینے کے قابل نہیں ہیں جس کے لیے لوول کی کتاب مشہور ہے، تاہم مختلف موضوعات کے متعلق بکھرے ہوئے واقعات کو ایک سلسلے میں پرو کر ہم اس کے متعلق کوئی نہ کوئی تصور ضرور قائم کر سکتے ہیں۔

جھروکۂ درشن | اس رسم کو اکبر نے ایجاد کیا اور اسے اپنے زمانے میں اچھی طرح رائج کر دیا۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ اس رسم کا مقصد یہ تھا کہ ہر خاص و عام کو بادشاہ سلامت کے سامنے حاضر ہونے اور ان کے حضور میں کسی کی ممانعت یا مزاحمت کے بغیر باریاب ہونے کا موقع مل جائے۔[۱] اکبر کے جانشینوں کے زمانے میں بھی اس رسم کی پابندی پوری طرح کی جاتی تھی اور عقیدتمندان مخلص روزانہ علی‌الصبح ''جھروکے'' کے نیچے جمع ہو جاتے تھے، جن میں سپاہی، تاجر، سوداگر، اہل حرفہ اور دیہاتی سبھی ہوتے تھے اور بادشاہ کے ''درشن'' کا شرف حاصل کرتے تھے۔

بدایونی کی رائے ہے کہ ہندوؤں بالخصوص برھمنوں کے اثر کی وجہ سے اکبر نے یہ طریقہ رائج کیا تھا کیونکہ عام ہندوؤں کی نظر میں وہ قدیم ہندو حکمرانوں کے نمونے کا حکمران تھا اور برھمن اسے رام اور سری کرشن کا اوتار مانتے تھے۔ ''ادنیٰ طبقے کے لوگ جو دولت خانے میں باریاب نہ ہو سکتے تھے علی الصبح جھروکے کے نیچے جمع ہو جاتے تھے اور جب تک بادشاہ کے ''رخ اقدس'' کا دیدار نہ کر لیتے تھے کھانے پینے کو

---

۱ - آئین صفحہ ۱۰۰- لاھوری بھی یہی کہتا ہے- جلد اول صفحہ ۱۴۰ -

ممنوع سمجھتے تھے۔[۱]

اکبر جھروکے میں برآمد ہوتا تھا اور ''درشن'' دینے کے بعد دربار عام منعقد کرتا تھا جس میں ہندو۔ مسلمان۔ اعلیٰ و ادنیٰ، مرد اور عورت سب کو معروضات پیش کرنے اور اپنے معاملات اصالتاً بیان کرنے کی اجازت تھی اور بادشاہ وہیں اپنا فیصلہ سنا دیتا تھا۔ ''لوگ کثیر تعداد میں وہاں جمع ہوتے تھے جس کی وجہ سے شور و غل بھی بہت ہوتا تھا''۔[۲] اکبر اس دربار میں روزانہ ڈیڑھ پہر (تقریباً ساڑھے چار گھنٹے) صرف کرتا تھا۔[۳]

جہانگیر نے بھی یہ رسم جاری رکھی۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر کہتا ہے کہ علالت کے باوجود میں نے ناغہ نہیں کیا۔[۴]

ڈیلائٹ کہتا ہے کہ جہانگیر روزانہ بعد طلوع آفتاب جھروکے کے سامنے آتا تھا۔ ''بادشاہ ہر روز اس کے سامنے آفتاب نکلنے کے بعد آتا ہے اور خود آفتاب کے درشن کرتا ہے۔ امراء بادشاہ کے درشن کے لئے یہاں جمع ہوتے ہیں۔ وہ کسی اونچی جگہ پر اور عام لوگ صحن میں کھڑے ہوتے ہیں اور ''بادشاہ سلامت'' (جہاں پناہ زندہ باد) کے نعروں سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں ... اس موقع پر بھی جو شخص تحریری درخواست لاتا ہے بادشاہ اس کا حال نہایت توجہ سے سنتا ہے''۔[۵]

---

۱ - بدایونی - جلددوم - ۲۳۶ -

۲ - بدایونی - جلددوم صفحات ۳۲۵-۳۲۶- اکبر نامہ- جلد سوم صفحہ ۲۵۷-

۳ - اکبر نامہ جلد سوم - صفحہ ۲۵۶ -

۴ - تزک - صفحہ ۲۳۲ سال سیزدہم -

۵ - ڈیلائٹ - جلد اول - صفحات ۹۲ - ۹۳ اور ۹۷ - عبادت صبح گاہی بعد ازاں درشن - ہاکنز صفحہ ۱۱۵ -

لاھوری کا بیان ھے کہ ''درشن کی رسم ، حضرت عرش آشیانی نے ایجاد کی تھی اور اس کی پیروی اعلیٰ حصرت بھی کر رھے ھیں تاکہ لوگ اپنا روزمرہ کا کام شروع کرنے سے پہلے ان کے دیدار سے فیض یاب ھو سکیں اور حاجتمند و مظلوم کسی قسم کی مزاحمت اور رسمی لوازم کی پابندی کے بغیر ھی داد رسی اور انصاف حاصل کر سکیں''۔[1] شاہ جہاں بالعموم درشن کے بعد تقریباً دو گھڑی (قریب قریب اڑتالیس منٹ) یا اس سے کم و بیش حسب ضرورت جھروکے ھی میں ٹھہرتا تھا۔ لوگ عرضداشتیں پیش کرتے اور اپنے معاملات اصالۃً حضور شاھی میں عرض کرتے تھے۔ محکمہ عدل کے اھل کار ان کا حال قلم بند کر لیتے اور بعد میں جب بادشاہ ''دولت خانۂ خاص و عام'' یا ''خلوت خانے'' میں رونق افروز ھوتا تو اس کی خدمت میں پیش کرتے۔ اس سے ثابت ھوتا ھے کہ اکبر کی طرح شاہ جہاں موقع پر مقدمات فیصل نہیں کرتا تھا اور طریقہ کار کی یہ تبدیلی ھی اس امر کا موجب ھوئی کہ شاہ جہاں نے جھروکے میں اپنے قیام کے وقت میں تبدیلی کی۔

جھروکے میں بعض دیگر امور بھی انجام پاتے تھے۔ اکبر کے عہد میں مانسریٹ نے وھیں سے ھاتھیوں کی لڑائی دیکھی تھی۔[2] ڈیلائٹ کے بیان کے مطابق جہانگیر کے وقت میں بھی ھاتھیوں کی لڑائی جھروکے ھی سے دیکھی جاتی تھی۔[3] متعدد مواقع پر اس نے

---

۱ - لاھوری جلد اول صفحات ۱۴۳-۱۴۴ صالح جلد اول صفحات ۲۴۲-۲۴۳

۲ - آئین - صفحہ ۱۵۵ - سطر ۲۰ - مانسریٹ صفحہ ۶۱ -

۳ - ڈیلائٹ - (صفحہ ۹۷) کا بیان ھے کہ بادشاہ ان لڑائیوں کو دوپہر کے بعد دیکھتا تھا، جبکہ اتوار کے سوا روزانہ ھاتھیوں، ببر شیروں، بھینسوں اور

منصب داروں کے سپاہیوں کا معائنہ جھروکے ہی سے کیا تھا۔ اعتمادالدولہ کی فوج اس کے سامنے جھروکۂ درشن کے میدان ہی سے گزری تھی۔[1] لشکر خاں نے اپنے سپاہیوں کا معائنہ جھروکے ہی سے کرایا تھا۔[2] خان دوراں کے آدمیوں کا معائنہ بھی وہیں سے کیا گیا تھا۔[3]

شاہ جہاں کے عہد میں یہ رسم بھی جاری رہی، البتہ پنجشنبہ کو جو اس کی تاجپوشی کا دن تھا ہاتھی نہیں لڑائے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں اس کے زمانے کا سب سے مشہور واقعہ وہ ہے جب اورنگ زیب پر ایک غضبناک ہاتھی نے تماشا گاہ میں حملہ کر دیا تھا اور اس نے بے مثال ہمت اور حاضردماغی کا ثبوت دے کر اپنے باپ سے بہادر کا خطاب پایا تھا۔[4] غضبناک ہاتھیوں اور ایسے گھوڑوں کا معائنہ بھی جھروکے ہی سے کرایا جاتا تھا جو ''دولت خانے،، میں نہیں لائے جا سکتے تھے۔ منصب داروں کے سپاہی بھی بادشاہ کے ملاحظے کے لئے جھروکے کے میدان ہی سے گزرتے تھے۔[5]

دیوان خاص و عام | صبح ساڑھے چار گھنٹے کام کرنے کے بعد اکبر آرام کرتا تھا۔ پھر دوپہر کے بعد باہر آ کر پورا دربار منعقد کرتا تھا۔ یہ دربار ''دیوان خاص و عام'' میں منعقد ہوتا

دیگر جنگلی جانوروں کی لڑائیاں دکھلائی جاتی تھیں۔ ہاکنز کی کتاب کے صفحات ۱۰۶ تا ۱۰۸ دیکھئے جہاں اس نے پالتو ہاتھیوں اور ہاتھی کی لڑائیوں کا ذکر کیا ہے۔

۱- تزک۔ صفحہ ۱۸۵۔ سال دوازدہم۔
۲- تزک صفحہ ۱۸۶۔
۳- تزک صفحہ ۲۵۷۔ سال سیزدہم۔
۴- لاہوری۔ جلد اول صفحہ ۴۸۹ سال ششم۔ اس ہاتھی کا نام سدھکر تھا۔ اورنگ زیب کی عمر پندرہ سال تھی۔ ہاکنز بھی بعض لوگوں کا ذکر کرتا ہے، جو اس سے مجروح ہوئے تھے۔ صفحہ ۱۰۸۔
۵- لاہوری۔ جلد اول صفحہ ۱۴۴۔

تھا - وھاں روزمرہ کے فرائض سلطنت انجام دئے جاتے تھے اور ''چونکہ بے زبان مجبور جانوروں کی حالت پر توجہ کرنا حکمرانوں کا فریضہ ھے'' وہ بھی اپنا کچھ وقت ان جانوروں کے معائنے کے سلسلے میں صرف کرتا تھا، جن کی نگہداشت مرکزی حکومت کے ذمے ہوتی تھی -[۱] ان واقعات سے جو اکبر نامہ میں مختلف مقامات پر درج ھیں یہ پتا چلتا ھے کہ اکبر اس دربار میں صرف معاملات کارخانہ جات اور روزمرہ انجام پانے والے بعض دیگر امور مملکت کی جانب توجہ کرتا تھا - لہٰذا وہ یہاں صرف چار گھڑی (یعنی ایک گھنٹہ چھتیس منٹ) بیٹھتا تھا - اس بات کا بھی پتا چلتا ھے کہ بعض اوقات دربار کا وقت بدل دیا جاتا تھا اور کبھی بادشاہ دوپہر کے بعد اور بعض اوقات غروب آفتاب کے بعد دربار میں آتا تھا - لیکن ایسے تمام مواقع پر ایک بڑا طبل بجایا جاتا تھا جس کے ذریعے سے تمام لوگوں کو وقت کی تبدیلی کی اطلاع ھو جاتی تھی -[۲] جہانگیر نے دوپہر کے بعد دربار منعقد کرنے کا طریقہ جاری رکھا لیکن وہ زیادہ دیر تک دربار کرتا تھا اور جو امور وہ یہاں انجام دیتا تھا وہ اکبر کے مقابلے میں زیادہ متنوع ھوتے تھے اور ڈیلائٹ کے بیان کے مطابق اس موقع پر بھی عام لوگ صبح کے دربار ھی کی طرح بلا مزاحمت بادشاہ کے حضور میں باریاب ھو سکتے تھے -[۳] شاہ جہان

---

۱ - آئین صفحہ ۱۰۰ - اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۲۵۷ -

۲ - اکبر نامہ - جلد سوم صفحہ ۲۵۷ - بدایونی کے بیان کے مطابق بھی پورا دربار رات کے وقت منعقد ھوتا تھا اور اس سے یہ پتا چلتا ھے کہ اکبر اس وقت بھی ان عام آدمیوں کو جو اس کی خدمت میں حاضر ھونا چاھتے تھے حاضری کی اجازت دے دیتا تھا (جلد دوم صفحہ ۱۰۷) -

۳ - ڈیلائٹ - صفحات ۹۳' ۹۴ ''بادشاہ روزانہ تین مرتبہ لوگوں کے سامنے آتا ھے اور ھر موقع پر ھر اس شخص کا حال نہایت توجہ سے سنتا ھے جو تحریری عرضداشت پیش کرتا ھے'' -

نے اس دستورالعمل میں بعض تبدیلیاں کیں۔ وہ جھروکۂ درشن سے آکر آرام نہیں کرتا تھا بلکہ دیوان خاص و عام[1] کے جھروکے میں داخل ہوتا تھا اور وہاں پورا دربار منعقد کرتا تھا۔ کام کی قریب قریب وہی نوعیت تھی جو جہانگیر کے زمانے میں تھی اور وہ بالعموم چار گھڑی وہاں بیٹھتا تھا، لیکن کام زیادہ ہونے کی صورت میں پانچ گھڑی وقت بھی صرف ہو جاتا تھا (یعنی ایک گھنٹہ چھتیس منٹ سے دو گھنٹہ تک)

کام - جانور جانوروں کے معائنے کی ابتدا اکبر نے کی۔ روزانہ اسکے سامنے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، گائیں اور خچر مقررہ تعداد میں اور معینہ ترتیب کے ساتھ پیش کئے جاتے تھے۔ پھر حکومت کے اکتالیسویں سال میں جانوروں کے ہر قسم کے معائنے کا علحدہ علحدہ دن مقرر کر دیاگیا۔ ایک موقع پر جب اکبر ہاتھیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے سامنے سے جو ہاتھی گذرتا وہ اسے کوئی نہ کوئی چیز کھانے کو دے دیتا۔ ایک ہاتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے ابوالفضل سے کہا "یہ ہاتھی تمہارے سپرد کیا جاتا ہے"۔ ہاتھی کو یہ تجویز پسند نہ آئی اور اس نے دفعتةً چارے سے منہ موڑ لیا۔[2] جہانگیر کچھ ہاتھیوں کے معائنے کا ذکر کرتے ہوئے، جو سدھانے کے لئے پکڑے گئے تھے، لکھتا ہے "وہ اکبری اور جہانگیری ہاتھیوں سے بلند قامت تھے"۔[3]

ایک ہی اجلاس میں نئے خریدے ہوئے جانوروں کی قیمتیں مقرر

---

۱ - اسے دولت خانہ خاص و عام بھی کہتے تھے۔
۲ - اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۷۰۵ -
۳ - تزک - صفحہ ۲۳۴ - سال یازدہم -

کردی جاتی تھیں، پرانے جانوروں کی حالت کا معائینہ کرلیا جاتا تھا اور ان کے نگرانوں کو جرمانے کی سزا ہوتی تھی' یا انعام دیا جاتا تھا۔[۱] یہ طریقہ اکبر کے دونوں جانشینوں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ متعدد مواقع پر یہ مذکور ہے کہ شاہ جہان کے عہد حکومت میں گھوڑے خریدے گئے۔ اس کو گھوڑوں سے خاص دلچسپی تھی۔[۲] جو جانور پیش کش کے طور پر موصول ہوتے تھے یا جو بادشاہ کی جانب سے شہزادوں، عہدہ داران حکومت اور دیگر اشخاص کو عطا ہوتے تھے ان کو بھی یہاں بغرض ملاحظہ پیش کیا جاتا تھا۔

کارخانہ جات

مرکزی حکومت کے کارخانوں اور مال خانوں میں جو کام، اسلحہ، زیورات، پارچہ جات، زر دوزی و کار چوبی، نقاشی، خطاطی، تصاویر، تراجم اور اصل ادبی تصانیف سے متعلق ہوتا تھا بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ شاہ جہان ان چیزوں کا معائنہ اس دربار میں کرتا تھا جو بوقت صبح دیوان خاص میں منعقد ہوتا تھا۔[۳]

نئے تقررات اور ممتاز اشخاص اور عہدہ داران حکومت کی باریابی

اسی دربار میں نئے تقررات کئے جاتے تھے۔ عہدہ داران حکومت کو ترقیاں دیجاتی تھیں اور مستحقین کو جاگیریں عطا ہوتی تھیں۔ ابوالفضل نے دربار میں اپنی پہلی حاضری کو اپنے مخصوص طرز میں شرح و بسط کے ساتھ

---

۱ - آئین - صفحات ۱۶۱ تا ۱۶۳ -

۲ - ''اسکے گھوڑے اور ھاتھی اسکے سامنے یہاں پیش کئے جاتے ھیں اور اسکے بعض ملازمین اس امر کی جانچ کرتے ھیں کہ ان کی صحت اچھی ھے یا نہیں''۔ ڈیلائٹ بابت جہانگیر - صفحہ ۹۹ - بحوالہ ھاکنز صفحہ ۱۰۷-

۳- لاھوری - جلد اول - صفحہ ۱۳۹ - برھمن - صفحات ۲۶ تا ۲۹-

بیان کیا ہے۔[1] بدایونی بھی لکھتا ہے کہ اس کا پہلا تقرر اسی دربار میں ہوا تھا، نیز یہ کہ وہ اس دربار میں کئی مرتبہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہوچکا ہے۔[2] صوبہ جات کے حاکم اور دیگر عہدہ‌داران حکومت جب فوجی خدمات کی انجام دہی کے سلسلے میں کہیں جاتے یا اپنے صدرمقامات کو روانہ ہوتے تو روانگی کے دن بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح دارالحکومت میں واپس آنے والے اشخاص بھی اصالۃً حاضر دربار ہو کر اپنی واپسی سے بادشاہ کو مطلع کرتے تھے۔ اکبر نے ایک مرتبہ نظام الدین احمد مصنف طبقات اور اسکے ان شتر سوار ساتھیوں کو دربار میں طلب کیا تھا، جو گجرات سے چھ سو کوس کا سفر بارہ دن میں طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ وہ جس حال میں وہاں پہنچے ہیں، اسی میں فوراً حاضر دربار کئے جائیں۔ "یہ ایک پر لطف منظر تھا جسے دیکھ کر تمام حاضرین دربار بے حد محظوظ ہوئے تھے"۔[3] شہزادہ خرم نے دکن کی مہم پر روانہ ہونے کے وقت اپنے چیدہ چیدہ سپاہیوں کو کل اسلحہ سے لیس کر کے "دیوان خاص و عام" کے صحن میں بعد دوپہر پیش کیا تھا اور وہیں اسے دوسرے انعامات کے علاوہ "شاہ جہاں" کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔[4] اس مہم سے کامیاب واپس آنے پر اس کی طلبی دیوان کے جھروکے میں ہوئی۔ جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے اٹھ کر اس سے معانقہ کیا اور اسے وہاں بیٹھ جانے کی اجازت دے دی۔ بعد ازاں بخشیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان عہدہ داروں

۱- اکبر نامہ - جلد سوم - صفحات ۸۴ - ۸۵ -

۲- بدایونی - جلد دوم - صفحات ۳۶۶ - ۳۷۴ - ۳۷۵ - ۳۸۴ -

۳- بدایونی- جلد دوم- صفحہ ۳۷۲- سال حکومت سی‌پنجم بمقام لاہور-

۴- تزک - صفحہ ۱۶۷ - سال یاز دھم -

کو جنہوں نے شہزادے کے ماتحت نمایاں خدمات انجام دی ہیں، بہ لحاظ مراتب حضوری میں پیش کریں - دو دن بعد جب شاہ جہان نے اپنی پیش کش، جس میں چیدہ چیدہ ہاتھی اور گھوڑے تھے صحن میں قطار در قطار آراستہ کر کے حضور شاہی میں گزرانی تو شہزادے کے پاس خاطر سے شہنشاہ نے جھروکے سے نیچے صحن میں اتر کر ایک ایک چیز کو ملاحظہ فرمایا -[1]

جھروکے پر کسی شہزادے یا عہدہ دار حکومت کی باریابی اعلیٰ ترین امتیازی اعزاز تھا جو شہنشاہ کی جانب سے بر سر دربار بخشا جا سکتا تھا- شاہجہان کو یہ امتیازی اعزاز اپنی غیر معمولی خدمات اور نمایاں کامیابی کے صلے میں عطا ہوا تھا - شاہجہان نے پھر یہی اعلیٰ ترین اعزاز آصف خاں کو عطا فرمایا جسکی بدولت وہ سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا - یہ وہ موقع تھا جب آصف خاں شہنشاہ کی تخت نشینی کے بعد لاہور سے واپس آ کر پہلی مرتبہ اظہار اطاعت و عقیدت کے لئے بمقام آگرہ حاضر دربار ہوا تھا -[2]

ممتاز اشخاص، سفراء اور شاہان ممالک غیر پہلے دربار عام میں باریاب ہوتے تھے - بعد ازاں اگر مناسب سمجھا جاتا تو انہیں دیوان خاص میں حاضر ہونے اور تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع دیا جاتا تھا- مانسریٹ نے اکبر کے حضور میں اپنی پہلی حاضری اور بعد ازاں دیگر مواقع پر شرف باریابی حاصل کرنے کا حال لکھا ہے -[3] چندر بھان نے

۱- تزک - صفحہ ۱۹۶ - سال دواز دہم -
۲- لاہوری - جلد اول - صفحہ ۱۷۸ ہاکنز- صفحہ ۱۱۰- لکھتا ہے کہ تین بجے سے پانچ بجے تک دربار منعقد ہوا تھا - فنچ - صفحات ۱۸۴ و ۱۸۵-
۳- مانسریٹ - صفحات ۲۸ - ۳۷ - ۵۰ - ۶۴ - ۱۳۳ اور ۱۳۴ -

شاہ جہاں کے دربار میں نذر محمد خاں والیٔ بلخ کے بیٹے خسرو کی باریابی کا حال بڑی جزوی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔[1]

اسیران جنگ وغیرہ | بعض اوقات اسیران جنگ، شکست خوردہ حریف اور گرفتار کردہ باغی بھی اس دربار میں پیش کئے جاتے تھے۔ عامل پنجاب کے بھیجے ہوئے قیدیوں کی ایک جماعت اکبر کے سامنے اس حالت میں پیش کی گئی کہ یہ لوگ بیلوں کی ایسی کھالوں میں لپٹے ہوئے تھے جن پر کان ابھی باقی تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر حاضرین دربار ہنسی ضبط نہ کر سکے۔[2] جگت سنگھ شکست کھانے اور اطاعت قبول کرلینے کے بعد، اس حالت میں کہ روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی، جسے وہ بطور نذر پیش کرنے لایا تھا، اس کے گلے میں لٹک رہی تھی، شاہ جہاں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔[3] شاہ جہاں کی تخت نشینی کے سترھویں سال میں راجا پرتاپ سنگھ زمیندار پلایوں (بہار) بھی حاکم صوبہ کی اطاعت قبول کر لینے کے بعد حاضر دربار کیا گیا تھا۔[4]

ضابطۂ کار | اس امر کے باوجود کہ آئین اکبری کی تکمیل کے وقت تک نظام حکومت مکمل ہو چکا تھا، ابوالفضل نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ دربار میں امور سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں کسی ضابطۂ کار کی پابندی کی جاتی تھی۔ اس نے صرف دربار میں نشستوں کی ترتیب کا ذکر کیا ہے اور برسبیل تذکرہ

۱- برھمن - صفحات ۱۲۷ تا ۱۳۱ -
۲- اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۴۰ - سال ہجدھم -
۳- لاھوری - جلد اول صفحہ ۲۵۶ - سال پنجم -
۴- صالح جلد دوم - مسودہ، اوراق ۱۴۰ و ۱۴۱



دربار شاہ جہاں کا ایک منظر

اس میں دکھایا گیا ھے کہ صوبہ بہار کے ایک باغی زمیندار پڑتاب کو حاکم صوبہ
اعتقاد خاں گرفتار کرکے حاضر دربار کر رھا ھے ۔(مسودہ برٹش میوزیم۔ تتمہ ۲۶۲۲۱)

ان معاملات کا حوالہ دے دیا ہے جو متعلقہ عہدہ دار، مقربان بارگاہ یا وہ اشخاص جو بادشاہ سے بالمشافہ عرض معروض کر سکتے تھے، اکبر کے حضور میں پیش کرتے تھے۔ اسی طرح یہ پتا نہیں چلتا کہ جہانگیر کے دربار کا ضابطۂ کار کیا تھا۔ پلسائرٹ کی تحریروں سے بھی اس امر کی بابت قطعی طور پر کچھ نہیں معلوم ہوتا حالانکہ وہ آگرے ہی میں مقیم تھا اور اسے ان تمام امور کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے مواقع بھی حاصل تھے۔ ڈیلائٹ بھی محض اتنا بتاتا ہے کہ "بادشاہ روزانہ سہ پہر کو ۳ اور ۴ بجے کے درمیان یہاں آتا ہے...... وہ یہاں شام تک ٹھہرتا اور مقدمات کی سماعت کرتا ہے اوریہیں اسے وزیر مختلف صوبوں سے آئے ہوئے سرکاری مراسلات پڑھکر سناتا ہے"۔[۱] لیکن شاہ جہاں کے وقایع نگاروں نے اس ضابطۂ کار کو بالتفصیل بیان کیا ہے جس کی پابندی شاہی درباروں اور اجلاسوں میں امور سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں کی جاتی تھی۔ شاہ جہاں کے یہ تفصیلی انتظامات ضرور اسی ضابطۂ کار کی ترقی یافتہ صورت ہوں گے جس پر اس کے دونوں پیش رو حکمرانوں کے زمانے میں عمل ہوتا رہا ہو گا۔

شاہ جہان دیوان کے جھروکے میں

شاہ جہاں 'جھروکۂ درشن' سے نکل کر فوراً دیوان کے جھروکے میں آجاتا تھا۔ یہاں عہد اکبر و جہانگیر کے دستور کے مطابق شہزادے، امراء اور عہدہ داران سلطنت حاضر ہوتے اور اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق دائیں اور بائیں جانب کھڑے رہتے تھے۔

۱- ڈیلائٹ - صفحات ۹۸ و ۹۹ -

مختلف محکموں کے معتمدین جھروکے کے ایک طرف بادشاہ کی نشست کے قریب کھڑے ہوا کرتے تھے اور مختلف امور کے متعلق اپنی اپنی یادداشتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے ۔ منصب داروں سے متعلقہ امور بخشی پیش کرتے تھے ۔ ان کی ترقی اور تقرر وغیرہ کے احکام صادر ہوتے تھے ۔ منصب دار اور دیگر عہدہ دار بھی صوبوں کو روانہ ہونے کے وقت یا صوبوں سے واپسی پر حضور شاہی میں اسی وقت پیش کئے جاتے تھے ۔ بخشی داھنی جانب کھڑے ہو کر منصب داروں سے متعلقہ معاملات پیش کرتے تھے اور ہر معاملے کے متعلق بادشاہ جو حکم صادر کرتا، اسے مختصر یادداشت کی صورت میں لکھ لیا کرتے تھے ۔

بخشیوں کے بعد ''صدر کل'' (جو تمام مقبوضہ علاقہ جات کا صدر اعلیٰ ہوتا تھا) صدرھائے ماتحت کی بھیجی ہوئی کیفیات پڑھ کر سناتا تھا ۔ ان کے علاوہ اپنے محکمے کے دیگر امور بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا ۔ وہ مستحقین کے بارے میں سفارشیں بھی کرتا تھا اور ان کے لئے وظائف کی منظوری بھی حاصل کرتا تھا ۔

بادشاہ کے بائیں جانب میر ساماں کھڑا ہوتا تھا جو شاہی کارخانہ جات کا مہتمم ہوتا تھا ۔ وہ بادشاہ کے حضور میں ایسے معاملات پیش کرتا جنھیں وہ اس کی توجہ کے لائق سمجھتا تھا ۔ اسی طرح اس محکمے کا دیوان ضروری کاغذات اور اپنے فرائض منصبی سے متعلق مالی امور بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا ۔ اس کے بعد بخشی احدیاں اور میر آتش (کماں دار توپ خانۂ دارالحکومت)

اپنے اپنے محکموں کے معاملات پیش کر کے ضروری احکام حاصل کرتے تھے -

ان کے بعد امراء سلطنت کو اپنے آدمیوں (تابینوں) کے معاملات پیش کر کے ان کے متعلق ضروری سفارشات کرنے کی اجازت ملتی تھی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے یہ خاص رعایت تھی کہ وہ جس معاملے کو مناسب یا بادشاہ کی توجہ کے لائق سمجھتے اس کے حضور میں پیش کر سکتے تھے -

اس طور پر روز مرہ کا نیا کام ختم ہو جانے کے بعد معتمدین سلطنت گذشتہ دن کے احکام شاہی کا خلاصہ بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے تھے - ان میں مداخل حکومت ، مالیات ، تقررات ، مناصب ، عطائے جاگیرات یا زر جاگیر ، سرکاری عطیات اور انعام و اکرام وغیرہ جملہ امور کی بابت احکام ہوتے تھے - اسی طرح وہ احکام جو محکمہ صدر سے متعلق ہوتے بادشاہ کے سامنے پیش کئے جاتے تھے اور ان پر نظر ثانی کی جاتی تھی -

ان کاغذات کے معائنے کے بعد مقربان درگاہ کو اجازت تھی کہ وہ شہزادوں ، صوبہ داروں ، بخشیوں ، دیوانوں ، فوجداروں ، اور صوبوں کے دیگر عہدہ داروں کے معروضات گزرانیں - یہ ضابطۂ کار دفتری ذمہ داری کے اصول اور اس مقررہ طریقہ کار کے کچھ خلاف معلوم ہوتا ہے جو مغلوں کے نظام سلطنت میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نجی عرضداشتیں اور ایسے اہم معاملات جن پر بادشاہ کی فوری توجہ کی ضرورت ہوتی تھی ، امراء دربار کی معرفت ارسال کئے جاتے تھے -

یہ طریقہ اس تاخیر سے بچنے کے لئے اختیار کیا جاتا تھا جو دفتری طریقۂ کار کی پابندی سے لازماً پیدا ہو جاتی ہے - لیکن رسمی طور پر ہر کاغذ متعلقہ محکمہ کی معرفت ہی بھیجا جاتا تھا اور درجہ بدرجہ تمام متعلقہ عہدہ داروں کے ہاتھوں سے گزرتا ہوا بادشاہ تک پہنچتا تھا - وہ معاملات بھی جنھیں بعض اشخاص ذاتی طور پر پیش کر دیا کرتے تھے محکموں کے اعلیٰ حکام کے پاس ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھیج دئے جاتے تھے یا موقع ہی پر ان کی رائے لے کر طے کر دئے جاتے تھے - لاہوری کے اس جملے سے بھی کہ "دیگر ملازمین کی عرضداشتوں کا خلاصہ تقرر کرنے والے عہدہ داروں کی معرفت پہنچتا ہے"[1] یہی بات واضح ہوتی ہے -

غرضکہ اعلیٰ اور ذمہ دار عمال حکومت کو یہ خاص رعایت حاصل تھی کہ وہ اپنی پسند کے مطابق جن اشخاص کے ذریعے چاہتے اپنے معاملات بادشاہ کے حضور میں پیش کرا سکتے تھے - مذکورہ اشخاص یا تو ان کی عرضداشتوں کو شروع سے آخر تک پڑھ کر بادشاہ کو سنا دیتے تھے یا انھیں من و عن اس کے حضور میں پیش کر دیتے تھے - لیکن دوسرے اشخاص کے معاملات کی بابت متعلقہ محکمہ کا ذمہ دار افسر صرف اپنی مختصر یادداشت بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا -[2]

---

۱ - لاہوری صفحہ ۱۴۷ -

۲ - ابوالفضل دکن میں اپنی نیابت کے زمانے میں شکایت کرتا ہے کہ میری بھیجی ہوئی رپورٹوں کو بادشاہ کے سامنے پیش کرنے میں تاخیر ہو جاتی ہے یا انھیں پوری طرح پڑھ کرنہیں سنایا جاتاچولکہ متعلقہ عہدہ دار میرے ہوا خواہ نہیں ہیں (اکبر نامہ - جلد سوم - سال چہل و چہارم - ۷۵۳)

اسی دوران میں ھاتھیوں اور شاھی اصطبلوں کے داروغہ اور مشرف ھاتھی اور گھوڑوں کی مقررہ تعداد کو چھوٹی چھوٹی متعدد ٹولیوں میں تقسیم کر کے شاھی معائنے کے لئے تیار رکھتے تھے اور انھیں یکے بعد دیگرے (دیوان خانہ کے دوسرے اور بیرونی کمرے کی) سرخ نیچی دیوار کے قریب سے گزارتے تھے اور بادشاہ دور سے ان کا معائنہ کرتا تھا - اگر وہ دبلے یا خستہ حال نظر آتے تو ان کے نگرانوں کی تنخواھوں سے جرمانہ وصول کرنے کے احکام صادر کئے جاتے تھے -

اس کے بعد داغ و تصحیحہ کے محکموں کے متہمم (یعنی گھوڑوں کو داغنے والے اور ان کی پڑتال کرنے والے) امراء کے سپاھی اور گھوڑے پیش کرتے تھے -

سارا کام اس طرح ختم کرنے کے بعد بادشاہ خلوت خانے میں چلا جاتا تھا - یہ کام بالعموم پانچ گھڑی (یعنی دو گھنٹوں میں) ختم ہو جاتا تھا -

اس اجلاس میں شدید مصروفیت کے باوجود ، شاہ جہاں تمام اھم کاغذات کا مطالعہ خود کرتا تھا اور بعض اوقات فوری اھمیت کے استفسارات کے جواب وھیں موقع پر خود اپنے قلم سے تحریر کر دیتا تھا -[1]

"غسل خانہ" (خلوت خانہ) | ابوالفضل نے کہیں بھی اس لفظ کا مفہوم بیان نہیں کیا ھے ، نہ اس نے اس کا ذکر ان

---

۱ - لاھوری- جلد اول- صفحات ۱۴۶ تا ۱۴۸- صالح- صفحات ۲۴۴ یا ۲۴۶ - برھمن - صفحات ۱۱ تا ۲۳ اور ۳۵ تا ۳۹ -

درباروں کے سلسلے میں کیا ہے جو اکبر رات میں یا سہ پہر کو منعقد کرتا تھا۔ وہ بالعموم لفظ ''دولت خانہ'' استعمال کرتا ہے۔ لیکن دیگر ہمعصر تاریخی تحریروں میں یہ لفظ ''دیوان'' کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور خلوت خانہ کے لئے بھی۔ جہانگیر کے زمانے میں یہ لفظ قطعی طور پر ''خلوت خانہ'' کے لئے استعمال ہوا ہے اور یہی مناسب تھا۔ لاہوری اور صالح نے اس بات کی توضیح کی ہے کہ ''خلوت خانہ'' کے لئے لفظ ''غسل خانہ'' کیوں استعمال ہونے لگا۔[1] دیوان خانے اور زنان خانے کے درمیان ایک کمرہ تھا جس میں اکبر غسل کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ معدودے چند قابل اعتماد اشخاص کو غسل خانے ھی میں بغرض ملاقات طلب کر لیتا تھا۔ بعد میں دیوان بخشی بھی امور مملکت کی انجام دھی کے سلسلے میں وھیں طلب کئے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض امراء دربار کو بھی وھاں آنے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح سلطنت کا کام وھیں انجام دیا جانے لگا اور اس کمرے کو خاص ھجرہ غسل سے متصل ہونے کے باعث ''غسل خانہ'' کہنے لگے۔ شاہ جہاں نے اس کمرے کا نام ''دولت خانہ خاص'' رکھا اور اس کے زمانے میں یہی نام عام طور پر مشہور ھو گیا۔[2]

بہرحال یہ یقینی ہے کہ اکبر رات کا کافی حصہ ان مجالس میں گزارتا تھا۔ ''اعلیٰ حضرت دولت خانے میں رات کا کافی وقت مفید مشغلوں

---

۱ - لاھوری - جلد اول - صفحہ ۱۴۸ - صالح - جلد اول - صفحہ ۲۴۷ -

۲ - لاھوری - جلد اول - صفحہ ۱۴۸ - صالح - لفظ خلوت خانہ استعمال کرتا ہے جلد اول صفحہ ۲۴۷، لیکن دیگر مواقع پر وہ برابر پرانا لفظ غسل خانہ ھی استعمال کرتا ہے - برھمن نے ھر جگہ یہی لفظ استعمال کیا ہے اس طرح یہی نام مشہور ھوگیا - صالح - جلد اول صفحات ۲۴۹ - ۲۵۰ اور جلد دوم صفحہ ۵۱۲ - برٹش میوزیم - م ۳۸۶ -

میں گزارتے ھیں حکمائے فصاحت طرازوصوفیائے پاکباز اس وقت باریاب ھوتے ھیں - ان مجالس میں غیر متعصب مورخین بھی موجود رھتے ھیں جو اپنی طرف سے واقعات میں کمی بیشی کر کے تاریخ کو مسخ نہیں کرتے اور زمانۂ قدیم کے موثر و دلنشین واقعات بیان کرتے ھیں .... بعض دیگر مواقع پر قلمرو اور مداخل سلطنت سے متعلق امور پیش کئے جاتے ھیں اور اعلیٰ حضرت ھر معاملے کی بابت مناسب احکام صادر فرماتے ھیں،،۔ ابوالفضل نے سجدے کے قواعد کےمتعلق جو کچھ بیان کیا ھے اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ھے - ،،بہرحال انجمن خاص میں جہاں صرف چند خوش قسمت اشخاص کو بیٹھنے کی اجازت ملتی ھے ، لوگ یقیناً سجدۂ تعظیمی بجا لاتے ھیں ،، - لہٰذا یہی چند خوش قسمت اشخاص کی انجمن خاص تھی جو بعد میں مذھبی امور پر بحث کرنے لگی - اکبر کے مذھبی مباحثوں سے لوگ خوب واقف ھیں - ان کے متعلق کسی قسم کی توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں - چند مثالیں نیچے درج کی جاتی ھیں ، جن سے واضح ھو جائےگا کہ امور سلطنت کی انجام دھی کے لئے بھی رات کے وقت دربار منعقد کئے جاتے تھے - مانسریٹ نے متعدد درباروں کا ذکر کیا ھے - جن میں وہ خود موجود تھا۔ لیکن افسوس ھے کہ وہ مذھبی موضوعات کے سوا جن سے اسے خاص دلچسپی تھی کسی دوسرے موضوع کا ذکر نہیں کرتا - ''جب کوئی خاص اجلاس منعقد ھوتا یا جب وہ (اکبر) پادریوں کو بے تکلف گفتگو کے لیے اپنی انجمن خاص میں طلب کرتا تو آنھیں اپنے قریب جگہ دیتا تھا .... وہ ان سے تنہائی میں گفتگو کرنے کے لئے اکثر دیوان عام سے آٹھ کر چلا جاتا تھا،،۔[1] بعد میں جب اکبر کابل کی مہم پر گیا تو

---

۱ - مانسریٹ - صفحہ ٦٣ -

مانسریٹ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس وقت اسے اکبر کی گرانبار مصروفیات کا اچھی طرح جائزہ لینے کا موقع ملا۔ اس کا بیان ہے کہ اکبر تمام جزئیات پر خود توجہ کرتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ ایسی مجلسوں کے انعقاد کا ذکر بھی کرتا ہے۔ "بادشاہ اکثر راتوں کو جنگی مجلس شوریٰ منعقد کرتا ہے جن میں گھنٹوں مسائل جنگ کے بارے میں مشورے کئے جاتے ھیں"۔[۱] "وہ تنہائی میں ہر مشیر سے اس کی ذاتی رائے دریافت کرتا ہے پھر خود ایسا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، جس کو حاضرین کی کثرت کی، نیز سب سے زیادہ تجربہ کار اشخاص کی تائید حاصل ھوتی ہے"۔[۲] ابوالفضل نے محض ضمناً ایک شبینہ مجلس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا اصل مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اکبر فوق الفطرت قوتوں پر متصرف تھا۔ "۲۲ تاریخ سے پہلی رات کو دربار ہو رہا تھا کہ دفعۃً مطلع ابر آلود ھوگیا اور قریب تھا کہ بارش ھونے لگے۔ اعلیٰ حضرت نے اس وقت فرمایا "اے بارش، ذرا مہربانی سے کام لے اور اس روحانی محفل کو درہم برہم نہ کر"۔ یہ کہنا تھا کہ مطلع صاف ھوگیااور فضا حیرت انگیز طور پر پرسکون ھوگئی۔ جہاں تہاں موسلادھار مینہ برسا لیکن قصرشاھی پر ایک بوند نہ گری"۔[۳]

جہانگیر اپنی تزک میں لفظ غسل خانہ استعمال کرتا ہے۔ اس کے عہد میں بھی رات کے وقت دربار منعقد ھوتے رہے۔ لیکن یہ باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ اس کے عہد حکومت کے آخری دنوں میں اس

---

۱ - مانسریٹ - صفحہ ۱۲۳ -

۲ - ایضاً - صفحہ ۲۰۳ -

۳ - اکبر نامہ - جلد سوم صفحہ ۷۱۱- بیورج - صفحہ ۱۰۶۰ - دربار کھلی جگہ میں منعقد ھوا تھا -

کی مسلسل علالت اور پریشانیوں کے باعث ان درباروں کا سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رہ سکا ہوگا۔ ڈیلائٹ کہتا ہے ''شام کے ۷ بجے سے ۹ بجے شب تک وہ اپنے امراء سے خلوت میں مشورہ کرنے کے لئے ایک نہایت خوبصورت بڑے کمرے میں جس کا نام Guzelcan (غزل کان۔ غسل خانے کا بگاڑ) ہے، خاص مجلس منعقد کرتا ہے۔[1] پلسائرٹ لکھتا ہے کہ اجنبیوں کو بھی عرض حال کے لئے غسل خانے میں طلب کر لیا جاتا ہے۔[2] جہانگیر ضمناً ایک شبینہ دربار کا ذکر کرتا ہے، جس میں شاہ ایران کا ایک سفیر بھی موجود تھا، ''۱۹ آبان کو بوقت شب میں حسب معمول غسل خانے میں تھا۔ بعض امراء اور خدمت گار حاضر تھے اور اتفاق سے محمد رضا بیگ سفیر شاہ ایران بھی وہیں موجود تھا...... دربار دو گھنٹے سے زیادہ عرصے تک رہا''[3] ایک دوسرے موقع پر تزک کی عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکبر کی طرح جہانگیر نے بھی اپنے دوروں میں ایسے دربار منعقد کرنے کے انتظامات جاری رکھے۔ ''اس موقع پر ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا...... رات کے وقت ہمارے قیام کے دوران میں

---

۱ - ڈیلائٹ۔ صفحہ ۹۳ -

۲ - پلسائرٹ۔ صفحہ ۵۳ -

۳ - تزک۔ صفحہ ۱۸۶ - سال یازدہم - ترجمہ روجرز صفحہ ۳۳۷ - اس سلسلے میں مذکور ہے کہ جہانگیر نے تاریکی میں بندوق سے ایک اُلو شکار کیا تھا، جس پر ان لوگوں نے جو باہر تھے تحسین و آفرین کے نعرے لگائے تھے - اس کے بعد سفیر سے بادشاہ کی گفتگو اس امر کی بابت کہ شاہ ایران نے اپنے بڑے بیٹے کو قتل کرادیا تھا، مذکور ہے۔ سرطامس رو نے بھی اس دربار کا ذکر کیا ہے -

غسل خانے کے قریب جسے منتظمین نے تالاب کے کنارے نصب کیا تھا، دو سارس اس طرح شور مچاتے ہوئے آئے جیسے ان پر کوئی ظلم کر رہا ہو۔ وہ بیدھڑک شور مچاتے ہوئے سامنے آ گئے۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ ضرور ان سے کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ ان کے بچے پکڑ لیے گئے ہیں"۔ چنانچہ یہ بچے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے اور پھر سارسوں کے حوالے کر دیے گئے۔[1]

شاہ جہاں روزانہ دو مرتبہ علحدہ اجلاس کرتا تھا۔ ان میں سے ایک بوقت صبح دیوان خاص و عام سے اٹھنے کے بعد ہی منعقد ہوتا تھا۔ یہاں وکیل اور وزیر کو بادشاہ سے تنہائی میں گفتگو کا موقع ملتا اور وہ ایسے معاملات و مقدمات بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے جن پر بھرے دربار میں گفتگو کا موقع نہ ہوتا تھا۔ دیوان خالصہ جات اور جاگیروں کے معاملات پیش کرتے تھے۔

صوبہ داروں کی طرف سے جو مراسلے موصول ہوتے وہ چند قابل اعتماد امراء کے حوالے کر دیے جاتے۔ وہ ان کا مطالعہ کرتے اور پھر انھیں بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے۔ بادشاہ ان پر احکام صادر کرتا جو وکیل یا وزیر کی معرفت منشیوں کے سپرد کر دیے جاتے تھے اور وہ فرمان شاہی کا مسودہ تیار کرتے تھے۔ ایسے فرامین کے مسودات اسی اجلاس میں بادشاہ کے سامنے پیش

---

۱ - تزک۔ صفحہ ۱۶۹ - سال یازدھم - دورہ از اجمیر تا مالوہ - اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ پرندے اور جانور تک بادشاہ سے انصاف طلب کرتے تھے اور کسی خوف کے بغیر اس کے سامنے فریادی بن کر حاضر ہو جاتے تھے۔

ہوتے اور وہ خود انہیں پڑھتا اور ان میں ضروری رد و بدل یا اصلاح کرتا تھا۔[1] یہاں صدر کل ایسے ضرورت مند اشخاص کو حضوری میں لاتا جو دیوان میں پیش نہیں کیے جا سکتے تھے اور ان کے گذارے کے لئے اراضی یا نقد وظائف کے احکام حاصل کرتا تھا۔

ان امور کی انجام دہی کے بعد کچھ وقت ان چیزوں کے معائنے میں صرف کیا جاتا جو کارخانہ جات کے مختلف شعبوں میں تیار ہوتی تھیں۔ چندر بھان لکھتا ھے کہ بادشاہ ھر قسم کی صناعی اور کاریگری سے دلچسپی لیتا تھا۔ ایک طرف زیورات اور چاندی سونے کے کام کے نمونے بغرض ملاحظہ پیش کیے جاتے تھے اور دوسری طرف الماس تراشنے والے اور دیگر ماھرین فن بادشاہ سے مبادلۂ خیال کرتے اور اس سے ھدایات حاصل کرتے تھے۔ شاھی کارخانہ جات میں تیار ہونے کے لیے جو کام صوبوں سے آتا اور شاھی گوداموں کے لیے جو سامان خریدا جاتا اس سے بھی بادشاہ کو مطلع رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح علمی و ادبی تصانیف، ترجمے، مسودات کی نقلیں، خطاطی، نقاشی اور مصوری کے نمونے بھی اس کے سامنے پیش کیے جاتے تھے اور شاھی کارخانوں میں تیار کردہ مختلف ھتھیاروں یعنی تلواروں، بندوقوں، توپوں کا معائنہ بھی کرایا جاتا تھا۔

محکمہ تعمیرات کے داروغہ، مہندسوں اور معماروں کے مشورے سے مجوزہ عمارات شاھی کے نقشے اور نمونے تیار کرکے پیش کرتے تھے۔ بادشاہ ان کی ایک ایک تفصیل کا معائنہ کرکے ان میں نہایت

---

۱ - صالح - جلد اول صفحہ ۲۴۸ - لاھوری - صفحہ ۱۴۸ -

موزوں ترمیمات سجھاتا اور اکثر ان پر نکتہ چینی کرتا۔ وکیل ، یمین الدولہ بادشاہ کی تجویز کردہ تبدیلیوں کو یادداشتوں کی صورت میں بالتفصیل قلم بند کر لیتا تھا اور یہ ضروری کارروائی اور آئندہ حوالے کے لئے محکمۂ متعلقہ کے عہدہ داروں کو ارسال کر دی جاتی تھیں۔

کچھ وقت ان پرندوں اور جانوروں کے معائنے پر بھی صرف کیا جاتا تھا جنھیں شکار کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اسی طرح عمدہ گھوڑوں کا بھی معائنہ ہوتا تھا جن کی نمائش صحن میں کی جاتی تھی۔[1] اس اجلاس میں شاہجہان عموماً چار سے پانچ گھڑی تک (تقریباً دو گھنٹے) صرف کرتا تھا۔

شاہ برج

غسل خانے میں کام ختم کرنے کے بعد بادشاہ ایک اور زیادہ اندرونی کمرے میں چلا جاتا ، جسے شاہ برج کہتے تھے لیکن اس قاعدے پر صرف شاہجہان آباد ، لاہور اور اکبر آباد ہی میں عملدر آمد ہوتا تھا۔ در اصل یہ جگہ شہزادوں سے گفتگو اور مشورے کے لئے مخصوص تھی لیکن بعض خاص خاص دوسرے اشخاص بھی تھوڑی دیر کے لئے سلطنت کے کاموں کے لئے یہاں بلا لیے جاتے تھے اور وہ کام ختم ہوتے ہی فوراً باہر چلے جاتے تھے۔ تاہم وکیل اور وزیراعظم کو بادشاہ سے تنہائی میں ملاقات کا موقع ملنے کے باعث اس مجلس

۱- برہمن۔ صفحات ۲٦ تا ۲۸ - لاہوری۔ صفحات ۱۴۸-۱۴۹ -
شاہ جہان کا ذوق فن تعمیرات کی بابت بہت اعلی تھا۔ نقشوں اور عمارتوں پر اس کی تنقیدیں اور تبدیلیوں کی بابت اس کے احکام اس کے تاریخی حالات میں جا بجا مذکور ہیں۔

کی افادیت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ وقتاً فوقتاً ایسے اہم اور خفیہ معاملات کی بابت مشورہ کرنے کے لیے جن کو مملکت کے مفاد کی خاطر دیگر مجلسوں میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا تھا بادشاہ خود وزیراعظم کو یہاں طلب کر لیتا تھا اور اپنے خیالات ظاہر کر کے متعلقہ امور کی بابت اس سے مشورہ کرتا تھا۔

اسی طرح صوبائی عہدہ داران حکومت یا دور دراز مقامات پر مامور امراء کے نام بعض ایسے خفیہ فرمان ہوتے تھے جنھیں دوسروں پر ظاہر نہیں کیا جاسکتا تھا۔۔ ان کی بابت یہیں غور و خوض کیا جاتا تھا۔

بعض اوقات وزیر کو اجازت ہوتی تھی کہ اگر خالصہ یا جاگیر سے متعلق کوئی ایسا اہم معاملہ ہو جس پر بادشاہ کو دولت خانۂ خاص میں غور کرنے کا وقت نہ ملا ہو تو اسے وہ یہاں پیش کرے۔

یہاں عموماً دو یا تین گھڑی وقت صرف کیا جاتا تھا۔

شاہ برج سے بادشاہ زنان خانے میں چلا جاتا، جہاں وہ نماز ظہر ادا کرتا، دوپہر کا کھانا کھاتا اور تھوڑی دیر قیلولہ کرنے کے بعد پھر وہیں کام شروع کرتا تھا۔[1] سب سے پہلے اس کے سامنے بیگمات حرم کے معاملات پیش ہوتے تھے۔ اس کے بعد وہ دیگر خواتین کی عرضیوں پر احکام صادر کرتا تھا، جنھیں ملکۂ ممتاز محل

۱- برھمن کی روایت کے مطابق وہ یہاں کا کام قیلولے سے پہلے ہی ختم کر لیتا تھا (صفحات ۳۴، ۳۵) لیکن دوپہر کے کھانے کے بعد ہی تھوڑی دیر آرام کرنا شمالی ہندوستان کا عام دستور ہے۔

پیش کرتی تھی - شاہ جہاں کی تخت نشینی کے بعد چند ھی سال ملکہ ممتاز محل زندہ رھی اور جب تک وہ زندہ رھی بادشاہ کے سامنے یہ عرضیاں وھی پیش کرتی تھی - اس کے بعد اس کی بیٹی بیگم صاحب نے یہ خدمت انجام دی - ستی النساء جو دربار کی ایک نہایت شائستہ اور ذی علم خاتون تھی جب تک زندہ رھی ملکہ ممتاز محل اور اس کے بعد اس کی صاحبزادی کی معتمد کی حیثیت سے کام کرتی رھی -

سہ پہر اور شام کے اجلاس

بادشاہ زنان خانے میں عصر کی نماز تک ٹھہرتا تھا - اس کے بعد وہ دیوان خانۂ عام میں آ جاتا تھا - یہاں وہ محافظ دستوں کی سلامی لیتا تھا اور ''خوش نصیب'' حاضرین کی کورنش قبول کرتا ہوا دولت خانۂ خاص میں داخل ھوتا تھا اور یہاں پھر صبح کی طرح امور سلطنت انجام دیے جاتے تھے لیکن ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہ اجلاس زیادہ محدود نوعیت کا ھوتا تھا اور اس میں زیادہ تر وزرا اور اعلی عہدہ داران سلطنت ھی شریک ھوتے تھے -جس طرح وکیل یا وزیر اعظم کو شاہ برج میں اپنے خیالات کے اظہار کے مواقع حاصل تھے اسی طرح اس اجلاس میں دیگر وزراء کو بادشاہ کے حضور میں اپنے خیالات ظاھر کرنے کا موقع ملتا ھوگا - اس اجلاس میں خاص طور پر روزمرہ کا معمولی کام انجام دیا جاتا تھا - ایسی صورت میں وزیر اعظم کی موجودگی غالباً ضروری نہ تھی - باریاب ہونے والے اشخاص اور امراء کی تعداد میں اضافہ نماز مغرب کے بعد ھوتا تھا - یہاں بادشاہ غروب آفتاب تک امور سلطنت کی

انجام دہی میں مصروف رہتا۔ اس کے بعد وہ نماز مغرب میں شریک ہوتا جو وہ ہمیشہ باجماعت ادا کرتا تھا۔ اس میں علماء و مشائخ بھی شریک ہوتے تھے اور بعد نماز بادشاہ کے ساتھ دولت خانۂ خاص میں چلے جاتے تھے۔[1]

بعد نماز دولت خانۂ خاص میں بڑے تجمل سے چراغاں کیا جاتا۔ قیمتی جواہرات سے مرصع سونے چاندی کے شمع دانوں میں معطر شمعیں روشن کی جاتی تھیں جن سے ایوان کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ اکبر کے عہد میں چراغ جلانے کے وقت مقررہ رسوم ادا کی جاتی تھیں، جنھیں اس کے جانشینوں نے بھی قائم رکھا۔ ابوالفضل نے اس تقریب کو مفصل طور پر بیان کیا ہے۔ جہانگیر نے خود ایک بیت تصنیف کی تھی جو چراغ جلانے کے وقت پڑھی جاتی تھی۔ شاہ جہاں ہمیشہ اس موقع پر موجود رہتا تھا۔ خدا کی حمد و سپاس کے بعد بادشاہ کی درازیٔ عمر اور بقائے سلطنت کی دعا پر مشتمل اشعار گائے جاتے تھے۔ اسکے بعد یہ تقریب ختم ہو جاتی تھی۔[2] چندر بھان کہتا ہے کہ شاہ جہاں نماز سے فارغ ہو کر پھر کام

۱۔ صالح۔ جلد اول صفحہ ۲۴۹۔ لاہوری۔ جلد اول صفحہ ۱۰۲۔ برہمن۔ صفحات ۳۰ تا ۳۹۔ برہمن نے صحیح ترتیب واقعات کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا۔

۲۔ "غروب آفتاب کے بعد خدمت گار بارہ شمعیں سونے اور چاندی کے شمع دانوں میں روشن کر کے بادشاہ کے حضور میں لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک شیرین نوا مغنی شمع کو ہاتھ میں لیے ہوئے مختلف دل کش دھنوں میں خدا کی حمدوثنا کے گیت گاتا ہے اور اول و آخر میں بقائے دولت ہمایونی کی دعا کرتا ہے"۔ آئین۔ صفحہ ۴۳ بلاک مین۔ صفحہ ۴۹۔ برہمن۔ صفحہ ۳۸۔

میں مصروف ہو جاتا تھا ۔[۱] اس وقت وہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ کام کرتا تھا اور اس کے بشرے سے تکان یا بیدلی کے آثار کبھی ظاہر نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کے بر عکس وہ تازہ دم معلوم ہوتا تھا ۔ وہ اس طرح نماز کے بعد چار سے پانچ گھڑی تک یعنی تقریباً دو گھنٹے کام کرتا تھا ۔

گانا سننے میں بھی کچھ وقت صرف کیا جاتا تھا ۔ اس تقریب کے لیے بھی خاص انتظامات ہوتے اور اکبر کے زمانے ھی سے یہ کوشش کی جاتی تھی کہ حاضرین دربار محظوظ ہوں اور دن بھر کے خشک کاموں سے اکتائی ہوئی طبیعتیں تازہ دم ہو جائیں ۔[۲]

اسکے بعد نماز عشاء کے لئے دربار برخاست ہو جاتا تھا اور اگر کوئی کام باقی رہ جاتا تو بادشاہ اسے شاہ برج میں جا کر انجام دیتا تھا ۔ اس وقت وزیر اعظم اور بخشیوں کو حاضری کی اجازت ہوتی تھی اور اس طرح وزراء کو تنہائی میں بادشاہ سے عرض معروض کا ایک موقع پھر مل جاتا ۔ اس کے بعد دن کا کام اور بادشاہ کی بے پناہ مصروفیات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ۔ پھر وہ

---

۱ ۔ شاہ جاں کسی ممتاز و معروف امیر کے نام ایک فرمان لکھنے میں مصروف تھا کہ صلابت خاں میر بخشی پر راؤ امر سنگھ نے حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا جس کی وجہ سے موقع واردات پر ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا ۔ یہ واقعہ نماز مغرب کے بعد دربار میں ہوا ۔ لاہوری ۔ صفحہ ۳۸۰ ۔ سال ہفت دھم)

۲ ۔ شاہ جہان خود ایک اچھا رقاص تھا اور اکبر کی طرح متعدد آلات موسیقی کا استعمال بھی جانتا تھا ۔ (لاہوری ۔ صفحہ ۱۵۲ جلد اول ۔ برھمن صفحہ ۱۴) ممتاز محل کے انتقال کے بعد وہ دو برس تک موسیقی سے محترز رہا ۔ (لاہوری ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۳۸۷ ۔)

زنان خانے کے اندر چلا جاتا اور وهاں بیگمات و خواتین کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹے تک موسیقی کا لطف اٹھاتا - بعد ازاں اپنی خوابگاہ میں داخل ہو جاتا تھا ، جہاں ایک پردے کی آڑ سے داستان گو اور خوش آواز قصہ خواں کتب تاریخ و سوانح سے انبیاء کرام ، اولیاء عظام اور نامور شاهان عالم کے حالات پڑھ کر سناتے تھے -[۱]

معدلت گستری

تینوں بادشاهوں نے عدالتی مقدمات کی سماعت خود کرنے کے لیے ایک ایک دن مخصوص کر رکھا تھا - چنانچہ اکبر نے پنجشنبہ ،[۲] جہانگیر نے سہ شنبہ[۳] اور شاہ جہان نے چہار شنبہ کو اس کام کے لئے مختص کر لیا تھا - مقررہ دن بادشاہ جھروکۂ درشن سے سیدھا دولت خانۂ خاص میں آ جاتا - وهاں عہدہ داران محکمہ قضا ، مفتی اور ایسے چند علما کے سوا جو علم ، تقویٰ اور دیانت داری کے لیے مشہور تھے ، دوسرے کسی شخص کو آنے کی اجازت نہ تھی -[۴]

باقاعدگی

شخصی حکومت کے نظم و نسق میں ایک خاص مقررہ دستورالعمل کی پیروی کا طریقہ

---

۱ - شاہ جہاں کو عموماً ظفر نامہ اور بابر نامہ کے اقتباسات پڑھکر سنائے جاتے تھے - برهمن ان کے علاوہ اکبر نامہ کا ذکر بھی کرتا ھے - اکبر ساڑھے سات گھنٹے سوتا تھا - لیکن شاہ جہاں کبھی چھ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتا تھا - (اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۲۵۷ - لاھوری - جلد اول صفحہ ۱۵۳)

۲ - اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۱۷ -

۳ - ڈیلائٹ صفحہ ۹۳ - ھاکنز - صفحہ - ۱۱۶ - فنچ - صفحہ ۱۸۴ -

۴ - اس موضوع کا نظام عدالت کے تحت بالتفصیل جائزہ لیا گیا ھے -

اکبر نے رائج کیا ۔ ان قواعد و ضوابط سے جنھیں اکبر نے وضع کیا ، جن کی پیروی جہانگیر نے اور تکمیل شاہ جہاں نے کی ، اچھی طرح واضح ہو جاتا ھے کہ یہ فرماں روا اپنی ذمہ داریوں اور مملکت میں اپنی حیثیت کو کس نظر سے دیکھتے تھے ۔ ملک پر مسلمانوں کی حکومت کی تین صدیوں کے دوران میں جو سبق اور تجربات حاصل ہوئے تھے اور ہمایوں کے عہد میں خود سلطنت مغلیہ کو جو زبردست جھٹکا لگا تھا ان سب باتوں سے اکبر اور اس کے قریبی جانشین خوب واقف تھے ۔ اسی لئے ان تمام قواعد و ضوابط کے باوجود جن پر یہ حکمران عمل کرتے رھے ، انھوں نے کبھی ان خطرات کو فراموش نہ کیا جن میں سلطنت محصور تھی ' نہ وہ کبھی ان ناموافق حالات کی اھمیت سے غافل ہوئے ' جن کی موجودگی میں وہ حکومت کر رھے تھے ۔ مملکت میں نظم و نسق پر اختیار و نگرانی کے لیے کسی دستوری جماعت یا کسی مستقل مقتدر قوت کے فقدان کی صورت میں بادشاہ وقت کا شب و روز ھوشیار رھنا ھی سلطنت کو خطرات سے محفوظ رکھنے، ان کا سد باب کرنے اور ان پر قابو پانے، نیز نظم و نسق کو بسہولت چلانے کا ضامن ھو سکتا تھا ۔ ان بادشاھوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا ۔ لہٰذا اس کے متعلق انھوں نے ضوابط مقرر کیے اور ان کی پیروی کر کے ان سے کام لیا ۔

ان کے دستورالعمل نے ایک بار معین ھو جانے کے بعد خاندان اور سلطنت کی مستقل روایت کی حیثیت اختیار کر لی ۔ اس کی خلاف ورزی صرف ایسے غیر متوقع یا ناگزیر حالات میں ممکن تھی جو عوام کی رائے میں بھی ایسے ھوتے جن میں بادشاہ درشن' دینے

یا دیوان عام یا دیوان خاص میں امراء و ارکان سلطنت کو باریاب کرنے سے بجا طور پر معذور ہوتا تھا۔ لہٰذا ہر حکمران کے عہد میں صرف معدودے چند مواقع ایسے پیش آئے جبکہ بادشاہ جھروکۂ درشن میں نہ آسکا یا دربار عام یا خاص منعقد نہ کر سکا۔ ذیل میں ایسی چند مثالیں مذکور ہیں جن سے اس اہمیت کا اندازہ ہوگا جو اس مقررہ دستورالعمل کو حاصل تھی۔[۱]

---

۱ - وہ مواقع جن پر بادشاہ اصالۃً امور سلطنت انجام نہ دے سکا :-

اکبر : (۱) - شاہی دورے میں ایک ہاتھی سے نیچے گر پڑا - سال سی و چہارم (اکبر نامہ جلد سوم - صفحہ ۵۷۲)

(۲) - ایک ہرن کے حملے سے زخمی ہو گیا - ۲۹ دن تک صاحب فراش رہا لیکن امراء سلطنت اور عہدہ داران حکومت کو باریابی کا موقع دیتا رہا - سال چہل و یکم - (اکبر نامہ - صفحہ ۷۱۳) -

(۳) - راجہ بیربل کی موت کا صدمہ - سال سی ام (اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۴۸۷) -

(۴) - ابوالفضل کے سانحۂ قتل کا صدمہ - سال چہل و ہفتم - اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۸۱۳) -

۵) - علالت قبل ازانتقال - ۱۹ دن میں سے صرف ۴ دن غیر حاضر رہا - انتہائی کمزوری کے باوجود کورنش قبول کرتا رہا - (اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۸۴۱) -

جہانگیر : (۱) - علالت بمقام اجمیر - جب تک قطعاً مجبور نہ ہوگیا جھروکہ ، دیوان و غسل خانہ میں کئی روز تک آتا رہا - سال نہم (تزک - صفحہ ۱۳۰) -

(۲) - علالت بمقام احمد آباد - لیکن دربارعام منعقد کرنے اور مقدمات رعایا پر غور کرنے کا سلسلہ ایک دن بھی بند نہیں کیا (تزک - سال سیزدہم)

بادشاہ کے دستورالعمل کی اہمیت

مملکت کے عام نظم و نسق پر دن میں تین مرتبہ شاھی دربار منعقد کرنے کا نہایت اچھا اثر پڑتا تھا - درشن کے سلسلے میں طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی طرف منہ کرکے بادشاہ کا جھروکے میں بیٹھنا ایک ایسی جدت تھی جو بڑی دانش مندی کے ساتھ ہندوستانی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اختیار کی گئی تھی - اس کا مطلب بالواسطہ یہ تھا کہ بادشاہ رسم پرستش آفتاب کا احترام کرتا ھے - اس کے باعث ہندؤوں کے لیے اپنی مقدس جمنا ندی کے کنارے کھڑے ہو کر

حاشیہ بہ سلسلۂ صفحۂ ماسبق :—

(۳) - دختر خرم کی موت کا صدمہ - دودن باھر نہیں آیا - سال یازدھم (تزک صفحہ ۱۶۰) حالانکہ حکومت جہانگیر کے

آخری چھ سال کے دوران میں جہانگیر کی علالت اور پریشانیوں کی وجہ سے امور مملکت کی انجام دھی کے سلسلے میں بہت حرج واقع ھوا - پھر بھی وہ اس کے لیے وقت نکالتا ھی رھا- پلسائرٹ اس کے نظم و نسق کی عیب چینی کرتا ھے - لیکن اس کی یہ رائے اسی زمانے سے متعلق ھے (۱۶۲۱ تا ۱۶۲۷) ڈیلاڈٹ بھی- جس کی تحریر مذکورہ زمانے سے متعلق ھے یہ لکھتا ھے کہ بادشاہ مقررہ اوقات میں دربار عام ودربار خاص منعقد کرتا تھا- پلسائرٹ خودبیان کرتا ھے کہ وہ غسل خانے میں امور سلطنت انجام دیتا تھا جیسا کہ اوپرمذکور ھوا- ٹیری اور فنچ بھی اس کا ذکر کرتے ھیں ھاکنز نے محافل مے نوشی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ھے کہ مذکورہ محفلیں عموماً ۹ بجے سے ایک بجے رات تک منعقد ھوا کرتی تھیں -

شاہ جہاں : (۱) ملکہ ممتاز محل کا انتقال - ایک ھفتے تک دیوان اور دولت خانۂ خاص میں نہیں آیا (سال چہارم)

عبادت کرنے اور بھجن[1] گانے کی سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ اس طرح عوام کو اپنا گرویدہ بنانے اور اپنے وجود اور اپنی شخصیت کی اہمیت ان کے دلوں پر نقش کرنے کا ایک اچھا ذریعہ بادشاہ کے ہاتھ آگیا۔ اس دستور نے عوام کے دلوں کو موہ لیا اور ان کے تصورات کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ''اکبر نے تاریخ ہند کا مطالعہ غائر نظر سے کیا تھا۔ اس نے براہ راست اپنی رعایا کے آن جذبات و احساسات کو متاثر کیا جو ان کے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھے۔ جب وہ ہر صبح کے وقت درشن کے لیے اپنے محل میں جھروکے کے سامنے آتا تھا....تو ہزارہا ہندو اس عقیدے کے ساتھ

حاشیہ بہ سلسلۂ صفحۂ ماسبق :—

(۲) اس کی عزیز بیٹی ''بیگم صاحب'' کی علالت۔ ایک دن کی غیر حاضری۔ دوسرے دن (یوم شرف کو) آدھ گھنٹے کے لیے باہر آیا۔ بعد ازاں کئی دن تک صرف تھوڑی دیر کے لیے باہر آتا رہا۔

(۳) اپنی علالت ۱۹ دن۔ کار سلطنت مطلق انجام نہیں دیا۔ (سال دھم)

(۴) برھمن نے ایک اور موقع علالت کا ذکر کیا ھے۔ لیکن سال نہیں بتایا۔ بادشاہ کی غیر حاضری کو عام طور پر ایسا غیرمعمولی واقعہ تصور کیا جاتا تھا کہ جب چند روز کی علالت کے بعد شاہ جہاں باہر آیا تو مبارکبادیاں دی گئیں اور قصائد پڑھے گئے۔ برھمن نے خود بھی ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ (صفحہ ۵۸)

۱۔ ''اے گنگا، جمنا، گوداوری، سرسوتی، ستدرو (ستلج) اور پروسنی (راوی)۔ میری عبادت قبول کرو۔ اے ماروت بندھا اور اس کی معاون آسکنی اے وتستا، اے آرجیکیا اور اسکی معاون سوسا۔تم سب میری عبادت کو شرف قبولیت بخشو''۔ اساسی اتحاد ہند۔ مصنفہ آر مکرجی۔ صفحہ ۲۱۔

وہاں جمع ہو جاتے تھے کہ ہم دنیا میں وشنو کے اوتار کا درشن کرنے کے بعد با برکت طریقے سے دن کا کام شروع کریں"۔[۱]

اس کی وجہ سے بادشاہ شہزادوں ، امراء اور اعلیٰ عہدہ داروں کو مجبوراً علی الصباح اٹھنا پڑتا تھا۔ یہ شمالی ہندوستان کے گرم میدانی علاقوں میں چاق و چوبند اور صحت مند رہنے کے لیے اشد ضروری ہے۔ غرضکہ اس دستور کی وجہ سے آن کی زندگی میں باقاعدگی پیدا ہو گئی اور وہ اپنے روز مرہ کے ان فرائض کو مقررہ اوقات پر انجام دینے کے عادی ہو گئے جن سے غافل ہو جانے کا باعث گزشتہ حکمران خاندانوں پر زوال آیا تھا۔

کھلے دربار منعقد کرنے کے رواج نے راعی اور رعایا کے درمیان زیادہ مستحکم رابطہ اور بلاواسطہ تعلق قائم کردیا۔ یہ ایسی بات تھی جس کی طرف سلاطین دھلی نے مطلق توجہ نہ کی تھی۔ سرکاری وقایع نگار اور معاصر مصنفین اور مغربی سیاح، جنھیں مختلف اوقات میں دربار مغلیہ میں حاضری کا موقع ملا، سب کے سب متفقہ طورپر اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ عوام کو بادشاہ تک براہ راست رسائی کے مواقع حاصل تھے۔

بھرے دربار میں سلطنت کا کام انجام دینے کے رواج سے بادشاہ کو امور سلطنت اور عہدہ داران حکومت کے متعلق بلاواسطہ جتنی معلومات حاصل ہو جاتی تھیں، اتنی اس زمانے میں کسی دفتر کی چہار دیواری کے اندر حاصل نہیں ہو سکتی تھیں ، اور یوں ایک طرح سے وزراء ، عہدہ دار اور دیگر اشخاص جو ہر وقت بادشاہ کی

۱۔ ای۔ جی۔ هیول۔ "هندوستان میں آریائی حکومت کی تاریخ" صفحات ۵۱۶-۵۱۸۔

خدمت میں حاضر رہتے تھے اور جنھیں تنہائی میں بادشاہ پر اثر ڈالنے کے مواقع حاصل تھے، بادشاہ پر ناجائز اثر نہ ڈال سکتے تھے۔ جب کوئی وزیر بادشاہ کے سامنے کوئی معاملہ پیش کرتا یا جب کوئی دوسرا اہل کار بادشاہ کی توجہ کسی امر کی جانب مبذول کراتا تو وہ تمام اشخاص جنھیں قرب شاہی کا شرف حاصل رہتا، اس معاملے کی بابت اظہار رائے کا حق رکھتے تھے۔ اس معمول کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ دربار مغلیہ پر کسی فرد واحد یا گروہ کے غلبے کے امکانات تقریباً ختم ہو گئے۔

ان اجلاسوں کی وجہ سے جو بادشاہ ''غسل خانے'' میں منعقد کرتا تھا وزراء حکومت اور سرکاری محکموں کے اعلیٰ حکام کو بہ آسانی یہ موقع مل جاتا تھا کہ وہ تمام اہم معاملات کی بابت بادشاہ کو ایسا مشورہ اور رائے دے سکیں جس کا اعلان کھلے دربار میں ممکن نہ ہوتا تھا۔ اس طرح کسی اہم معاملے کی بابت بادشاہ کو سرکاری اور دیگر ذرائع سے براہ راست معلومات حاصل کرنے اور اور اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کے کافی مواقع حاصل ہو جاتے تھے۔

شاہ جہاں نے ہر ادارے اور محکمے میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ چنانچہ اس نے زنان خانے کے قریب شاہ برج میں علحدہ خاص اجلاس منعقد کرنے کا طریقہ اختیار کرکے اپنے وزراء کے لیے مزید سہولتیں پیدا کر دیں۔

جس پابندی کے ساتھ خود اکبر نے اپنے مقرر کردہ دستورالعمل کی پیروی کی، نیز جو اہمیت اس کے عہد حکومت میں اس دستورالعمل کو حاصل ہوئی وہ اس امر کی کافی ضمانت تھی کہ اکبر کے قریبی

جانشیں بھی جنھوں نے اپنی آنکھوں سے نہایت پابندی کے ساتھ اس پر عمل ہوتے دیکھا تھا، اس کی پیروی کریں گے۔ بحیثیت مجموعی اس سے اس جذبے کا اندازہ ہوتا ہے جس کے ساتھ انھوں نے حکومت شروع کی تھی اور ان مقاصد کا پتا چلتا ہے جو ان کے پیش نظر تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ شخصی حکومت میں نظم و نسق کی کامیابی اس امر پر منحصر ہوتی ہے کہ خود بادشاہ کس طرح اپنا وقت صرف کرتا ہے۔ اس اہم نکتے کو پہلے تین عظیم المرتب شاہان مغلیہ نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا اور اسی وجہ سے انھیں اس قدر نمایاں کامیابی حاصل ہوئی وہ خود اپنے فرائض خندہ پیشانی کے ساتھ انجام دیتے تھے اور ان لوگوں کے سامنے اپنے ذاتی نمونہ پیش کرتے تھے جن پر بالآخر ان کے منشاء کی تکمیل اور ان کے احکام کی تعمیل کا دار و مدار تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے ''اعلیٰ حضرت کسی معاملے کے ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کو بھی اس معاملے کی مکمل صورت کا آئینہ سمجھتے ہیں۔ وہ معمولی جزئیات کو سطح بین اشخاص کی طرح ہیچ سمجھ کر مسترد نہیں فرماتے اور اس امر کو خوب سمجھتے ہیں کہ رعایا کی خوشی خود بادشاہ کی خوشی کے لئے ضروری ہے، دماغی توازن کو کبھی برہم نہیں ہونے دیتے''۔ مانسریٹ جو اکبر کی شخصیت سے بہت متاثر تھا، اس بیان کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے ''اس امر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ بادشاہ نے ہر شخص کو جو حاضر بارگاہ ہونا چاہتا ہے، روک ٹوک کے بغیر حاضر ہو سکنے کے لیے بے انتہا سہولتیں دے رکھی ہیں کیونکہ وہ تقریباً ہر روز ایک نہ ایک موقع ایسا

نکالتا ہے کہ عوام یا امراء اس کی خدمت میں حاضر ہو سکیں اور اس سے بالمشافہ گفتگو کر سکیں ۔ ان موقعوں پر وہ درشتی کے بجائے اپنی باتوں سے خوش خلقی کا اظہار کرتا ہے اور خندہ پیشانی کے ساتھ دوسروں کی بات سنتا ہے......اگرچہ بعض اوقات ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مستا رہا ہے اور کاروبار سلطنت کو بھول چکا ہے لیکن اس وقت بھی اس کا دماغ اہم مسائل سلطنت کی ادھیڑ بن میں مصروف ہوتا ہے،،۔

جہانگیر کے حق میں یہ مضر ہوا کہ اس کو اکبر کے بعد کا زمانہ ملا کیونکہ اکبر کی عظمت و شہرت کی تیز روشنی میں جہانگیر کی عظمت و شہرت ماند پڑ گئی ۔ اکبر کی طرح اسے کوئی ایسا وقائع نگار بھی نہ ملا جو اس کی مصروفیات اور انہاک کار کی کیفیت قلم بند کرتا ۔ تاہم اس کے ہم عصر مصنفین نے جو حالات بیان کئے ہیں اور خود تزک جہانگیری کے ذریعے جو باتیں ہمیں معلوم ہوئی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک اس کی حکومت کے پہلے پندرہ سال کی مدت کا تعلق ہے وہ اس میں اپنا پورا وقت اور اپنی ساری قوت عمل امور سلطنت کی نذر کرتا رہا اور انہیں بڑی گرمجوشی اور مسرت کے ساتھ انجام دیتا رہا ۔ لیکن اس کی حکومت کے آخری چھ سال تفکرات اور پریشانیوں میں گزرے جو ذاتی بھی تھیں اور سیاسی بھی۔ جس صورت حال کا اسے مقابلہ کرنا پڑا اس کے پیدا کرنے کی موجب اس کی خرابی صحت بھی تھی ۔ اس مدت میں اس نے یقیناً پہلی سی گرمجوشی کے ساتھ کام نہ کیا ہوگا اور اس کی قوت فیصلہ پر بھی برا اثر پڑا ہوگا۔ پلسائرٹ کے یہ الفاظ کہ ،، وہ برائے نام بادشاہ ہے،، اسی زمانے سے متعلق ہیں ۔

شاہ جہان کو اپنے باپ کی غفلتوں کا خمیازہ کھینچنا پڑا اور وہ ان تمام سیاسی تحریکوں اور سازشوں کا نشانہ بن گیا جن کا جال جہانگیر کے چاروں طرف اس کی زندگی کے آخری ایام میں بنا گیا تھا۔ ان مشکلات نے جو اسے حصول تخت سلطنت کے سلسلے میں پیش آئیں اور سلطنت کی اس حالت نے جو اس وقت اس کے مشاہدے میں آئی ، نیز نظام سلطنت کی اندرونی کمزوریوں نے جو بے نقاب ہو چکی تھیں ، اسے امور سلطنت کی انجام دہی میں اپنے والد سے زیادہ محتاط اور دور اندیش بنا دیا ۔ اس کے معمولات زندگی شاہد ہیں کہ وہ سلطنت کے معاملات کی جانب بذات خود ۔ انتہا توجہ صرف کرتا تھا اور ہم عصر مصنفین لکھتے ہیں کہ ''وہ آج کا کام کبھی کل پر نہیں چھوڑتا ۔ جو معاملہ اس کے روبرو پیش ہوتا ہے تعویق میں نہیں پڑا رہتا''۔ پروفیسر سرکار اس کے روزمرہ کے معمولات کی بابت لکھتے ہیں کہ ''اس زمانے میں بھی تخت شاہی بالکل پھولوں کی سیج نہ ہوتا تھا .... شاہ جہاں کی زندگی نہایت جانفشانی اور عرق ریزی کی زندگی تھی اور اس کی بدولت اس کی رعایا امن و عافیت خوش حالی اور اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال ہو گئی ''۔[1]

خلق سبک دل زگراں باریش
فتنہ گراں خواب زبیداریش[2]

---

۱ - ہندوستان بہ عہد مغلیہ - صفحہ ۱۵ -

۲ - انڈیا آفس - مسودہ نمبر ۱۳۴۴ -

یہ حوالہ جو پروفسیر سرکار نے دیا ہے انڈیا آفس کے مسودۂ مذکور کے متن کے مطابق نہیں ہے ۔

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان تینوں مغل بادشاہوں کو اپنی عمر اور اپنی حکمرانی کے آخری دور میں مشکلات اور رکاوٹیں پیش آئیں - اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس نظام حکومت میں کچھ اندرونی خامیاں موجود تھیں جنھیں وہ اچھے اثرات بھی دور نہ کر سکے جو ان بادشاہوں کی ذاتی توجہ اور پرخلوص انہماک کار سے مترتب ہوئے تھے-

آئندہ ابواب میں ان اچھے اثرات اور اس نظام حکومت کی اندرونی کمزوریوں کے دوگونہ نتائج پر روشنی ڈالی جائے گی -

باب سوم

فرامین

خاکہ

مسودہ نگاری کا طریقہ کار — تین مراحل:—

۱ - واقعہ نویس بادشاہ کے صادر کردہ تمام احکام روزنامچے میں درج کرتا تھا - جب حکام متعلقہ اس روزنامچے کا معائنہ کر لیتے تھے تو بادشاہ اسے منظور کرتا تھا - اس طرح منظور ہو جانے کے بعد ہر حکم ایک یادداشت کی شکل اختیار کر لیتا تھا -

۲ اہم احکام کی یادداشت متعدد مراحل سے گزرتی تھی اور وزیر اعظم کی منظوری کے بعد تعلیقہ کہلاتی تھی -

وہ احکام جن پر مہر شاہی ضروری تھی:—

۳ - بخشی ، تعلیقہ اپنے پاس رکھتا اور ایک صداقت نامہ (سرخط) جاری کیا کرتا تھا - بادشاہ کی طرف سے حکم نامے کی توثیق - فرمان شاہی کا مسودہ - اہم امور پر بادشاہ کی نظر ثانی - مختلف عہدہ داروں اور وزیروں کی مہریں - احکام شاہی کی تین اقسام - فرمان ثبتی ،

بیاضی اور پروانچے (جن پر مہر شاہی کی ضرورت نہ
تھی)

مہر شاہی:۔

مختلف اغراض کے لئے استعمال ہونے والی مہریں پانچ
قسم کی تھیں ، جن میں سب سے اہم مہر ازک (مہر
کی انگشتری) تھی ۔
شاہی مہر عموماً بیگمات شاہی کی تحویل میں رہا
کرتی تھی ۔ مختلف حکمرانوں کے عہد کی مثالیں ۔

فرامین شاہی میں امتیازی نشانات اور اعزازات:۔

۱ ۔ فرمان پر سرکاری مہر کے علاوہ شاہی دستخط ۔
۲ ۔ بادشاہ کا ایک دو سطریں زیادہ کرنا ۔ یا بادشاہ کا
خود اپنے قلم سے کوئی فرمان تحریر کرنا ۔
۳ ۔ فرمان پر پنجۂ شاہی کا نشان ثبت کرنا ۔
ہر ایک کی مثالیں ۔ شاہ جہان کے پنجے اور مہر کا
چربہ ۔

فرامین شاہی کے مسودات تیار کرنے کا طریقہ

فرامین شاہی کے مسودات تیار کرنے کا طریقہ بہت مبسوط تھا - جس عہد میں مغل حکومت کرتے تھے اس کے خاص حالات کے پیش نظر جعل وفریب کے سد باب کے لئے ہرضروری احتیاط سے کام لیا جاتا تھا - بادشاہ کے احکام ، دربار میں اسکی حرکات وسکنات اور اس کے ارشادات کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے ایک خاص عملہ مقرر کیا جاتا تھا - دربار میں چودہ "واقعہ نویس" مقرر تھے - ان میں سے روزانہ دو کی حاضری ضروری تھی -

روز نامچہ

دربار میں بادشاہ سے جو قول یا فعل صادر ہوتا یا حکام سلطنت جو کچھ اس کے حضور میں پیش کرتے، واقعہ نویس وہ سب کچھ روز نامچے میں درج کر لیا کرتے تھے- اسی طرح وہ روز کے شاہی معمولات ، مثلاً صبح کو اس کے سو کر اٹھنے کا وقت ، اس کے برآمد ہونے ، مراجعت کرنے اور سرکاری تفریحات و تقریبات میں حصہ لینے کا حال بھی روز نامچے میں درج کر لیا کرتے تھے-[1]

یہ روزنامچہ اس دن کے حاضر دربار اعلیٰ امراء میں سے ایک امیر کی نگرانی میں تیار ہوتا تھا اور پھر منظوری کے لئے حضور شاہی میں پیش کیا جاتا تھا -

یادداشت

بادشاہ کی منظوری کے بعد یہ روز نامچہ منشیوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا ، جو ہر حکم اور ہر اطلاع کی ایک ایک نقل تیار کر کے اس پر اپنے دستخط بھی ثبت کر دیتے تھے -

---

۱- تفصیلات مندرجہ آئین - صفحہ ۱۹۳ - شاہی احکام ، تقررات ، انعامات ، پیش کردہ تحفہ جات ، نذر اور پیش کش - حضور سلطانی میں بار یابی - فوجی دستوں اور گھوڑوں کا معائنہ - ان کے متعلق اظہار رائے وغیرہ -

اس پر پروانچی،[1] میر عرض[2] اور اس امیر کے بھی دستخط ہوتے تھے جو پہلے یہ روز نامچہ بادشاہ کے سامنے پیش کر چکا ہوتا تھا۔

اس طرح صحت کے ساتھ جو نقل تیار ہوتی تھی وہ ایک وثیقہ کے طور پر متعلقہ شخص یا حاکم کے سپرد کر دی جاتی تھی اور یادداشت کہلاتی تھی۔

اس طرح احکام و اطلاعات کو ضبط تحریر میں لانے کا پہلا مرحلہ ختم ہو جاتا تھا۔ روز کے معمولات اور غیر اہم معاملات کے لئے اسی قدر کافی تھا مگر اہم معاملات مثلاً تقررات اور عطائے جاگیرات وغیرہ کو اپنی نوعیت اور اہمیت کے مطابق متعدد مزید مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔

متذکرۂ بالا منشیوں کے علاوہ نقل نویسوں کا بھی ایک بڑا عملہ موجود ہوتا تھا، ان کا خط بہت پاکیزہ ہوتا تھا اور یہ بہت سلیس انداز میں خلاصہ بھی تیار کر سکتے تھے۔

تکمیل کے بعد یادداشت ان کے حوالے کر دی جاتی تھی۔ وہ اسے اپنے پاس رکھتے اور اس کا مناسب خلاصہ تیار کر لیتے تھے۔ اس خلاصے پر واقعہ نویس، رسالہ دار[3]، میر عرض اور داروغہ[4] کے دستخط ہوتے تھے۔ یادداشت دفتر میں محفوظ رکھی جاتی تھی اور خلاصہ متعلقہ اشخاص کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

۱- پروانچہ لکھنے والے (ایسا حکم جس پر شاہی مہر کی ضرورت نہ ہوتی تھی، پروانچہ کہلاتا تھا) اس کتاب کے صفحات ۱۴۶ و ۱۴۷ ملاحظہ فرمائیے۔
۲- عہدہ دار جو عرضداشتوں سے متعلقہ امور کی انجام دہی کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ عنوان ''میر بخشی'' کے تحت تفصیل ملاحظہ فرمائیے - باب ۶-
۳- لغوی معنے ایک فوجی دستے کا کمانڈر۔ یہاں اس لفظ سے وہ امیر مراد ہے جو دربار میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے موجود رہتا تھا۔
۴- مہتمم دربار۔

تعلیقہ (خلاصہ حکم جس پر وزیر کے دستخط ہوتے تھے)

اس طرح تیار کیا ہوا خلاصہ تعلیقہ کہلاتا تھا اور اس کے تیار کرنے والے کو تعلیقہ نویس کہتے تھے۔ تعلیقے پر وزرائے سلطنت کے دستخط ثبت ہوتے اور ان کی مہر لگائی جاتی تھی۔ مہر ثبت کرنے کے قواعد میں ایک ضمنی حوالے سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس پر اس شہزادے کے بھی دستخط ہوتے تھے جو دربار میں اس روز اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں موجود رہتا تھا۔[1]

اس کارروائی پر دوسرا مرحلہ ختم ہو جاتا تھا اور یہ معمولی اہمیت کے معاملات میں جن کے لئے شاہی مہر ضروری نہ ہوتی، کافی سمجھی جاتی تھی۔[2]

احکام شاہی جن پر شاہی مہر ضروری تھی

مندرجہ ذیل امور سے متعلق احکام پر شاہی مہر ضروری[3] تھی :—

۱ - وکالت ، وزارت ، صدارت ، صوبہ دار اور بخشی کے عہدوں پر تقرر: اعزاز امیرالامراء، کسی شہزادے کی اتالیقی ، اور کسی منصب کا عطیہ ۔

۲ - عطائے جاگیرات، فوجی خدمت کی شرط کے ساتھ یا اس کے بغیر ۔

۳ - عطائے سیورغال ۔[4] رفاہی اغراض اور روزمرہ کی ضروریات کے لئے عطیات ۔

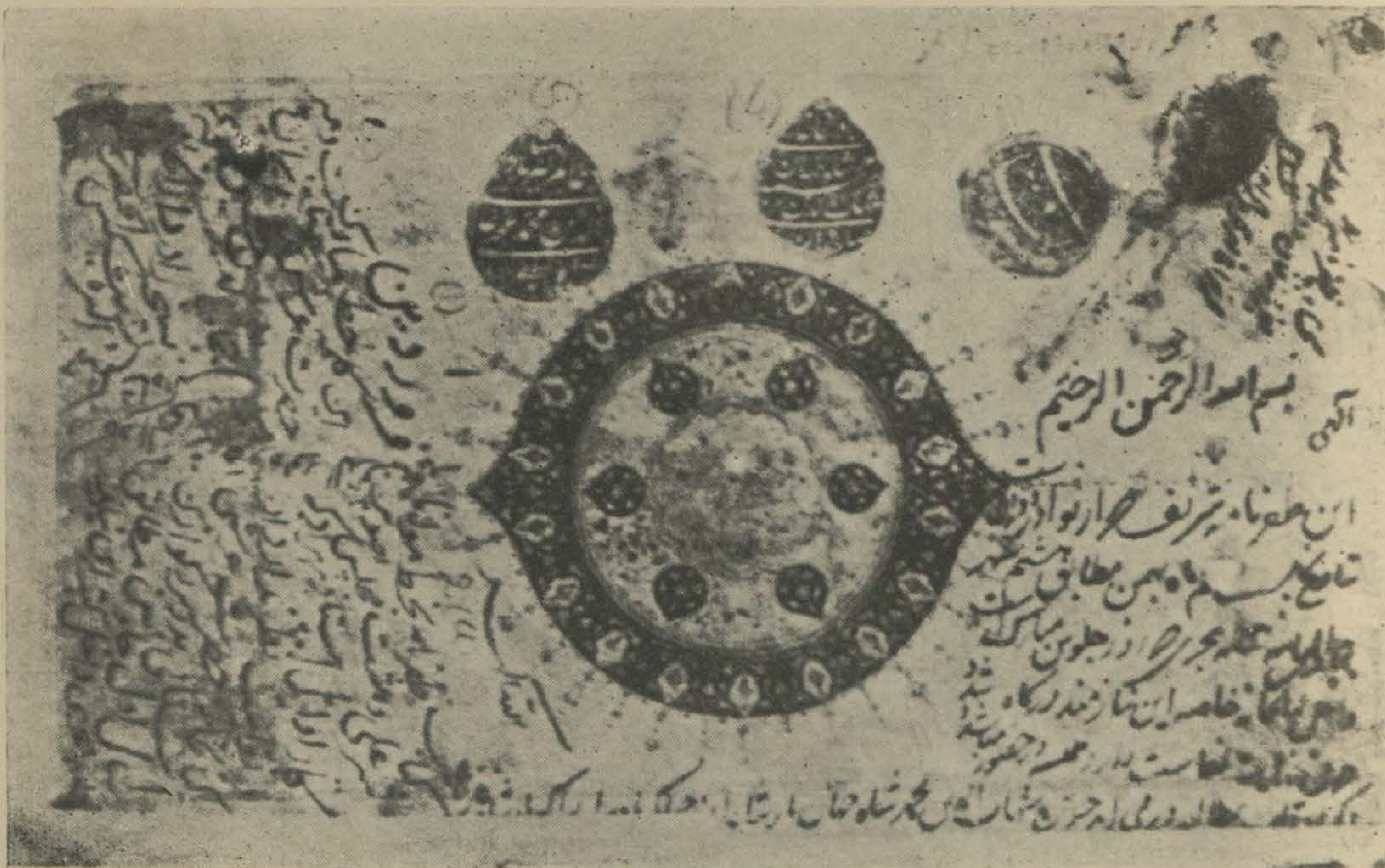
---

۱ - بلاک - صفحہ ۲۶۴ -

۲ - تعلیقے پر شاہی مہر لگانا ضروری نہ تھا ۔

۳ - آئین - صفحہ ۱۹۴ - بیورج صفحات ۲۶۰ و ۲۶۱ -

۴ - قطعات اراضی جو رفاہی اغراض کے لئے عطا کئے جاتے تھے ۔



ظفرنامے کے مسودے کا صفحہ اول مع تحریر شہنشاہان اکبر
جہانگیر و شاہ جہاں

ظفرنامے کے مسودے کا صفحہ اول اور مشہور ایرانی مصور استاد بہزاد کی تصاویر جس کو جمال الدین حسین انجو نے اکبر کی خدمت میں پیش کیا۔

۱۔ لفظ "فرور دین" جیسا کہ جہانگیر نے تصدیق کی ہے اکبر نے خود لکھا تھا۔

۲۔ (ا اور ب) تحریر جہانگیر جس میں وہ مسودے کی اہمیت، اس کی تاریخ اور اس کے مستند ہونے کے متعلق شہادت دیتا ہے۔

۳۔ شاہ جہاں کی تحریر جس میں وہ مسودے کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ مسودے کو اس کے ذاتی کتب خانے میں رکھا جائے تاکہ وقتاً فوقتاً اس کا مطالعہ کرسکے۔

۴۔ شاہ جہاں کی مہر ہے اور نمبر ۵ عالمگیر کی مہر ہے۔

یہ صفحہ ان اندراجات کی وجہ سے عدیم المثال ہے۔ *Bahzad and his Paintings in the Zafar-Nama*—Sir T. W. Arnold سے یہ تصویر لی گئی ہے۔ اصل مسٹر رابرٹ گیرٹ کے قبضے میں ہے۔

۱ - طریقۂ کار

مذکورۂ بالا نوعیت کے تقرر یا عطیہ سے متعلق ہر حکم دیوان بخشی اور صاحب توجیہ (فوجی محاسب) کی معرفت گزرتا تھا۔

تعلیقہ کس طرح فرمان شاہی کی حیثیت اختیار کرتا تھا

اس نوعیت کے احکام کے لئے جو تعلیقہ تیار کیا جاتا وہ دیوان جاگیر کے پاس بھیجا جاتا تھا جس پر جاگیر سے متعلق حسابات رکھنے کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ اگر یہ جاگیر فوجی خدمت کے لئے دی جاتی تو تعلیقہ جانچ پڑتال کے لئے بخشی کے پاس بھیج دیا جاتا تھا جو ان شرائط کی تعمیل کا ذمہ دار ہوتا تھا جو کسی جاگیر سے متعلق ہوتی تھیں۔

سر خط (تصدیق نامہ)

بخشی تعلیقہ کو اپنے پاس رکھ لیتا اور ایک تصدیق نامہ جاری کرتا تھا جسے سرخط کہتے تھے۔ اس میں ماہانہ تنخواہ کی رقم کا اندراج ہوتا اور حسب ضابطہ بخشی کے دستخط اور اس کی مہر ثبت ہوتی۔ سرخطوں کا اندراج دوسرے بخشیوں کے دفتر (رجسٹر) میں بھی کیا جاتا تھا اور اس پر ان بخشیوں کے دستخط بھی ہوتے تھے۔

بخشیوں کا جاری کردہ سر خط دیوان کے پاس بھیجا جاتا تھا جسے وہ خود اپنے پاس رکھ لیتا تھا اور اس سے وصول کی جانے والی ماہانہ و سالانہ رقوم کا حساب تیار کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔

اگر بادشاہ سرخط میں مذکور شخص کو جاگیر عطا کرنے کے متعلق اپنے حکم کی توثیق کر دیتا تو دیوان منشیوں کے نام ضروری

حکام جاری کرتا اور وہ فرمان کا مسودہ تیار کر دیتے ۔ اس کے بعد دیوان اس مسودے کا معائنہ کرتا اور اس کے اندراج کا حکم دیتا اور جب ''پیشانی[۱]'' پر ''شاھی عطیہ'' لکھ دیا جاتا تو اس پر دفتر کا نشان ثبت کیا جاتا اور دیوان ، بخشی اور محاسب دیوان کی مہریں بالترتیب لگائی جاتیں ۔ اس طرح مسودہ مکمل ہو جانے پر پھر دیوان کے پاس بغرض دستخط بھیجا جاتا ۔ اس کو تعلیقۂ تن (وثیقۂ تنخواہ) کہتے تھے ۔

یہ '' تعلیقہ تن '' صاحب توجیہ (فوجی محاسب) کے پاس بھیجدیا جاتا جو اسے اپنے پاس رکھتا اور اس کی تفصیلات فرمان پر درج کرتا ، مہر لگاتا اور اپنے دستخط کرتا تھا ۔ بعد ازیں اس کی تنقیح مستوفی (تنقیح کنندہ حسابات) کرتا ، اس پر دستخط کرتا اور مہر لگاتا تھا ۔ پھر یہ ناظر (عہدہ دار نظر ثانی) ، بخشیوں اور دیوان کے ھاتھوں سے گزرتا ھوا ان کی مہروں اور دستخطوں کے بعد وکیل (وزیراعظم) کے پاس پہنچتا اور اس پر اس کی مہر[۲] ثبت ھوتی ۔ اس طرح تیسرا اور آخری مرحلہ طے ھو جاتا ۔

مسودات پر بادشاہ کی نظر ثانی

ان فرمانوں کے مسودے بادشاہ کے حضور میں پیش کئے جاتے تھے جو مامور بکار شہزادوں ، عاملوں ، فوجداروں اور صوبوں کے دیوانوں کے نام جاری ھوتے ، یا جن کا تعلق دیگر اھم معاملات سے ھوتا ۔ بادشاہ انھیں بذات خود پڑھتا اور حسب ضرورت

---

۱ - بلاک - صفحہ ۲۶۱ -

۲ - آئین - صفحہ ۱۹۴ -

تضحیح و ترمیم کرتا ۔ اس کے بعد منشی[1] ان کی نقل تیار کرتے تھے ۔

سیور غال سے متعلق فرامین

سیور غال سے متعلق فرامین مستوفی کے دستخط ہو جانے کے بعد محکمہ امور مذہبی کو بھیج دئے جاتے تھے، جہاں ان کا اندراج دیوان سعادت کے دفتروں (رجسڑوں) میں ہوتا اور ان پر صدر کے دستخط ہوتے تھے ۔ آخر میں دیوان کل (صدر[2] دیوان) ان پر دستخط کرتا تھا ۔

نقد ادائیوں سے متعلق فرامین

اگر نقد رقم ادا کرنے سے متعلق کوئی حکم جاری ہوتا تو اس پر بھی معمولی فرمان کی طرح عمل ہوتا تھا ۔ لیکن ناظر کے دستخط کے بعد وہ دیوان بیوتات[3] کے پاس جاتا اور بخشیوں اور دیوان کے ہاتھوں سے گزر جانے کے بعد اس پر خان سامان[4] کی مہر و دستخط ثبت ہوتے ۔ وکیل کے پاس پہنچنے سے قبل وہ بیوتات کے عملے کے ہاتھوں سے گزرتا تھا ۔ ہر صورت میں ادائی کے حکم کے ساتھ تخمینۂ بر آورد بھیجا جاتا تھا ۔ اس طرح کسی مرحلے پر بھی اس کی جانچ پڑتال ہوسکتی تھی ۔

ثبتی فرمان

اس طرح جو فرمان تیار ہوتا اسے ''ثبتی فرمان'' کہتے تھے ۔

---

۱ - برھمن - جزو ۶ ب و ۷ الف - صالح - جلد اول، صفحہ ۲۷۸ -
اگر کوئی غلطی یا سہو کتابت ہوتا تو وہ نہ کوئی اعتراض کرتا نہ خفا ہوتا بلکہ خاموشی کے ساتھ تصحیح کر دیتا ۔

۲ - آئین - صفحہ ۱۹۵ -

۳ - سرکاری مال خانوں اور کارخانوں کا دیوان ۔

۴ - مرادف میر سامان ۔ تفصیل ساتویں باب میں دیکھئے ۔

اہم اور خفیہ فرمان

اہم اور خفیہ امور سے متعلق احکام پر جنھیں ہر کس و ناکس کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا اور جن میں تاخیر نا مناسب ہوتی، صرف شاہی مہر لگائی جاتی تھی۔

ایسے فرمان کو فرمان بیاضی کہتے تھے۔

اسے یوں تہہ کیا جاتا تھا کہ دونوں کنارے پیوست ہوجاتے۔ پھر اس پر کاغذ کی گرہ لگائی جاتی اور اس طرح بند کیا جاتا کہ مندرجات پر کوئی شخص نظر نہ ڈال سکتا تھا۔ اس کے بعد ایک سنہرے لفافے میں ملفوف کرکے یہ متعلقہ شخص کے پاس بھجوا دیا جاتا۔ ایسے فرمان، نوعیت و اہمیت کے لحاظ سے منصبدار یا احدی یا معمولی پیادے لے کر جایا کرتے تھے۔

مندرجہ ذیل معاملے کی تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اہم موقعوں پر پورا عملہ کتنی تیزی سے حرکت میں آجاتا تھا۔ شہزادہ خرم نے جو دکن میں سپہ سالار تھا جہانگیر کی خدمت میں عریضہ گزرانا کہ ایک فرمان اس کے مجوزہ طرز کا عادل خاں شاہ بیجاپور کے نام جاری کیا جائے۔ شاہزادے کا عریضہ تیسری شہریور کو دربار میں موصول ہوا۔ اسی دن بادشاہ کے ملاحظے میں پیش ہوا اور مسودہ تیار کرنے کے لئے حکم شاہی صادر ہوا۔ چنانچہ مسودہ تیار ہوا اور بادشاہ کے ملاحظے میں پیش ہو کر منظور ہوا، مبیضہ تیار کیا گیا، بادشاہ کے دستخط ہوئے اور دوسرے دن دکن بھیج دیا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسے یوں مہر بند کیا گیا تھا کہ تحریر نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے اس کی ایک نقل بھی اس کے ساتھ بھیجی گئی تھی تاکہ شہزادہ اسے پڑھ لے اور اصل فرمان عادل خاں کو روانہ کر دے (تا فرزند شاہ خرم نقل را ملاحظہ نمودہ اصل را روانہ سازند)۔ اس طرح سر ٹامس رو کی خواہش پر دو فرمان جو احمد آباد بھجوائے گئے تھے، دو دن میں تیار ہو گئے تھے۔[1]

ایسے فرامین جن پر شاہی مہر ضروری نہ تھی

بعض احکام (اگرچہ وہ بلحاظ اہمیت ان احکام کے مساوی ہوتے جن پر شاہی مہر ضروری ہوتی تھی) بادشاہ کی خدمت میں نہیں بھیجے جاتے تھے اور نہ ان پر شاہی مہر لگائی جاتی تھی۔ یہ احکام بیگمات اور شہزادوں کی مقررہ تنخواہوں، دیوان سعادت (محکمہ امور مذہبی) کے زیر تحویل وظیفوں، احدیوں اور شاہی کارخانہ جات کے بعض ملازمین کی ماہانہ تنخواہوں اور بارگیر کے گھوڑوں کی خوراک سے متعلقہ بھتوں کے سلسلے میں جاری کئے جاتے تھے۔[2]

مذکورۂ بالا صورتوں میں خزانچی ہر سال نئی سند طلب نہ کرتا تھا بلکہ وزرائے مملکت کی دستخط شدہ و مہر شدہ رسید لے کر تنخواہیں اور بھتے دے دیا کرتا تھا۔

---

۱ - تزک صفحہ ۱۹۲ - بارھواں سال - رو (Roe) ۱۶۱۶، صفحات ۹۴ و ۹۷ - ضروری تبدیلیوں کی وجہ سے مزید دو یوم کی تاخیر ہوئی۔

۲ - بارگیر - فوجی خدمت کے لائق شخص لیکن جس کے لئے گھوڑا رکھنا ضروری نہ تھا۔ فرائض کی بجا آوری کے وقت ایسے اشخاص کو گھوڑے فراہم کرنے کے لئے علٰحدہ اصطبل رکھا جاتا تھا۔ (آئین - صفحہ ۱۴۴)۔

مشرف (محاسب) رسید لکھتا، دیوان اسے منظور کرتا اور اس کے بعد یہ رسید مستوفی، ناظر بیوتات، دیوان کل، خان سامان اور دیوان کے مشرف کے ہاتھوں سے بھی گذرتی تھی -

احدیوں سے متعلق رسید پر احدیوں کے بخشی کے بھی دستخط ہوتے تھے -

پروانچے بادشاہ کے حضور میں اس کی مہر کے لئے پیش نہیں ہوتے تھے -

ایسے احکام کی پہلی دو سطروں کا خلاصہ تیار نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ فرمان کی پہلی دو سطروں کا کیا جاتا تھا - اس طرح نظر ڈالتے ہی دونوں میں امتیاز ہو سکتا تھا -[۱]

دیگر کاغذات جن پر شاہی مہر ضروری نہ ہوتی حسب ذیل تھے :-[۲]

(۱) سر خط (بخشی کے جاری کردہ وثیقہ جات جن میں مشاھرے کی رقم کی صراحت کر دی جاتی تھی)-

(۲) خرید و فروخت کی رسیدیں -[۳]

(۳) نرخ نامے -

(۴) عرض نامچے - (رقوم کے گوشوارے جو ممالک محروسہ کے محصل دربار کو بھیجتے تھے) -

(۵) قرار نامے -[۴]

---

۱ - تفصیل ساتویں باب میں دیکھئے -

۲ - آئین - صفحہ ۱۹۰ ان کا مقصد تاخیر سے بچنا تھا -

۳ - آئین - صفحہ ۱۹۵ - (ابتیاع نامچہ اور مبیع نامچہ) -

۴ - آئین - صفحہ ۱۹۰ - ان میں محصلوں کے ذریعے رعایا سے وصول کی ہوئی مالگزاری کی صراحت ہوتی تھی بلاک (Bloch) صفحہ ۲۶۳ -

(۶) مقاصہ ۔ (حسابات کے گوشوارے جو تحصیلدار مستوفی سے
لیتے تھے اور جن میں اس امر کی صراحت ہوتی تھی کہ
رقوم امانت مناسب طور پر خرچ کی گئی ہیں) ۔

ممکن ہے کہ تکمیل فرامین کا ضابطہ اور طریقہ ایک عام آدمی کو طویل اور پیچیدہ معلوم ہو لیکن ایسے لوگ جو مغلوں کی حکومت کے زمانے کی انتظامی باریکیوں اور ضرورتوں سے واقف ہوں اس کے فوائد کو ہرگز نظر انداز نہ کر سکیں گے ۔

اس ضابطے کی پابندی کے باعث متعلقہ محکمے کے اعلیٰ عہدہ دار اور وزیر کوئی غلط یا ناجائز اقدام نہ کر سکتے تھے۔ کسی حکم کو آخری مرحلے تک پہنچانے کا ذمہ دار اور مجاز صرف وہی محکمہ نہ ہوتا تھا جو اپنے کسی معاملے کی ابتدائی کارروائی کے کاغذات آگے بڑھاتا تھا بلکہ اس کارروائی کی جانچ پرتال یا اس پر تنقید ان اعلیٰ عہدہ داروں میں سے جن کے ہاتھوں سے متعلقہ کاغذات مختلف مراحل میں گزرتے تھے کوئی بھی کر سکتا تھا ۔

اگرچہ دیوانی اور فوجی محکمے جدا جدا تھے لیکن جہاں تک مملکت کے منصبداروں اور عہدہ داروں کے تقررات اور ان کی تنخواہوں کے ادا ہونے کا تعلق تھا ، اس طریق کار کے باعث دونوں محکمے کچھ اس طرح باہم گھل مل گئے تھے کہ ایک کو دوسرے کے مقابلے میں نہ کوئی فضیلت ہی حاصل رہی تھی، نہ کسی قسم کی بے جا اہمیت ۔

اس طریق کار نے ایسے جعل و فریب کا امکان بھی مٹا دیا تھا جو نسبۃً کم بیدار مغز شخصی حکومتوں میں غیر متوقع نہیں ہوتا ۔

وزراء کے دفتر سے شاھی مہر کو الگ رکھنے اور فرامین پر زنانخانے میں مہر ثبت کرنے کا رواج خود سازش اور جعل کے خلاف تحفظ کی ضمانت تھا اور ابوالفضل کا یہ خیال درست معلوم ھوتا ھے کہ ''اعلیٰ حضرت کا مقصد یہ ھے کہ فرائض منصبی بہ طریق مناسب ادا ھوں۔ کسی محکمے میں ناحق کمی یا زیادتی نہ ھونے پائے۔ بد دیانت لوگ علحٰدہ کر دئے جائیں اور دیانت دار لوگوں کی قدر افزائی ھو، کام کرنے والے ملازم نڈر ھو کر کام کر سکیں اور تساھل پسند، غفلت شعار ملازموں پر کڑی نگرانی رھے''۔[1] ان تمام مقاصد کی تکمیل اس طریق کار کے اختیار کرنے سے ھو جاتی تھی جس کی شرح اوپر درج کی گئی ھے۔

۲ - مہر شاھی

پانچ قسم کی مہریں

''آئین'' کے مطابق مختلف اغراض کے لئے استعمال ھونے والی مہریں پانچ قسم کی تھیں:

۱ - چھوٹی گول مہر، جس کا چغتائی نام ''ازک''[2] تھا۔ وہ فرمان ثبتی پر لگائی جاتی تھی، جو خطابات، اعلیٰ

---

۱ - آئین - صفحہ ۱۹۳ - بلاک مین (Blochmann) صفحہ ۲۰۹ - مانسریٹ (صفحہ ۲۰۹) لکھتا ھے کہ وزیر کے ھاں سے مسودہ موصول ھونے کے آٹھ دن بعد اس پر شاھی مہر ثبت کی جاتی تھی۔ ''آٹھ دن کے اس عرصے میں خفیہ مشیر اور خود بادشاہ انتہائی احتیاط کے ساتھ ھر دستاویز کی جانچ پڑتال کرتا تھا تاکہ غلطی اور جعل کا سد باب ھو سکے۔ اس کارروائی میں مزید احتیاط اس وقت برتی جاتی تھی جب کوئی شخص انعام و اکرام اور مراعات خسروی سے نوازا جاتا۔''

۲ - اسے اوزک بھی لکھتے ھیں۔

تقررات ، جاگیرات اور بڑی بڑی رقموں کی منظوری سے متعلق ہوتا تھا -

۲ - ایک بڑی مہر ، جس میں بادشاہ کا نام اور تیمور تک اس کے آبا و اجداد کے نام کندہ تھے - یہ مہر ان مراسلات پر لگائی جاتی تھی جو دیگر سلاطین کے نام بھیجے جاتے تھے - بعد میں یہ مہر سبھی اغراض کے لیے استعمال ہونے لگی -

۳ - ثبتی فرمان کے علاوہ دیگر فرامین پر ایک مربع مہر ثبت کی جاتی تھی -

۴ - عدالتی کارروائیوں میں ایک محرابی وضع کی مہر استعمال ہوتی تھی جس میں بادشاہ کے نام کے گرد یہ شعر کندہ تھا -

راستی موجب رضائے خداست کس ندیدم که گم شد از رہ راست

۵ - شعبۂ خواتین سے متعلقہ جملہ امور کے لیے ایک خاص مہر استعمال کی جاتی تھی -

اُزُک کی تحویلداری

مہروں میں سب سے اہم اُزُک تھی - مسودات فرامین کی تیاری کے سلسلے میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ملتا ہے - یہ مہر عموماً معتمد ترین شخص کی تحویل میں رکھی جاتی تھی اور بالعموم وکیل (وزیر اعظم) یا دیوان (وزیر) کی تحویل میں نہیں رکھی جاتی تھی - ابوالفضل نے ان مہروں کی اہمیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اس کے آقا کے طویل دور حکومت میں شاہی مہر کس شخص یا کن اشخاص کی تحویل میں رہتی تھی - خواجہ جہاں کی معزولی کے سلسلے میں جو اکبر کے عہد حکومت کے گیارھویں سال عمل میں آئی تھی ، محض ضمنی طور

پر ایک حوالے سے یہ پتا چلا ہے کہ بیرم خاں کے زوال کے بعد اکبر کی حکومت کے ابتدائی دور میں، شاہی مہر خواجہ جہاں کی تحویل میں رہتی تھی۔

پادری مانسریٹ جو ۱۵۸۱ء اور ۱۵۸۲ء میں کابل کی مہم میں اکبر کے ساتھ تھا، بیان کرتا ہے کہ وزیر کے پاس سے فرامین موصول ہونے کے آٹھ دن بعد ''وہ بیگم ان پر مہر لگاتی ہے جس کی تحویل میں خاص مہر شاہی اور سلطنت کی بڑی مہر رہتی ہے''۔

اس بیان سے انتظام کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ جو مہر خواجہ جہاں کی تحویل میں رہتی تھی اس کے لیے الفاظ ''مہر مقدس کلاں''[1] (بڑی مہر) استعمال کیے گئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ بادشاہ کی خاص چھوٹی مہر (از ک) بیگم[2] کی تحوبل میں اور مہر کلاں خواجہ کی تحویل میں رہتی تھی اور خواجہ کی معزولی کے بعد یہ مہر کلاں بھی کسی بیگم کی تحویل میں دے دی گئی تھی۔ عہد حکومت کے اختتام کے قریب یعنی چالیسویں سال جب خان اعظم مرزا عزیز کوکہ وکیل کے عہدے پر فائز ہوا تو مہر کلاں[3] اس کی تحویل میں دے دی گئی اور چونکہ وہ اکبر کی وفات تک وکیل کے عہدے پر فائز رہا، ضرور ہے کہ مہر کلاں بھی اسی کی تحویل میں رہی ہوگی۔

---

۱ - اکبر نامہ جلد دوم - صفحہ ۲۷۰ - سال یازدہم -

۲ - مانسریٹ - صفحہ ۲۰۹ -

۳ - ماثرالامرا - جلد اول - صفحہ ۶۸۵ - مصنف کا بیان ہے کہ اس پر عبارت مولانا علی احمد نے کندہ کی تھی لیکن ابتداءً مولانا مقصود نے اس پر عبارت کندہ کی تھی اور بعد میں مولانا علی احمد نے اسے بہتر بنایا تھا (آئین - صفحہ ۴۶)۔

جہانگیر کے عہد حکومت میں بھی ان مہروں کے انتظام کا ذکر کہیں مفصل نہیں ملتا۔ تزک میں صرف ایک جگہ کچھ ذکر ہے جس کا تعلق حکومت کے پہلے سال سے ہے، ''میں نے اپنی شاہزادگی کے زمانے میں بطور احتیاط اپنی مہر خاص (ازک) امیرالامرا (شریف) کی تحویل میں رکھ دی تھی لیکن جب وہ صوبۂ بہار بھیج دیا گیا تو میں نے ''ازک'' پرویز کے حوالے کردی اور جب پرویز رانا کے خلاف مہم پر بھیج دیا گیا تو حسب انتظام سابق میں نے وہ مہر پھر امیرالامراء کے سپرد کر دی''۔[1]

سر ٹامس رو ۱۶۱۶ء میں فرامین کے سلسلے میں شاہزادہ خرم کے اثر کا ذکر تو کرتا ہے مگر مہر کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا۔ جہانگیر کے عہد حکومت کے خاتمے کے قریب جب وہ مہابت خاں کی حراست میں تھا ایک جگہ مذکور ہے کہ اس نے اپنی انگشتری اس پیغام کے ساتھ آصف خاں کے پاس بھیجی کہ وہ مہابت خاں پر حملہ نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں وہ مہر کرنے والی انگشتری (ازک) نہ تھی۔ یقیناً اس کی کوئی ذاتی انگشتری ہوگی۔[2]

شاہ جہاں کے دور حکومت میں مہروں کا بیان اس قسم کے دیگر انتظامات کے بیان کی طرح مفصل ملتا ہے۔ پہلے وہ ملکۂ ممتاز محل کی تحویل میں رہتی تھی، لیکن بادشاہ کی تاجپوشی کے بعد خود ملکۂ مذکور کی استدعا پر وہ آصف خاں کے حوالے کر دی گئی۔ جب

۱۔ تزک۔ صفحہ ۸۔ سال اول۔ روجرز۔ صفحہ ۱۸ (ترجمہ پوری طرح اصل کے مطابق نہیں ہے)۔ رو (Roe) ص ۹۷۔

۲۔ تزک۔ صفحہ ۴۰۴ اکیسواں سال۔ عبارت میں الفاظ ''انگشتری مبارک'' استعمال کیے گئے ہیں۔

حکومت کے دوسرے سال آصف خاں دکن بھیج دیا گیا تو مہر مذکور پھر ملکہ کی تحویل میں آ گئی لیکن دکن سے واپس آنے پر وہ پھر آصف خاں کی تحویل میں رکھ دی گئی - جب ملکہ کے انتقال کے بعد وہ دوبارہ دکن گیا تو مہر مذکور بیگم صاحب (چہیتی بیٹی) کے سپرد کی گئی - اس کے بعد یہ مہر اور فرامین سلطانی پر اسے ثبت کرنے کی خدمت آخر تک شہزادی ھی کی سپرد رھی -[1]

مذکورۂ بالا بیان سے ثابت ہوتا ھے کہ مہر ازک بالعموم حرم سرائے سلطانی ھی میں رھتی تھی - یہ ملکۂ ممتاز محل پر خاص عنایت تھی کہ چند روز کے لیے یہ اس کے باپ آصف خاں کے سپرد کر دی گئی جو اتفاق سے اس وقت سلطنت کا وزیر اعظم بھی تھا -

فرامین میں امتیازی نشانات کا استعمال

شاھی فرامین اور خطوط کے مطالعے سے واضح ہوتا ھے کہ ان فرامین کی تیاری کا طریقہ بہت دلچسپ تھا جو شاھان مغلیہ ایسے اشخاص کے نام ، جنھیں وہ ذاتی طور پر جانتے تھے ، یا والیان ریاست اور جاگیرداروں کے نام ، جاری کیا کرتے تھے - فرمان پر حسب معمول شاھی مہروں میں سے کوئی ایک مہر موضوع فرمان کی نوعیت کو ملحوظ رکھ کر لگائی جاتی تھی اور وہ فرمان کی پیشانی پر ھوتی تھی جس کے نیچے متن شروع ھوتا تھا - رفتہ رفتہ روایت کے طور پر تین امتیازی نشانات استعمال ھونے لگے - ان نشانات کا استعمال بادشاہ لوگوں کے حسب حیثیت اور حسب استحقاق نوازش خسروانہ کرتا اور اس طرح انھیں سر فراز کیا کرتا تھا -

اول - سرکاری مہر کے علاوہ اپنے دستخط ثبت کر کے -

---

۱ - لاھوری - جلد اول - صفحہ ۳۰۶ -

دوم - پیشانی پر ایک دو سطر میں اپنے قلم سے اضافہ کر کے - شاہ جہاں نے مزید یہ کیا کہ بعض اوقات وہ پورا فرمان ہی اپنے قلم سے لکھ ڈالتا تھا اور اظہار نوازش خسروانہ کے علاوہ دیگر اہم معاملات میں بھی وہ اسی طریق پر کار بند تھا -

سوم - فرمان پر اپنے ''پنجۂ مبارک'' کا نشان چھاپ کر -

سرکاری مہر بہر حال اپنی مقررہ جگہ ہی پر لگائی جاتی تھی -

عبدالرحیم خان خاناں کے نام ایک فرمان میں اکبر نے اپنے دستخط کیے ہیں اور اسے فرزند کہہ کر مخاطب کیا ہے اور طغرے کے اوپر الفاظ ''عبدالرحیم فرزند بداند'' لکھے ہیں -[1]

جہانگیر نے بھی اپنے منظور نظر عہدہ دار مقرب خاں کو بہار کا حاکم مقرر کرتے وقت اسی قسم کا فرمان بھیجا تھا[2] اور بارھویں سال اس نے عادل خاں، شاہ بیجا پور، کو شہزادہ خرم کے کہنے پر اسی قسم کا ایک فرمان بھیجا تھا جس میں اسے ''فرزند'' کہہ کر مخاطب کیا تھا اور فرمان کی پیشانی پر اپنے قلم سے یہ شعر بھی لکھدیا تھا :

شدی از التماس شاہ خرم　　به فرزندیٔ ما مشہور عالم[3]

چودھویں سال جب خان عالم سفارت ایران سے واپس دربار آرہا تھا تو اس کے استقبال کے لیے جہانگیر روزانہ ایک خادم بھیجتا اور ہر بار فرمان کی پیشانی پر ایک شعر لکھ کر اس کی عزت افزائی کیا کرتا تھا - (چنانچہ تزک میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ) ''ایک بار میں نے اسے کچھ عطر جہانگیری (عطر گلاب) بھیجا اور فی البدیہ یہ شعر لکھا :-

---

۱ - مآثر رحیمی - جلد دوم - صفحہ ۱۱۳ -

۲ - تزک - ص ۲۴۴ - تیرھواں سال -

۳ - تزک - صفحہ ۱۹۲ - روجرز صفحہ ۳۸۸ -

به سویت فرستاده ام بوئے خویش
که آرم ترا زود تر سوئے خویش''[۱]

اهم مواقع پر پورا فرمان وہ خود لکھتا تھا ۔ اس نے شہزادہ خرم کے نام رانا پر فتح حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک محبت بھرا خط لکھا تھا[۲] اور سترھویں سال اس نے شہزادہ پرویز کے نام خود فرمان لکھا تھا جب اس نے پرویز کو شہزادہ خرم کی بغاوت کے سلسلے میں فوری طور پر طلب کیا تھا۔[۳] اسی طرح بیسویں سال شہزادہ خرم کو، بدوران بغاوت ، اس کے عریضے کے جواب میں[۴] اور اٹھارھویں سال ایک فرمان مہابت خاں کی استدعا پر عادل خاں کے نام بھی بھیجا تھا۔[۵]

شاہ جہاں کے دور حکومت میں ایسی مثالیں بہت ملتی ھیں کیونکہ وہ عموماً ھر اھم فرمان پر ایک دو سطریں بڑھا دیتا تھا یا پورا فرمان ھی اپنے قلم سے لکھ ڈالتا تھا ۔[۶] اپنے دور حکومت کے پہلے سال اس نے دو فرمان آصف خاں کے نام[۷] جبکہ وہ لاھور میں تھا لکھے اور چھٹے سال ایک فرمان مہابت خاں کے نام بھی لکھا تھا ۔[۸]

مظفر خاں نے جو شاہ جہاں کے سپہ سالاروں میں تھا ، اپنے مجموعۂ خطوط میں ، اپنے نام کے متعدد فرمانون کی نقلیں شامل کی ھیں ۔

---

۱ - تزک ۔ صفحہ ۲۸۴ - روجرز ۔ جلد دوم ۔ صفحہ ۱۱۵ -
۲ - لاھوری ۔ جلد اول ۔ صفحات ۱۴۱ و ۱۴۲ -
۳ - تزک ۔ صفحہ ۳۵۲ - ۴ - مذکورۂ بالا کتاب صفحہ ۳۹۷ -
۵ - مذکورۂ بالا کتاب ۔ صفحہ ۳۷۷ -
۶ - صالح ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۲۵۴ -
۷ - لاھوری ۔ جلد اول ۔ صفحات ۱۱۳ تا ۱۱۵ -
اور تزک ۔ صفحہ ۴۲۵ -
۸ - لاھوری ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۵۱۶ -

ان میں سے دو فرمان شروع سے آخر تک بادشاہ کے قلم خاص سے تحریر کیے گئے تھے۔[۱] دوسرے دو فرمانوں کے طغرے[۲] بھی خود بادشاہ کے تحریر کردہ ھیں اور ایک فرمان پر اس کے دستخط ھیں۔[۳]

پنجۂ شاھی کا نشان سب سے اعلیٰ امتیاز تھا لیکن مجھے کوئی ایسی مثال نہیں ملی جس میں کسی شاھی ملازم کے نام مجریہ فرمان پر یہ نشان بنایا گیا ہو، نہ اکبر کے دور میں اس کے استعمال کی کوئی مثال ملتی ھے۔ لیکن جہانگیر اور شاہ جہان کے دور کی کارروائیوں میں ایسے اشارے ملتے ھیں جن سے ثابت ہوتا ھے کہ ان سے قبل یہ نشان استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا مزید ثبوت تزک جہانگیری میں مذکور اس واقعے سے ملتا ھے کہ دولت آباد کے پرگنے میں موضع شیخوپور کے ایک درخت کے تنے پر اکبر کے پنجے کا نشان کندہ کیا گیا تھا۔ جہانگیر نے اس کی ایک نقل اپنے پنجے کے نشان کے ساتھ سنگ مرمر کی ایک تختی پر کندہ کرا کر اسی جگہ نصب کرا دی تھی۔[۴]

عہد جہانگیر کے نویں سال اودے پور کے رانا نے شہزادہ خرم کے ھاتھوں شکست کھانے کے بعد معاھدے کے وقت بطور

---

۱ - م-ض ۱۶۸۵۹ ، جزو ۳ ، جزو ۲۲ ب (از اول تاآخر بقلم خاص مبارک)
۲ - مسودہ مذکور ، جزو ۱۶ ب -
۳ - مسودہ مذکور ، جزو ۷ ب -
۴ - تزک - صفحہ ۱۷۸ - روجرز ، صفحہ ۳۶۰ - جس وقت میرے والد محترم اس (درخت) کے پاس سے گزرے تو انھوں نے اپنے پنجے کا ایک نشان اس پر بطور نشانی زمین سے ۳¾ گز کی بلندی پر بنا دیا - میں نے بھی حکم دیا کہ میرے پنجے کا ایک نشان دوسری جڑ پر زمین سے ۸ گز کی بلندی پر کندہ کیا جائے (درخت بہت بڑا تھا اس کی کئی جڑیں تھیں) - مرور زمانہ سے محفوظ رکھنے کے لیے دونوں نشانات کو سنگ مرمر کی ایک تختی پر کندہ کیا گیا - پھر اس تختی کو درخت کے تنے میں نصب کر دیا گیا (اور درخت کے چاروں طرف ایک چبوترا بنا دیا گیا) -

شرط شاہی پنجے کا مطالبہ کیا اور اس کی یہ شرط پوری کی گئی۔[۱]

شاہ جہاں نے عادل خان، شاہ بیجا پور کو خود بطور اعزاز اس صورت میں اس کی پیش کش کی کہ وہ پیش کردہ معاہدے کی تمام شرطیں پوری کر دے۔ چنانچہ نشان پنجہ عطا ہوا اور عادل خاں کی درخواست پر فرمان کا خلاصہ جس میں معاہدے کی شرائط درج تھیں سونے کی ایک تختی پر کندہ کیا گیا جو بطور نوازش خصوصی عادل خاں کے پاس بھیج دی گئی۔[۲]

مظفر خاں نے بھی ایک خط میں درخواست کی ہے کہ جگت سنگھ کو جس کے خلاف وہ برسر پیکار تھا، پنجۂ مبارک بھیجا جائے۔ ''اگرچہ فرمان شاہی بھی کافی ہے تاہم بطور برکت‌وسرفرازی، اس کے لیے پنجۂ خاص شہنشاہی بھی ضروری ہے''۔[۳]

ایک فرمان پر شاہ جہاں کے پنجے کا چربہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ فرامین پر طغرا[۴] بائیں طرف، مہر دائیں طرف اور پنجے کا نشان حاشیے پر مہر کے نیچے ہوا کرتا تھا۔[۵]

---

۱ - تزک صفحہ ۱۳۴ -

۲ - لاہوری - جلد اول، صفحہ ۱۲۴ جلد دوم، صفحات ۲۰۳ و ۲۰۴ -

۳ - م - ض ۱۶۸۵۹ - جزو ۲۰ - غالباً یہ ذکر اس مہم سے متعلق ہے جو دور حکومت کے پندرھویں سال قلعۂ تارا گڑھ واقع کانگڑہ (پنجاب) بھیجی گئی تھی لیکن لاہوری پنجے کا ذکر نہیں کرتا - اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اسے نشان پنجہ دیا گیا تھا یا نہیں (لاہوری، جلد دوم- صفحات ۲۸۵ - ۲۹۱ - اطاعت قبول کرنے کی شرط کے طور پر)

۴ - شاہ جہاں کے طغرے میں یہ الفاظ تھے، ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی، اور یہی الفاظ منسلکہ فرمان کے بالائی طغرے میں تحریر ہیں۔

۵ - منسلکہ چربہ مسز ہاول (Mrs. Havel) کی اجازت سے ای-بی-ہاول (E. B. Havel) آنجہانی کی کتاب ''آگرہ اور تاج'' میں دی ہوئی پلیٹ نمبر ۲ صفحہ ۱۰ سے نقل کیا گیا ہے۔



ایک سرکاری دستاویز مع دستخط اور مہر شاہ جہاں

اصل فرمان سیدھور (بہار) کے راجہ کے قبضے میں ہے جس سے مسٹر ہیول نے نقل حاصل کی ہے ۔ اس تصویر سے تسوید فرامین کے متعلق بہت سے نقاط کی توثیق ہوتی ہے مثلاً پنجہ ، مہر از کے کا مقام ، طغرا اور متن کی پہلی دو مختصر شدہ سطور ۔

حصه دوم

باب چہارم
وزراء
خاکہ

نظری : مسلم فقہا کے نظریات۔
الماوردی : محدود اور غیر محدود اختیارات کی وزارت۔
مملکت میں وزیر کا مقام بر اساس :—

۱ - الماوردی۔
۲ - آداب الوزارت۔
۳ - سیاست نامہ۔
۴ - نصائحؑ نظام الملک بفرزند خود (مسودہ)۔
۵ - آثار الوزراء (ایک مسودہ جس میں مختلف مملکتوں کے مشہور مسلم وزیروں کے نظریے درج ھیں)۔

عہدہ وزارت پر غیر مسلموں کا تقرر۔ عموماً نظری طور پر پسند نہیں کیا گیا۔

سلاطین دھلی کے ھاں وزارت کا منصب۔ اس کے تین مدارج۔

۱ - فوجی اور دیوانی اختیارات کا اجتماع۔
۲ - فوجی اختیارات کی علحدگی۔ وزراء کو پس پشت ڈال دیا گیا۔
۳ - وزیر کے وقار کی بحالی لیکن فوج علحدہ رہی۔

بیرم خاں کی وکالت۔
انتظامی نقطۂ نگاہ سے بے نظیر حیثیت۔ الماوردی کے درجہ اول

کے وزیر سے زیادہ اختیارات ۔ اکبر کے عہد حکومت میں وکالت کے اختیارات کی تعین ۔

تمام اختیارات ایک ہی وزیر کو سونپ دینے کے خلاف حکمت عملی ۔ ابتدائی اقدامات ۔ اتکہ خاں کی وکالت ۔

منعم کا تقرر منصب وکالت پر ۔ وزیر کی قوت متزلزل ہو گئی ۔

منصب دیوان کی تخلیق اور وکالت سے سیاسی اور مالی اختیارات کی علحدگی ۔

مظفر کے تحت دیوان کے اختیارات کی تعین ۔

منعم کا تبادلہ اور اس کی وکالت پر تبصرہ ۔ وکیل کی حیثیت میں تبدیلی کی مستقل وضاحت ۔ مظفر کی وکالت ۔

عبدالرحیم خان خاناں اور مرزا عزیز کوکہ کی وکالت ۔

جہانگیر کے وکیل : امیرالامراء شریف ، آصف خاں قزوینی اور آصف خاں ابوالحسن ۔

شاہ جہاں کے عہد میں آصف خاں کا برقرار رہنا ۔ عہد شاہ جہانی کا پہلا اور آخری وکیل ۔

وکیل کا انصرام کار ۔ آغاز عہد اکبری میں اس کا کام دیوان میں ۔

بعد ازاں وکیل کے پاس ذمہ داری کا کوئی کام نہ رہا ۔ عہدہ برائے اعزاز و نمائش ۔

دیوان کے سامنے وکلاء کے اثر کا ماند پڑ جانا ۔

وکالت ۔ منصب عز و جاہ مگر اختیارات ختم ۔

وکلاء سلطنت کی فہرست ۔

شخصی بادشاہی میں بھی ، دیگر طرز کی حکومتوں کی طرح ، متعدد دانشمندوں کی مدد کی ضرورت رہتی ہے - جولیس سیزر اور نپولین جیسے اشخاص بھی جو غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے ، مسائل مملکت کو تنہا حل نہ کر سکے - شمالی ہندوستان میں بلبن اور علاؤالدین جیسے سلاطین جو تمام اختیارات کو ایک ہی شخص کے ہاتھ میں مرکوز کرنے کے قائل تھے اور سلطنت کا پورا نظم و نسق خود سنبھالتے تھے ، وزراء کی ضرورت محسوس کرنے اور اور انھیں بہ نظر احترام دیکھنے پر مجبور رہے - شخصی حکومت کی بھی ہر قسم میں وزیروں یا مشیروں کی ایک نہ ایک جماعت لازم ہو جاتی ہے -

شمالی ہند کی ہندو مملکت میں آٹھ اشخاص کی ایک جماعت ہوتی تھی جو اس دور کے سیاسی مفکرین کی رائے میں حکومت کے لازمی جزو کی حیثیت رکھتی تھی - ''وزیر کی مدد کے بغیر کوئی بادشاہ تین دن بھی حکومت نہیں کر سکتا'' -[۱] ہند کے دور قدماء کی '' مجلس ہشت گانہ'' شخصی حکومت کے زمانے میں بھی قائم رہی - کوتلیا کے خیال کے مطابق یہ مجلس وزراء ہی پر مشتمل ہونی چاہیے تھی اور بوقت ضرورت ''دانش مندوں'' سے مشورہ کیا جا سکتا تھا - ''ارکان کی تعداد میں اصول و عمل دونوں کے لحاظ سے اختلاف تھا - غالباً تجربے کی بنا پر منو کی یہ رائے تھی کہ ارکان کی تعداد ۱۲ ہونی چاہیے - برھاسپتی (Brihaspati) کی رائے میں ۱۶ اور اسواناس (Usvanas) کے خیال میں یہ تعداد ۲۰ ہونی چاہیے تھی -

۱ - شانتی پرون - دیکھیے بینی پرشاد کی کتاب Theory of Government in Ancient India — صفحہ ۳۷ -

ان کے جانشین کوتلیا نے فیصلہ کیا کہ مجلس کے ارکان کی تعداد کا انحصار سلطنت کی ضروریات پر ہونا چاہیے - عام طور پر ارکان کی تعداد کم سے کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ بیس تک رہی"۔[۱] یہ مجلس قطعاً مشاورتی تھی اور بادشاہ اور وزیر اعظم کے ماتحت کام کرتی تھی - ڈاکٹر بینی پرشاد کے الفاظ میں وزیر اعظم، "نارمنوں کے اینجیوین چانسلر، (Norman Angevin Chancellor)' ترکوں کے گرینڈ وزیر (Grand Vizier) اور سب سے زیادہ شاہان مغلیۂ ہند کے 'وکیل' کے مانند تھا" ۔[۲]

وزیر

مسلمان بادشاہوں میں وزراء کی مجلس یا جماعت کے لیے لفظ "وزارت" استعمال کیا جاتا تھا - لیکن ان کے نزدیک وزارت کا مفہوم ابتداءً صرف ایک وزیر تک محدود رہا اور مسلم فقہا نے اس مسئلے کے متعلق زیادہ تر اسی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے - الفخری کے الفاظ میں "وزیر، بادشاہ اور رعایا کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے - لہذا اس کا مزاج بادشاہ اور عوام دونوں کے خصائص کا مجموعہ ہونا چاہیے تاکہ وہ دونوں کا محبوب و مطلوب بن سکے"۔ "لغت نویس کہتے ہیں کہ وِزر کے معنی 'جائے پناہ' یا 'مقام امن' اور وَزر کے معنی 'بار' ہیں - لہذا لفظ 'وزیر' یا تو 'وَزر' سے مشتق ہے یا 'وزر' سے - پہلی صورت میں اس کے معنے ہوئے 'حکومت کا بار اٹھانے والا' اور دوسری صورت میں 'وہ جس کے مشورے اور فیصلے کا بادشاہ سہارا لیتا ہو" ۔[۳]

---

۱ - بینی پرشاد - تھیوری (Theory) صفحہ ۱۲۵ -

۲ - بینی پرشاد - تھیوری (Theory) صفحہ ۱۲۷ -

۳ - براؤن - لٹریری ہسٹری- جلد اول - صفحہ ۲۵۶ ، مطبوعہ ۱۹۰۹ء
ابن خلدون ، ترجمہ ، صفحہ ۹۷ -

اس کا درجہ

مسلم فقہا بالخصوص الماوردی وزارت کی دو قسمیں بتاتے ھیں۔ (الف) غیر محدود وزارت اور (ب) محدود وزارت۔[1] غیر محدود اختیارات رکھنے والا وزیر جو عموماً وزیر اعظم (Grand Vizier) کہلاتا تھا ''خلیفہ کا 'میر سامان' اور اس کا ''ھمزاد'' ھوتا تھا۔ وہ تمام شاھی اختیارات استعمال کرتا تھا۔ صرف اس قدر ضروری تھا کہ وہ اپنی کارروائیوں سے بادشاہ کو مطلع رکھے۔ اسے خلیفہ کے نام پر عہدہ داروں کے تقرر کا اختیار حاصل تھا۔ وہ آخری عدالت مرافعہ کی طرح خود تمام مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا، لیکن وہ اپنا نمائندہ یا جانشین مقرر کرنے کا مجاز نہ تھا، نہ اسے خلیفہ کے مقرر کردہ کسی عہدہ دار کے عزل یا تبادلے ھی کا اختیار تھا۔

محدود وزارت کی صورت میں وزیر اس قدر وسیع الاختیار نہ تھا۔ وہ اپنے اختیار سے کوئی کام نہ کر سکتا تھا اور صرف احکام شاھی کی تعمیل کرتا تھا۔ ''وہ بادشاہ اور رعایا کے درمیان محض ایک واسطہ تھا''۔ لیکن خلیفہ کی خدمت میں اس کا ھر وقت موجود رھنا، تمام احکام کا اس کے ھاتھوں سے گزرنا اور اس کے مہر و دستخط سے ان کا سرکاری حیثیت اختیار کرنا ایسے امور تھے جن کے باعث مملکت میں اسے کافی اھمیت حاصل رھتی تھی۔ فان کریمر (Von Kremer) کی رائے میں وزارت محدود ''اس ادارے کی ابتدائی صورت تھی اور محض اقتدار خلافت کے روز افزوں انحطاط و زوال کے باعث غیر محدود اختیارات رکھنے والے وزیر کا عہدہ عالم وجود میں آیا تھا۔ جوں جوں خلافت بغداد کی حالت بد سے بد تر ھوتی

---

۱ - الماوردی۔ ترجمہ بزبان فرانسیسی صفحہ ۱۹۷ Vézirat de délégation et vezirat dé execution.

گئی ، حصول جاہ و اقتدار کی کشمکش بھی نئی نئی صورتیں اختیار کرتی گئی"۔[۱]

تعداد وزراء

عرب فقہا غیر محدود اختیارات رکھنے والے متعدد وزراء کے تقرر کے حق میں نہیں ہیں لیکن اس صورت میں کہ حدود سلطنت بہت وسیع ہوں یا کام کی زیادتی ہو وہ اسے جائز سمجھتے ہیں بشرطیکہ سب وزراء کے فرائض و اختیارات بالوضاحت بیان کر دئے جائیں یا وہ سب اجتماعی طور پر ایک انتظامی وحدت کی حیثیت سے کام کریں ۔[۲]

مندرجۂ بالا بیان کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصولاً فقہا اس امر کے حق میں ہیں کہ مطلق الاقتدار بادشاہ کی مدد کے لیے ایک طاقتور وزیر ہو اور دوسرے عہدہ دار اس کے حسب ہدایت اس کی نگرانی میں مختلف محکموں کے اعلیٰ حکام کی حیثیت سے کام کریں ۔ اس نظام میں نظم و نسق کی مساوی ذمہ داری رکھنے والے ایک سے زیادہ ہم رتبہ وزراء کی گنجائش ہی نہیں رہتی ۔

یہ قول ماہون[۳] سے منسوب ہے کہ حکومت کے چار اہم ترین ارکان حسب ذیل ہیں :

(۱) ایک واجب الاحترام قاضی
(۲) ایک حق شناس کوتوال[۴]

---

۱ - کریمر (Kremer) کی کتاب The Orient under the Caliphs کا ترجمہ ۔ صفحہ ۲۲٦ ۔ الماوردی کی کتاب کا فرانسیسی ترجمہ ۔ صفحہ ۱۹۸ ۔ سلوک الملوک ۔ برٹش میوزیم ۔ م ش ۲۵۳ ۔ جزو ۱۷ ۔ ۱۸ ۔

۲ - کریمر ۔ ترجمہ ۔ ۲۲۵ ۔ الماوردی فرانسیسی ترجمہ ۔ صفحہ ۲۲۱ ۔

۳ - الماوردی ۔ فرانسیسی ترجمہ ۔ صفحہ ۱۹۹ ۔

۴ - صاحب الشرطہ ، شاہی حفاظتی دستے کا کمان دار ۔ بعد میں ایک اہم مصاحب ۔ (ابن اثیر اور ابن خلدون ۔ دیکھیے کریمر ۔ صفحہ ۲۲٦)۔

(۳) ایک ماہر کاروباری وزیر مالیات

(۴) ایک معتمد صاحب برید یعنی پوسٹ ماسٹر۔

مملکت میں وزیر کا مقام

وزیر اعظم کے اختیارات کی طرح اسکی ذمہ داریاں بھی وسیع ہوتی تھیں جن کی وجہ سے اس کے منصب کی نوعیت بہت نازک ہو جاتی تھی - اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ نظم و نسق کے مختلف شعبوں کے متعلق فنی معلومات بھی رکھتا ہو اور آداب و آئین دربار سے کما حقہ واقف ہو۔[1]

آداب الوزارت کا مصنف لکھتا ہے کہ وزیر مملکت میں دوسرا بادشاہ ہوتا ہے ، بلکہ اس کے فرائض بادشاہ کے فرائض سے زیادہ مشکل ہیں۔ بادشاہ کا جاہ و جلال ایک حجاب کے مثل ہوتا ہے۔

قانون نامہ ، ترکوں کے بنیادی قوانین' میں وزیر ، قاضی عسکر' وزیرمالیات (دفتردار) اور معتمد (نشانجی) حکومت کے چار ستون بتائے گئے ہیں۔ اس طرح وزرا کی تعداد چار ہے' لیکن ان سب کے اوپر وزیر اعظم ہوتا ہے جس کے قبضے میں شاہی مہر رہتی ہے - (خدا بخش دیکھیے Jonquiére L'Empire Ottoman صفحہ ۱۸۱) -

آداب الوزارت میں حکومت کے اچھے نظم و نسق کے لئے جن اعلیٰ عہدہ داروں کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے وہ وزیر ' امیرداد ، وکیل در ، امیر حاجب' مشرف ' عارض اور صاحب برید ہیں۔ وزیر صدر حکومت ہے - مصنف کی رائے میں اگر ان عہدوں پر ایماندار' قابل اور خدا ترس اشخاص کا تقرر کیاجائے تو رعایا خوش' ملک آباد، خزانہ معمور، فوج مضبوط اور دشمن مغلوب رہتا ہے (مسودہ برٹش میوزیم - جزو۱۹ - ۲۰) خاص محکموں کے لئے دیکھیے تاریخ امیر علی (History of the Saracens) - صفحات ۴۱۴ - ۴۲۱ -

۱ - عرب تو اس کی ذات سے بہت سی باتوں کی توقع رکھتے تھے - اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ شطرنج اور پولو کے کھیل جانتا ہو ، ستار بجا سکتا ہو ، ریاضی ، طب ، نجوم ، شاعری ، صرف ونحو اور تاریخ کا ماہر ہو اور نظمیں اور کہانیاں سنا سکتا ہو (کریمر - صفحہ ۲۲)

کسی کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی نہ کوئی اس سے گستاخی کر سکتا ہے۔ لیکن وزیر کی ذات اس قسم کے پردے یا حجاب سے محروم ہے۔ سلطنت کے استحکام کا سہرا بادشاہ کے سر رہتا ہے اور اس کے انتشار کا ذمہ دار صرف وزیر کو بننا پڑتا ہے۔ اس لیے وزیر کو ایک فلسفی کی طرح عقلمند، ایک دیہاتی کی طرح سادہ مزاج، ایک تاجر کی طرح خرچ کرنے میں محتاط اور ایک سپاہی کی طرح بہادر ہونا چاہئے۔[1]

وزیر کی رہنمائی کے لیے فقہا نے جو اصول وضع کیے ہیں، ان سے عہدۂ وزارت کے خاص فرائض کا اندازہ ہوتا ہے۔ وزیر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ (الف) ملک کی آبادکاری، (ب) فوج کی سلح بندی (ج) ذرائع آمدنی کی تعیین اور (د) رعایا کی خوشحالی کے چہارگانہ مقاصد کو مد نظر رکھ کر مملکت کی حکمت عملی وضع کرے۔

دوم۔ مملکت کی مالی حالت کو مستحکم رکھنے کے لیے اس کا فرض ہے کہ خرچ میں دانشمندی سے کام لے اور ناگہانی ضروریات کے لیے کافی رقم محفوظ رکھے۔

سوم۔ دشمن کے مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہنے کے سلسلے میں اس کا فرض ہے کہ وہ:—

(الف) سڑکوں کو محفوظ اور اچھی حالت میں رکھے
(ب) اعلیٰ درجے کی منظم فوج ہر وقت تیار رکھے
(ج) ہر قسم کے اسلحہ اور آلات حرب تیار کرے
(د) مملکت میں عوام اور سرکاری ملازمین کے مختلف گروہوں کو اپنی اپنی حدود سے متجاوز نہ ہونے دے۔

---

۱ - جزو ۲۰ و ۲۱ -

چہارم - اس کا فرض ھے کہ وہ وسائل آمدنی میں اضافہ کرنے اور خطرات سے بچنے کے لیے (الف) کاشتکاروں کو تکلیف اور نقصان پہنچائے بغیر محاصل میں اضافہ کرے کیونکہ ''زمین حکمران کا خزانہ سمجھی جاتی ھے اور اس کی کنجی فرمانبردار کسان کے ھاتھ میں ھوتی ھے'' اور (ب) مملکت کی سرحدوں کی توسیع کرے - یہ مقصد سیاسی چالوں یا طاقت کے استعمال سے حاصل ھو سکتا ھے - سیاسی چالوں کو جنگ پر ترجیح دی جاتی ھے لیکن جنگ کے لیے تیار رھنا بھی ضروری ھے کیونکہ ''بڑی فوجیں محض دانشمندوں کی سیاسی چالوں سے مغلوب نہیں ھو سکتیں'' -

مملکت کے لیے دو خطرے زبردست ھوتے ھیں (۱) اندرونی خلفشار جو ان لوگوں کی غفلت یا نا اھلی کا نتیجہ ھوتا ھے جو امن برقرار رکھنے کے ذمہ دار ھوتے ھیں - (۲) مملکت کے محاصل میں کمی، جو یا تو کسانوں کے طاقتور بن جانے اور سر کشی اختیار کر لینے کی وجہ سے پیدا ھوتی ھے یا اس وجہ سے کہ کاشتکار افلاس کے باعث مالگزاری ادا کرنے کے قابل نہیں رھتے -

دونوں صورتوں کا تدارک ضروری ھے -

غرض کہ وزیر حکمت عملی متعین کرتا اور فوج و مالیات پر قابو رکھتا ھے - تاھم یہ دیکھنے کی بات ھے کہ آداب الوزارت کا مصنف وزیر سے کسی قسم کے عدالتی اختیارات منسوب نہیں کرتا - اس نے امیر داد اور صاحب برید کے فرائض اور ان کی علمی استعداد و اھلیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ھے اس سے اندازہ ھوتا ھے کہ عدالتی اختیارات انھیں لوگوں کے لیے مختص تھے - نظام الملک، ایک

مختار کل وزیر کے مقابلے میں ، خود بادشاہ کے اوصاف اور اس کی ہوشیاری و بیدار مغزی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے - اس کے خیال میں حکمران کا فرض ہے کہ وہ نظم و نسق کے ہر شعبے پر ذاتی توجہ اور نگرانی رکھے - تمام عہدوں پر موزوں اشخاص کا تقرر کرے[۱] اور ان سے مسلسل رابطہ قائم رکھے- تاہم وہ وزیر کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا - ''اگر وزیر سچا اور نیک نیت ہو تو ملک آباد اور فوج و عوام مطمئن اور آسودہ خاطر رہیں گے''- اس لیے ضروری ہے کہ حکمران ، وزیر کے کام کی جانچ پڑتال کرتا رہے اور دیکھتا رہے کہ وہ اپنے فرائض کس طرح انجام دے رہا ہے -[۲]

جس طرح وزیر کے اختیارات وسیع تھے اسی طرح اس کی ذمہ داریاں بھی وسیع ہوتی تھیں اور مملکت میں اس کی حیثیت سب سے زیادہ نازک تھی - جیسا الفخری نے کہا ہے اسے ایک طرف تو بادشاہ سے سابقہ رہتا تھا اور دوسری طرف عوام سے - اس طرح اسے اپنی ذات میں ایسے اوصاف جمع کرنا پڑتے تھے جو دونوں کے لیے قابل قبول ہوں - اس کے علاوہ اسے ایک اور یکساں اہم عنصر یعنی عہدہ داران مملکت سے بھی سابقہ پڑتا تھا جو عوام سے براہ راست

---

۱ - اس نکتے پر آداب الوزارت میں بھی زور دیا گیا ہے - جزو ۱۸- اور شانتی پرون (Santi Parvan) میں بہت تفصیل سے لکھا ہے ''ہر ملازم کو ایسے ہی کام پر مامور کیا جائے جس کے لئے وہ موزوں ہو - اگر کتے کو اس کی حیثیت سے اونچا مقام دیا جائے تو وہ غرور کے نشے میں مست ہو جائے گا - شیر کو ہمیشہ شیر ہی کے ساتھ دوستی رکھنا مناسب ہے - کتوں کے ساتھ رہ کر وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں بری طرح ناکام رہے گا - (باب ۱۱۹ - صفحات ۳ - ۹ اور ۱۱ - ۱۲) بینی پرشاد - تھیوری (Theory) صفحہ ۴۹ -

۲ - سیاست نامہ - صفحہ ۱۸ -

ربط ضبط رکھنے کے علاوہ بادشاہ تک بھی رسائی رکھتے تھے۔ مسلم فقہا نے وزیر کے کام کی مشکلات اور عہدے کی نزاکت کو اچھی طرح پیش نظر رکھ کر اس مسئلے پر پوری توجہ کی ہے اور وزیروں کی رہنمائی کے لئے ضابطۂ عمل مرتب کیا ہے۔

نظام الملک نے فرائض سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی ہیں وہ بہت مفید اور قابل قدر ہیں۔ سب سے پہلے ان میں بتایا گیا ہے کہ اسے بادشاہ، عوام اور وزرا سے کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ وہ لکھتا ہے کہ وزیر کو چار طرف نظر رکھنی چاہیے۔ خدا کی طرف، بادشاہ کی طرف، ان اشخاص کی طرف جو اس کے قریب ہوں اور عوام کی طرف۔[۱] اس کے دل میں خدا کا خوف ہونا ضروری ہے اور اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے تمام اعمال کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اپنے عہدے کو برقرار رکھنے کے لیے اسے بادشاہ کو خوش رکھنا چاہیے۔ اسے ان اعلیٰ عہدہ داروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہیے جو اپنے اعلیٰ منصب کی وجہ سے بادشاہ تک رسائی رکھتے ہوں اور اسے عوام کی ضروریات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

''آداب'' کے حسب ذیل مقولے میں سب سے زیادہ مفید اور قابل قدر نصیحت ملتی ہے۔ اسے (وزیر کو) بادشاہ کی رضا جوئی مدنظر رکھنی چاہیے تاکہ اس کا رتبہ بلند ہو۔ ارکان حکومت سے اس کے تعلقات دوستانہ رہنے چاہیں تاکہ وہ اپنے عہدے سے معزول نہ ہونے

۱- مسودہ برٹش میوزیم - ش - ۲۵٦ - جزو ۴۳-۴۴ -

پائے۔ رعایا سے اس کو مہربانی کا برتاؤ کرنا چاہیے تا کہ وہ اس سے وابستہ رہے اور اس کے دشمنوں کے فریب میں نہ آنے پائے۔[1]

عہدہ وزارت پر غیر مسلموں کا تقرر

الماوردی پہلا مسلم فقیہ ہے جس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ غیر مسلم بھی دوسرے درجے کی وزارت پر مامور کیے جا سکتے ہیں کیونکہ دوسرے درجے کے وزیر کے لئے ضروری نہ تھا کہ وہ قانون اور دینیات کے علم میں کامل ہو۔ وہ عموماً بادشاہ یا وزیر اعظم کے ماتحت کام کرتا تھا اور اپنی مرضی سے کچھ نہ کرسکتا تھا۔ ایک مصری مصنف، ابن جماعۃ نے اس نقطۂ خیال کی شدید مخالفت کی ہے۔ اس کی رائے ہے کہ جزیہ یا محصول شخصی کی تحصیل سے جو عہدے متعلق تھے صرف وہی غیر مسلموں کو دیے جاسکتے تھے۔

ابن خلدون بھی الماوردی کے خلاف رائے رکھتا ہے لیکن اس کے اعتراضات کی بنیاد مذہب کے بجائے سیاست پر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ غیر مسلموں کے دل میں قوم کی عظمت اور سلطنت کے استحکام کی وہ خواہش پیدا نہیں ہوسکتی جو مشترک مفاد، مشترک ہمدردی اور مشترک جذبات ہی سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن عملاً

۱- مسودہ آثار الوزرا میں بھی اسی قسم کی نصیحت موجود ہے۔ عام اصول۔ صفحات ۱-۸ اصول رہنمائی جن کی بنیاد اس نصیحت پر قائم ہے جو رشید الدین نے اپنے فرزند امیر علی کو (صفحہ ۳۲۹) اور دوسرے بیٹے جلال الدین کو کی ہے (صفحات ۳۹۰-۴۰۰) اور جس میں انیس باتیں مذکور ہیں جو انتظامی فرائض کے علاوہ فوجی فرائض جہاد سے لے کر علما کے احترام، حتی کہ مساجد کی دیکھ بھال کے متعلق ہیں (چنگیز اور اس کے جانشینوں کے وزیروں سے متعلق باب میں)۔ رشید خود بھی بیس سال تک وزیر رہ چکا تھا۔

اسلامی مملکتوں میں حتیٰ کہ خود مصر میں بھی وزارت کے عہدے پر غیر مسلموں کا تقرر ہوتا رہا ہے۔[1]

سلاطین دھلی کے دربار میں وزارت کا منصب

وزیر کے مذکورۂ بالا فرائض و اختیارات سے پتا چلتا ہے کہ مسلم حکمرانوں کے تحت اس منصب کی اہمیت کیا تھی۔ کریمر لکھتا ہے

''مشرق میں ترکی، منگولیا، ایران وغیرہ تمام ممالک میں اس کی حیثیت قریب قریب یکساں تھی۔[2] محمود غزنوی کا انتظامی عملہ اسی نوعیت کا تھا۔ وزرا کو بادشاہ کا اعتماد حاصل تھا اور سلطنت میں ان کی عزت کی جاتی تھی۔[3]

غرضکہ جب ترک ہندوستان آئے تو انھیں پہلے ھی سے وزارت کے کام کا وافر تجربہ حاصل تھا۔ سلطنت میں وزارت کے قیام کا پتا خود مختار حکومت کے قیام کے ساتھ ھی چلتا ہے اور اس عہدے کو وھی اہمیت حاصل تھی جو اس کے نام سے ظاہر ہے۔[4]

سلاطین دھلی کے دور میں عہدۂ وزارت تین مختلف منزلوں سے گزرا۔ پہلی منزل اس وقت ختم ہوتی ہے جب بلبن ترقی کرتا

۱۔ امیر علی۔ ھسٹری آف دی سیریسنز (History of the Saracens) صفحہ ۴۱۳۔ کریمر، ترجمہ صفحہ ۲۲۵ ''خلافت اور غیر مسلم'' کے باب ۲ میں بھی بعض بعض جگہ ایسی مثالیں ملتی ھیں۔

۲۔ امیر علی۔ (History)، ترجمہ کریمر، صفحہ ۲۲٦۔

۳۔ ابوالعباس فضل، ابوالقاسم احمد اور حسنک۔

۴۔ عین الملک جنیدی، سلطان شمس الدین کا وزیر تھا (طبقات صفحہ ۱۷۹)۔ اس نے رضیہ کی مخالفت کی (صفحہ ۱۸٦)۔ عین الملک؛ حسین اشعری ناصرالدین قباچہ کا وزیر رکن الدین کا وزیر ھو گیا (طبقات۔ صفحہ ۱۸۲)۔

ہؤا منصب نیابت تک پہنچ جاتا ہے - اس عہد میں وزرا کو فوجی اور غیر فوجی اختیارات کامل طور پر حاصل تھے اور امور سلطنت میں انھیں کافی دخل تھا - اس دور میں خواجہ نظام الملک جنیدی اور مہذب کی شخصیتیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں[۱]، جن پر منصب نیابت شاہی کے قیام کا بھی کوئی اثر نہ پڑا - [۲]

دوسرا دور جو خاندان خلجی کے زوال تک باقی رہا وہ ایسا زمانہ تھا جب وزرا کا اثر بالکل زائل ہو چکا تھا - اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ بادشاہ کا نائب بلبن جو تمام امور سلطنت پر حاوی تھا، اپنی تخت نشینی کے بعد بھی اپنی اسی حکمت عملی پر کار بند رہا - دوسری وجہ یہ تھی کہ محکمہ فوج کو وزارت سے علحدہ کر دیا گیا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ علاءالدین نے تمام اختیارات اپنے ھاتھ میں لے لیے - علاءالدین کے آخر عہد میں ملک کافور اور مبارک شاہ کے دور میں خسرو بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے امور سلطنت پر چھائے رہے اور ان تینوں نائبین کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں الماوردی کے بیان کردہ درجہ اول کے وزرا کے سے اختیارات حاصل تھے لیکن در اصل جن اختیارات سے انھوں نے کام لیا، وہ وزیر کے اختیارات نہ تھے - ان کا منصب عہدۂ وزارت سے نمایاں طور پر مختلف تھا اور انھیں کی موجودگی کے باعث اس دور

---

۱ - شمس الدین کی وفات کے بعد بادشاھوں کے رد و بدل کے ذمہ دار دونوں وزیر تھے - مہذب اس قدر طاقتور تھا کہ اس کے خلاف تمام امیر متحد ہو گئے - بالآخر وہ معزول اور قتل کر دیا گیا - '' برمملکت استیلائے تمام یافت و جملہ کارھا از دست امرائے ترک بیرون بردہ ''- (طبقات ' صفحہ ۱۹۸ ' ترجمہ ریورٹی (Raverty) صفحہ ۶۶۳ -)

۲ - اختیارالدین اور ملک قطب الدین حسین غوری نائب شاہ تھے -

کے وزراء کو کیقباد اور مبارک شاہ جیسے کمزور بادشاہوں کے زمانے میں بھی ابھرنے کا موقع نہ مل سکا۔[۱]

تیسرا دور خاندان تغلق کی حکومت کا دور تھا۔ اس خاندان کے بانی نے اپنے وزیروں کا درجہ تو بلند کر دیا لیکن انھیں وہ اختیارات نہ دیے جو ان سے پہلے وزیروں کو حاصل تھے۔ فوج کا انتظام علحدہ دیوان عرض ھی کے سپرد رھا جیسا کہ دوسرے دور میں رھتا تھا۔ سلطان کی طرف سے ان دونوں محکموں کے سر براھوں کو جو ھدایات تھیں، ان سے فرائض وزارت کی یہ تقسیم اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ برقرار رکھنے کا ارادہ صاف ظاھر ھوتا ھے۔ سلطان محمد تغلق کے اس قول سے کہ میرے پاس کوئی ایسا وزیر نہ تھا جو مجھے خون بہانے سے باز رکھ سکتا، سلطان کے وزرا کی حیثیت بخوبی واضح ھو جاتی ھے، لیکن اس کے باوجود سلطان محمد تغلق اپنے وزیر، خواجہ جہاں، کا بہت احترام کیا کرتا تھا۔ سلطان فیروز نے حکومت ما سبق کے مدد گار وزیر، مقبول خان جہاں کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اس کی مسلمہ قابلیت، تن دھی اور وفاداری نے اسے ملک میں اعلیٰ ترین رتبے تک پہنچا دیا۔ خود سلطان کہا کرتا تھا کہ دھلی کا اصلی حکمران خان جہاں (مقبول)

---

۱ - برنی - بلبن کے دور حکومت کے مشاھیر کے ذکر میں ' خواجہ حسن بصری ' وزیر بلبن کا نام تک نہیں لیتا اور عمادالملک دیوان عرض کا ذکر بہت تفصیل سے کرتا ھے (صفحات ۱۱۲ - ۱۲۳) - خاندان خلجی میں خواجہ خاطرالدین کار کردگی اور صلاحیت عمل کے لیے مشہور تھا اور خاندان مذکور کے پہلے دو حکمران اس کی بے حد عزت کرتے تھے - نصرت خاں بھی ممتاز حیثیت کا مالک تھا لیکن دونوں کے اختیارات اپنے اپنے محکموں تک محدود تھے -

ہے۔[1] اس کا ہمعصر مصنف عفیف لکھتا ہے کہ وزیر کی موجودگی میں سلطان نے کبھی کھلے دربار میں کسی اور کو مخاطب نہیں کیا اور ہر حکم اور ہر پیغام اسی کے توسط سے دوسروں تک پہنچا کرتا تھا۔ لیکن اس عزو احترام کے باوجود اس کے اختیارات صرف اپنے محکمے تک محدود تھے[2] اور دیوان عرض کے منصب پر اسی کی ٹکر کا ایک دوسرا طاقتور اور معتبر وزیر عما دالملک فائز تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ فیروز کے دور حکومت تک مرکزی حکومت انتظامی کل مکمل ہو چکی تھی اور مختلف عہدہ داروں کے اختیارات معین ہو چکے تھے۔ وزیر کے ذمے صرف مالگزاری اور مالیات سے متعلقہ امور رہ گئے تھے اور اب اس کی حیثیت پہلے کی طرح ایک ایسے بلند ترین انتظامی عہدہ دار کی نہ رہی تھی جو کل امور سلطنت پر حاوی ہو۔ وزیر کی موجودہ حیثیت نے ان صفات کا تعین بھی کر دیا جو اب اس عہدے پر فائز ہونے والوں کے لیے ضروری رہ گئی تھیں۔ جو فنی معلومات اس عہدے پر کام کرنے کے لئے اب درکار تھیں ان کے پیش نظر وزیر اب "صاحب سیف" کے بجائے واضح طور پر صرف "صاحب قلم" رہ گیا تھا۔ سپہ گرانہ قابلیت اب اس عہدے کے لئے ضروری نہ رہی تھی۔

فیروز کے بعد کے دور طوائف الملوکی میں فرائض یا اختیارات کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[3] خاندان لودھی کا طریق

---

۱ - عفیف - صفحہ ۳۰۰ -　　۲ - عفیف - صفحہ ۳۱۲ -

۳ - تاریخ مبارک شاہی میں صفحات ۱۶۷ - ۱۷۵ - ۲۱۳ - ۲۵۳ اور ۲۶۲ پر جو حالات درج ہیں ان سے اس دور کے وزرا بالخصوص سرورالملک اور کمال الملک کی حیثیت اور ان کی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

کار یہ تھا کہ کل انتظام سلطنت افغان امرا اور جاگیر داروں کے ہاتھوں میں تھا اس لیے وزرا اور ان کے کام کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی -

بابر اور ھمایوں مملکت میں صرف ایک وزیر کی روایت لے کر ہندوستان آئے۔ ان میں سے اول الذکر کے تحت نظام الدین خلیفہ اور آخرالذکر کے تحت امیر وائس (؟) اور ہندو بیگ کو عملاً یکساں درجہ حاصل رہا - وہ تمام فوجی و غیر فوجی امور پر حاوی تھے اور جنگ میں بھی حصہ لیتے تھے - ان کے زمانے کے حالات بھی اس طریق کار کے لئے ساز گار تھے -

شیرشاہ تمام اختیارات اپنے ھاتھ میں رکھنا ضروری سمجھتا تھا - آخری دور کے تغلقوں اور سیدوں کے ھاتھوں سلطنت دھلی کی جو حالت ھوگئی تھی اس نے ضرور اس دور اندیش بادشاہ کو خبر دار کر دیا ھوگا۔ حکمت عملی کے اقتضاء اور ذاتی میلانات کے علاوہ سیاسی حالات بھی ایسے تھے کہ ھر انتظامی شعبے پر اس کی ذاتی توجہ اور نگرانی ضروری تھی ، اس لیے اس نے حکومت کا کل نظم و نسق اپنے ھی ھاتھوں میں رکھا -[1]

بیرم خاں | ھمایوں کے دوسری بار ہندوستان فتح کر لینے اور اس کامیابی کے چند ھی مہینوں بعد انتقال کر جانے کے باعث ملک اور حکمران خاندان دونوں کے لئے بڑی خطرناک صورت حال پیدا

---

۱ - مسٹر قانون گو کا یہ اعتراض درست ھے کہ شیر شاہ کے وزرا محض دفتری کار پردازوں کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ صرف روزمرہ کے معمولی کام ھی انجام دیا کرتے تھے - (شیر شاہ - صفحہ ۳۰۹) -

ہو گئی تھی - یہ صرف بیرم خاں کی شخصیت ہی تھی جس نے ملک میں امن برقرار رکھا اور خاندان کو بچا لیا لیکن انتظامی نقطۂ نظر سے بیرم خاں کا پنج سالہ دور شمالی ہند کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے - وہ نابالغ بادشاہ کا اتالیق بھی تھا اور سلطنت کا وزیر اعظم (وکیل سلطنت) بھی - وہ بادشاہ کے نام پر مقتدر اعلیٰ کے اختیارات استعمال کرتا تھا اور تمام امور سلطنت پر حاوی تھا - بادشاہ "پس پردہ" تھا اور حکومت وکیل کی تھی -

اعلیٰ ترین عہدہ داروں کا تقرر اور ان کی برطرفی

الماوردی کے قائم کردہ معیار کے مطابق وہ در اصل وزیر اعظم یا وزیر درجہ اول کی حیثیت رکھتا تھا - مملکت کے بڑے سے بڑے عہدہ دار کا تقرر یا بر طرفی وہ اپنی خوشی سے کرتا تھا - پیر محمد ناصرالملک اس کا نائب تھا - مال گزاری اور مالیات سے متعلقہ امور اس کے سپرد تھے - ابوالفضل لکھتا ہے کہ وہ نہ صرف بیرم خاں کا وکیل (نمائندہ) تھا بلکہ در اصل "سلطنت کا وکیل" تھا -[1] بیرم خاں نے اسے علحدہ کر دیا - گو اکبر کو یہ بات پسند نہ آئی لیکن اس نے دخل نہ دیا -[2] بیرم خاں نے ناصرالملک کی بر طرفی کا جو حکم جاری کیا تھا اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسے بحیثیت وزیر اعظم سلطنت کیا مقام حاصل تھا - "جب تم قندھار آئے تھے تو ایک غریب عالم کے لباس میں تھے - چونکہ تم سید ہے اور ایماندار نظر آئے اور خدمت اچھی طرح بجا لاتے رہے، اس لیے میں نے تمھیں اعلیٰ عہدے پر

---

۱ - اکبر نامہ - جلد دوم - ترجمہ بیورج - صفحہ ۹۰ -
۲ - اکبر نامہ - جلد دوم - ترجمہ بیورج - صفحہ ۱۳۲ -

پہنچا دیا اور تم معمولی ملا سے ایک سپہ سالار بن گئے ۔ لیکن تمہارا ظرف چھوٹا تھا اس لیے بہت جلد تم پر اقتدار کا نشہ چڑھ گیا اور ایک ہی جام نے تمہیں از خود رفتہ کر دیا اور تم قابو سے باہر ہو گئے ...... بہتر یہی ہے کہ تم چند روز مایوسی کی چادر اوڑھ کر گوشۂ عافیت میں بیٹھے رہو .. کیونکہ تمہارے اور دنیا کے لئے یہی بہتر ہے ۔ اس کے بعد ہم جو کچھ تمہارے بارے میں طے کریں گے اس پر عمل ہوگا،، ۔[1]

اس نے شیخ گدائی کو تمام سیدوں پر ترجیح دے کر اسے محکمۂ امور مذہبی کا سر براہ مقرر کر دیا اور تمام سر بر آوردہ قدیم امراء کو نظر انداز کر کے سیاسی امور میں اسے نا مناسب حد تک اہمیت دے دی ۔[2]

سزائے موت

بیرم خاں اپنے حریفوں کو موت یا قید و بند کی سزا دے کر اپنی راہ سے ہٹا دیتا تھا اور اپنا کام پورا کر چکنے کے بعد بادشاہ کو صرف اس کی اطلاع دے دیا کرتا تھا ۔ اس کی نمایاں ترین مثال تردی بیگ کا واقعہ ہے جو ہیمو کے حملے کے وقت دھلی کا محافظ تھا ۔ اپنا کام کر چکنے کے بعد بیرم نے اپنے مددگار کے ذریعے اکبر کے پاس صرف یہ پیغام بھیج دیا کہ ,,اس جسارت کی وجہ محض تخت شاھی سے میری

---

۱ - اکبر نامہ ۔ جلد دوم- ترجمہ بیورج- صفحہ ۱۳۱- ابوالفضل اسے بیرم کی ذاتی رنجش کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور پر زور الفاظ میں ناصر الملک کی حمایت کرتا ہے ۔ صفحہ ۱۳۰ -

۲ - اکبر نامہ- جلد دوم- ترجمہ بیورج- صفحہ ۱۳۲- بیرم کی معزولی کے بعد اکبر نے جو فرمان جاری کیا تھا اس میں اس کے تقرر اور ترقی پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے ۔ صفحات ۱۶۱ - ۱۶۲ -

والہانہ عقیدت ہے ...اجازت حاصل نہ کرنے پر میں بہت نادم ہوں... امید ہے کہ حضور از راہ کرم میرے اس فعل کو شرف منظوری بخشیں گے تاکہ دوسرے بدکردار متنبہ ہو جائیں''۔[1]

عطائے جاگیرات

اس نے نہ صرف اپنی مرضی کے مطابق جاگیریں عطا کیں بلکہ خود اکبر کو بھی اس شکایت کا موقع دیا کہ وکیل، شاہی ملازمین کو نظر انداز کرتا رہا ہے۔[2]

انتظامی تبدیلیاں

وہ ہفتے میں دو مرتبہ دیوان خاص میں بیٹھ کر فوجی اور غیر فوجی معاملات کو از سر نو سلجھاتا تھا اور وہی کچھ کرتا تھا جو الماوردی نے نظری طور پر تجویز کیا ہے یعنی ''وہاں جو کچھ فیصلہ ہوتا ...... بکمال اداب شاہنشاہ کواس کی اطلاع بھیج دی جاتی''[3] اور یہی کافی سمجھا جاتا تھا۔

بادشاہ کے ذاتی معاملات میں مداخلت

بیرم خاں نہ صرف وزیر اعظم کے اختیارات استعمال کرتا تھا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر خود بادشاہ کے ذاتی معاملات میں بھی دخل دیا کرتا تھا۔ اس نے عبداللہ خاں مغل

---

۱ - اکبر نامہ' جلد دوم، ترجمہ بیورج - صفحہ ۵۳ -

۲ - اکبر نامہ' جلد دوم ترجمہ بیورج' صفحہ ۱۶۲- ''اپنے ادنٰی درجے کے ملازمین کو جن کے حالات و اوصاف الم نشرح ہیں' وہ خطابات دیتا ہے .... اور انہیں .... قیمتی جاگیریں اور زرخیز علاقے عطا کرتا رہتا ہے اور .... خانوں' شہزادوں عہدیداروں اور باوفا خدمتگاروں کو..— جن کے درجے، حقوق اور صلاحیتوں کا ہر شخص معترف ہے، اس نے دانے دانے کو محتاج بنا رکھا ہے''۔

۳ - اکبر نامہ، جلد دوم ترجمہ بیورج صفحہ ۱۰۴- یہ امور نئے ضوابط سے متعلق ہیں۔ روزمرہ کے کام سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔

کی لڑکی سے بادشاہ کی شادی کی مخالفت کی اور بمشکل اس وقت راضی ہوا جب " ناصر الملک نے اس تک یہ بات پہنچا دی کہ ایسے معاملات میں اس کی مخالفت سخت ناقابل برداشت ہے"۔[۱] ایک موقع پر محض ذاتی عداوت کی بنا پر اس نے اکبر کے فیلبان کو قتل کرا دیا "حالانکہ وہ بے گناہ تھا" اور ایک دوسرے موقع پر اس نے شاہی فیل خانے کے تمام ہاتھی امراء میں تقسیم کرا دیے۔[۲]

شمالی ہند کی تاریخ میں کوئی ایسی دوسری مثال نہیں ملتی کہ کسی وزیر کو یہ مرتبہ اور اختیارات حاصل ہوں۔ بیرم خاں نے شاہی خاندان اور نو زائیدہ مغلیہ سلطنت کے لیے جو خدمات انجام دیں، اگرچہ وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتیں تاہم اس دور کے واقعات سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ عنان اقتدار ہاتھ میں لے لینے کے بعد بیرم خاں نے نظم و نسق کے ایک عام ماہر سے زیادہ کچھ کر کے نہیں دکھایا اور اس کے بعض افعال تو بلا شبہ سیاسی مصلحتوں اور ملکی ضرورتوں سے ہٹ کر ذاتی مفاد پر مبنی نظر آتے ہیں۔ بے تدبیری اور موقع ناشناسی کے باعث وہ نہ تو بادشاہ کا اعتماد قائم رکھ سکا اور نہ امراء، یا رعایا ہی کی حمایت حاصل کر سکا۔ اس کی نظر نہ تو بادشاہ پر رہی، نہ اس کے مصاحبین (یعنے اپنے شرکائے کار) پر اور نہ اس نے رعایا ہی کی کوئی پروا کی، حالانکہ مسلمان فقہا نے انہیں باتوں کو ایک وزیر کے لیے کلید کامیابی قرار دیا ہے۔ بالآخر اس کی حیثیت بہت غیر مستحکم

۱- اکبر نامہ، جلد دوم، ترجمہ بیورج۔ صفحہ ۸۸- بیرم، عبداللہ کو کامران کا طرفدار سمجھتا تھا۔

۲- اکبر نامہ، جلد دوم۔ ترجمہ بیورج۔ صفحات ۱۳۹ - ۱۴۰۔

ہو گئی اور اسے اپنے منصب سے دست بردار ہونا پڑا۔ ہمایوں اور اکبر کی ذات سے والہانہ عقیدت مندی اور وفاداری اور ان کی دیرینہ خدمت گزاری کے باوجود اپنی کوتاہ اندیشی کے باعث تاریخ کے صفحات میں وہ ہدف ملامت ہی نظر آتا ہے اور اس پر جو کچھ گزری وہ بھی اختیارات وزارت کے بے روک ٹوک استعمال کے عبرت انگیز انجام ہی کی ایک مثال ہے۔[1]

وکیل اور اس کی حیثیت

اکبر کا عہد حکومت ان تمام اداروں کے ارتقا و نشو و نما کا زمانہ تھا جنھیں مغلیہ کہا جا سکتا ہے۔ لہذا یہ مناسب ہے کہ وزیر سلطنت کو بالآخر جو حیثیت حاصل ہوئی اور اس عہدے سے جو فرائض و اختیارات علی العموم منسوب ہوتے رہے ان کا ایک تدریجی جائزہ لیا جائے۔

یہ اکبر کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ملک میں مسلمانوں کی تین سو سال کی حکومت کا تجربہ میسر تھا اور یہ اس کی دانش مندی کی دلیل ہے کہ اس نے اس تجربے کو نظر انداز نہ کیا۔ شمالی ہند کے وسیع میدانی علاقے میں امن و امان برقرار رکھنے کے مسائل کی طرح اس عظیم الشان سلطنت کے منصب وزارت کا مسئلہ بھی بہت دقت طلب

۱۔ اس کے متعلق ابو الفضل کی رائے نہایت صحیح اور منصفانہ ہے:
"بیرم خاں نے جو جرأت، انتظامی صلاحیتوں، جان نثاری اور خلوص میں اپنے آپ کو یکتائے روزگار سمجھتا تھا اور جس کے دل میں چند خوشامدیوں کی وجہ سے یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ اس کے بغیر ہندوستان کا انتظام ناممکن ہے، تنگ نظر مصاحبین کے غلط مشوروں کے باعث تباہی کی راہ اختیار کرلی اور پھر اس سے ایسے شرمناک افعال سرزد ہوئے جو اس کے لیے زیبا نہ تھے" (اکبر نامہ جلد دوم، صفحہ ۱۳۸)۔

تھا - بیرم خاں کی وکالت کے نتائج سے اکبر کو جو ذاتی تجربہ ہوا اس سے اکبر خوب سمجھ چکا تھا کہ تمام اختیارات ایک ہی وزیر کو سونپ دینا مناسب نہیں ہے - بیرم کی حیثیت ، بلبن ، ملک کافور اور خسرو کی نیابت کے مشابہ تھی - جہاں تک ان وزرا کی انتظامی صلاحیتوں کا تعلق ہے ان سب میں فرق ضرور تھا لیکن دو باتیں ان سب میں مشترک نظر آتی ہیں ، یعنی چاروں کے چاروں سپہ سالار تھے اور سلطنت کی فوجی قوت کا انتظام کاملاً انہیں کے سپرد تھا۔ انہیں سلطنت کے معاملات پر پورا غلبہ حاصل تھا اور انہیں بیدخل کرنا آسان نہ تھا - بلبن اپنے آقا کے بعد تخت سلطنت پر خود متمکن ہو گیا اور ملک کافور نے اپنے آقا کے وارث کو راستے سے ہٹا کر تخت شاہی کے لئے اپنی راہ ہموار کر لی - جب خسرو کی باری آئی تو اس نے حصول مدعا کی خاطر اپنے آقا کو قتل کر ڈالا - بیرم نے اپنے عہدے سے معزول کر دیے جانے کے بعد خواہ کیسے ہی حالات و اسباب کے پیش نظر تلوار اٹھائی ہو مگر اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جنگ و جدل کے بغیر اس نے بھی اطاعت قبول نہ کی - ان تجربوں کے پیش نظر سلطنت کی نیابت یا بیرم خاں کی سی وکالت اکبر کے دور میں خارج از بحث تھی اور بعد کے واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اکبر نے اسی نکتے کو اپنی حکمت عملی کی اساس قرار دیا تھا -

بیرم خاں کے اختیارات اور اعزازات کی تقسیم

بیرم خاں کے اختیارات سلب کر لیے جانے کے بعد ہی ''سیاسی و مالی امور'' شہاب الدین (عامل دھلی) کے سپرد کر دیے گئے اور کچھ دنوں بعد ''ماہم انگہ اس کی شریک کار بنا دی

گئی''۔[۱] بیرم خاں کا علم، طبل اور تمن توغ شمس الدین اتکہ خاں[۲] کو عطا کر دیا گیا۔

منعم خاں[۳] جو کابل سے آیا تھا خان خاناں کے خطاب اور منصب وکالت سے سرفراز کیا گیا[۴]۔ اس طرح بیرم خاں کے اختیارات و اعزازات تین اشخاص میں تقسیم کر دئے گئے۔ یہ اقدام واضح طور پر آئندہ میلانات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ماہم آنگہ اور شہاب الدین نے جو حیثیت حاصل کر لی تھی اور انھوں نے بیرم خاں کے معاملے میں جو خدمات انجام دی تھیں، ان کے پیش نظر ان کے دل میں یہ پختہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ عہد اکبری میں انھیں وسیع اختیارات اور اثر و رسوخ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن منعم خاں سلطنت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھا اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف تو منعم خاں کی حیثیت تسلیم کر لی گئی اور دوسری طرف وہ اختیارات ماہم اور اس کے رفقاء کی رسائی سے باہر ہوگئے جن سے خطرناک نتائج پیدا ہونے کا امکان تھا۔

۱ - اکبر نامہ جلد دوم ترجمہ بیورج - صفحات ۱۴۳-۱۴۴ اور صفحہ ۱۷۴-

۲ - اکبر نامہ، جلد دوم ترجمہ بیورج صفحہ ۱۷۴-ماثر الامرا- جلد دوم صفحہ ۵۳۱- وہ اکبر کا قدیم خادم تھا اور پنجاب کا انتظام اس کے سپرد تھا۔

۳ - اکبر نامہ، جلد دوم ترجمہ بیورج - صفحہ ۱۷۴—ماثر الامرا- صفحہ ۴۳۵ اس نے کابل کا انتظام وفاداری کے ساتھ کیا تھا۔

۴ - اسی زمانے بہادر خاں برادر علی قلی خاں کو وکیل بنا دیا گیا تاکہ اس کی جماعت شہاب الدین کی مخالفت سے باز آجائے۔ یہ ماہم کی ایک سیاسی چال تھی اور وہ خود بھی اس کے ساتھ کام کرتی رہی۔ جب بہادر کی جماعت قابو میں آگئی تو اسے ایک جاگیر عطا کر کے اٹاوہ بھیج دیا گیا۔ (صفحات ۱۰۰-۱۰۱)-

منعم ایک مرد آزمودہ کار تھا اور اس نے اپنے گرد و پیش کے حالات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا - چنانچہ اس نے اپنے آپ کو ماھم سے وابستہ کر لیا اور اس تدبیر سے نہ صرف اپنے مخالفین کی آواز کو دبا دیا بلکہ دربار شاھی میں ایک خاص گروہ کی حمایت بھی حاصل کر لی جو ایک نووارد کی حیثیت سے اس کے لیے بہت ضروری تھی -

چند ماہ بعد اتکہ خاں نے معروضہ گزرانا کہ میں نے بیرم خاں کی معزولی کے سلسلے میں شہنشاہ کی جو خدمت انجام دی ھے اس کے بعد مجھے یہ امید تھی کہ دوسرے اعزازات کے ساتھ مجھے بیرم خاں کا منصب بھی عطا کیا جائے گا - اس معروضے کو شرف منظوری بخشا گیا اور منصب وکالت اتکہ خاں کو سونپ دیا گیا -

اتکہ خاں کا دور وکالت

اس طرح ایک سال کے اندر اندر تین مختلف آدمی اس منصب پر فائز ہوئے - یہ واقعہ بادشاہ کی قوت اور اس قوت کے استعمال کی آزادی کا جو اسے حاصل تھی، کافی ثبوت ھے -

اتکہ خاں کے تقرر کی وجہ سے نہ صرف منعم اپنے عہدے سے محروم ھوا بلکہ ماھم اور اس کے ساتھیوں سے بھی تمام اثر و اختیار چھن گیا کیونکہ بقول ابوالفضل "اگرچہ بظاھر مسند وکالت پر وہ (منعم) متمکن تھا مگر اصلی وزیراعظم ماھم خود کو ھی سمجھتی تھی" - اس طرح دربار میں دو سیاسی جماعتیں بن گئی تھیں اور باھمی رقابت کی اس آگ پر ادھم خاں کی مجنونانہ حرکت نے تیل چھڑک دیا جب ایک دن اس نے دولت خانے میں داخل ھو کر اتکہ خاں کو، جو وھاں امور سلطنت انجام دے رھا تھا، اپنے غضب آلود ساتھیوں

کے ایک جتھے سے قتل کرا دیا۔ اس بے باکانہ حرکت کے باعث بالآخر ادھم خاں کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا اور بعد میں ماہم انگہ بھی بیٹے کی موت کے صدمے کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ منعم اور شہاب الدین نے دربار سے راہ فرار اختیار کی اور گویا اپنے جرم کا اقبال خود کر لیا۔

اس واقعے نے نہ صرف اس جماعت کا خاتمہ کر دیا بلکہ ایک بہت بڑی گتھی بھی سلجھا دی۔ وہ یہ کہ بادشاہ کا اختیار قطعی طور مسلم ہو گیا اور اکبر نے جس مستعدی سے ادھم خاں کو اس کی جسارت بے جا کی پاداش میں کیفر کردار کو پہنچایا، اس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی کہ وہ فی الواقع حکومت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔[۱]

منعم خاں کا دور وکالت

اکبر نے منعم خاں کو اس خطا پر جو اس سے مذکورۂ بالا معاملے میں سرزد ہوئی تھی، معاف کر کے اپنی سوجھ بوجھ اور تدبر کا ایک اور ثبوت دیا منعم اور شہاب الدین کی جان بخشی بھی کر دی گئی اور وہ دوبارہ بحال بھی کر دیے گئے۔ نیز منعم دوسری مرتبہ وکیل بنایا گیا۔ اس مرد آزمودہ کار کو بھینٹ نہیں چڑھایا گیا بلکہ اس زمانے میں جب نوزائیدہ سلطنت کو مستحکم کرنے کے لیے ہر تجربہ کار اور وفادار کارکن کی خدمات کی ضرورت تھی، اس وزیر کی صلاحیتوں سے پورا

---

۱ - پروفیسر رام پرشاد ترپاٹھی نے اپنے ایک مضمون میں جو جرنل آف انڈین ہسٹری (Journal of Indian History) کی جلد اول میں شائع ہوا ہے ماہم انگہ کی حیثیت کو بالوضاحت بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر اس کے دل میں کسی قسم کی ہوس اقتدار تھی تو اسے جتا دیا گیا کہ وہ اپنی حیثیت کو فراموش نہ کرے اور وہ کبھی اکبر پر حاوی نہ ہو سکی۔

فائدہ اٹھایا گیا - منعم کو یہ عہدہ حاصل تو ہو گیا لیکن اس عہدے سے جو وقار وابستہ تھا وہ اب ختم ہو چکا تھا -

اس دور میں اتکہ خان اور منعم خان کو سیاسی اور مالی امور کے انصرام اور فوج و رعایا کے معاملات کے انتظام کے باب میں پورے اختیارات حاصل تھے[1] اور اپنی ماموری کے زمانے میں یہی دونوں حکومت کے اصل سر براہ رہے -

منصب دیوانی کی ابتدا

۸ سنہ جلوس میں مظفر خان کا تقرر بطور دیوان عمل میں آیا اور محاصل و مالیات سے متعلقہ امور فرائض وکالت سے علٰحدہ کر دیے گئے - اس طرح وکیل کے وقار اور اختیارات پر ایک ضرب اور لگائی گئی - قید خانے سے نکال کر ایک شخص کو اس عہدے پر فائز کر دینا اس بات کا ایک مزید ثبوت تھا کہ منصب وزارت پر عزل و نصب کے اختیارات کامل طور پر بادشاہ کے ہاتھ میں ہیں -[2]

۹ سنہ جلوس میں جب اکبر نے مالوے پر فوج کشی کی تو منعم کو اپنے ساتھ لیتا گیا اور حکومت کا انصرام مظفر اور خواجہ جہاں کو سونپ گیا -[3] نئے وزیر کو بے روک ٹوک کام کرنے کا پورا

۱ - اکبر نامہ، جلد دوم، صفحہ ۲۳ -

---

۲ - اکبر نامہ، جلد دوم ترجمہ بیورج - صفحہ ۳۰۶ - ماثر الامرا - جلد سوم - صفحہ ۲۲۱ - وہ بیرم کا طرفدار تھا اور قید کر دیا گیا تھا - اس امر کے باوجود کہ بعض امرا اس کے قتل پر مصر تھے اکبر نے اسے قتل نہیں کیا - وہ رہا کر دیا گیا - ایک پرگنے کا انتظام اس کے سپرد ہوا - اس کے بعد وہ دیوان بیوتات اور آخر میں دیوان اعلیٰ بنا دیا گیا -

۳ - اکبر نامہ ' جلد دوم صفحہ ۲۲۹ -

موقع دینے کے لیے یہ عمل ضروری تھا۔ خواجہ جہاں، مظفر کا رفیق کار رہا اور مہر شاہی بھی اسی کی تحویل میں رہی۔

شرکائے کار | ۱۱ سنہ جلوس میں جب اکبر نے مرزا حکیم کی سرکوبی کے لیے پنجاب کا رخ کیا تو منعم خان کو آگرے کا حاکم مقرر کیا لیکن مظفر خان کو اس کی ماتحتی میں نہیں رکھا۔ ان دونوں کے فرائض کا واضح طور پر تعین کر دیا گیا تھا اور ایک کے کام میں دوسرا بالکل دخیل نہ تھا۔ منعم دارالسلطنت کا حاکم تھا اور مظفر دیوان کے عام فرائض انجام دیا کرتا تھا۔[1]

خواجہ جہاں کا منصب وزارت پر فائز ہونا پوری طرح ثابت نہیں ہے اور نہ یہ واضح ہوتا ہے کہ اسے کوئی عہدہ عطا کیا گیا تھا۔ البتہ مہرشاہی اس کی تحویل میں تھی اور دو جگہ امورسلطنت سے اس کے تعلق کا ذکر بھی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے مظفر کے شریک کار کی حیثیت سے کام کیا۔[2] اس کے علاوہ علی قلی خان کی بغاوت کے ضمن میں بھی اس کا سرسری ذکر آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے دربار شاہی میں کافی اثرورسوخ حاصل تھا اور سلطنت کے نظم و نسق میں بھی وہ وکیل اور دیوان کا برابر کا شریک تھا۔[3]

---

۱ - اکبر نامہ، جلد دوم صفحہ ۲۷۶ -

۲ - اکبر نامہ، جلد دوم صفحات ۲۲۹ اور ۲۵۹ -
'خواجہ جہان و مظفر خان آنجا (آگرہ) بہ انتظام کارگاہ سلطنت اشتغال داشتند'
'خواجہ جہان کہ مدار مہات سلطنت بہ رائے زریں او بود'۔

۳ - اکبرنامہ، جلد دوم صفحہ ۲۵۹ - منعم اور مظفر، کڑا (الہ آباد) میں علی قلی کے ساتھ صلح کی بات چیت کر رہے تھے - علی قلی کا اصرار تھا کہ خواجہ جہاں کو بھی مشورے میں شریک رہنا چاہیے - اس کی درخواست

دیوان کی حیثیت کا تعین

اسی سال منعم خاں، مظفر اور خواجہ جہاں نے مل کر کڑے میں علی قلی سے شرائط صلح طے کیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جگہ تینوں وزرا کی موجودگی نے کچھ پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ مظفر نے حضور شاہی میں اپنے ساتھیوں کی شکایات لکھ بھیجی۔ اسے منعم خاں کی طرف سے شک پیدا ہو گیا اور اس نے ان عمائد کی سازش کی تفصیلی اطلاع بادشاہ کو دیدی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لشکر خاں میر بخشی جو اسی لپیٹ میں آ گیا تھا، اپنے عہدے ؎ بر طرف کر دیا گیا۔ خواجہ جہاں کو بھی اپنے منصب سے د تھ دھونا پڑا۔ اس سے مہرے لی گئی اور اسے مکے چلے جانے کا حکم دیا گیا۔[1] مگر ایک مرتبہ پھر منعم خاں سے مہربانی روا رکھی گئی اور اسے کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا، لیکن اس کے ہوا خواہوں کو جس طرح کھلم کھلا سزائیں دی گئیں اس سے منعم کے وقار کو صدمہ ضرور پہنچا۔ ابوالفضل نے اس بارے میں یہ بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ ان لوگوں سے جو سختی کی گئی ... اس نے منعم خاں کو اور محتاط بنا دیا اور مظفر کی ساکھ بڑھ گئی۔[2]

بادشاہ کی خدمت میں بھیج دی گئی اور بادشاہ نے اس کی تسلی کے لیے خواجہ جہاں کو اس کے پاس بھیج دیا کیونکہ امورسلطنت اس کے مشورے سے انجام دیے جاتے تھے۔ خواجہ جہاں بے انتہا ذہین اور مالی امور کا ماہر تھا۔ وہ اکبر کی تخت نشینی سے پہلے اس کے بخشی کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور اکبر اس پر اعتماد رکھتا تھا۔

ماثرالامرا۔ جلد اول۔ صفحہ ۶۳۱۔

۱ - اکبر نامہ' جلد دوم۔ ترجمہ بیورج۔ صفحہ ۳۰۱۔ ماثر الامرا۔ جلد اول، صفحہ ۶۳۱۔ بعد میں اسے معاف کر دیا گیا مگر عہدے پر بحال نہیں کیا گیا۔

۲ - اکبر نامہ' جلد دوم' ترجمہ بیورج' صفحہ ۳۰۱۔

منعم خاں کا بنگال کو تبادلہ

علی قلی خاں کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد منعم کو جونپور[1] میں جاگیر عطا کر دی گئی اور مشرقی خطۂ ملک کے معاملات پر نظر رکھنے کا کام اس کے سپرد ہوا۔ اس نے ۱۲ سنہ جلوس میں دارالسلطنت کو خیر باد کہی اور آخر عمر تک بہار اور بنگال میں مصروف کار رہا۔

سیاسی مرکز سے دور ہو جانے کے ساتھ منعم خاں کا دور وکالت بھی ختم ہوا۔ وہ مرکزی حکومت سے بالکل بے تعلق ہو گیا اور ملازمت شاہی میں صرف ایک ایسے جرنیل کی حیثیت سے منسلک رہا جسے ایک خاص مہم کی ذمہ داری کے ساتھ ایک نو مفتوح علاقے کی حکومت سونپ دی گئی ہو۔ اس کا اعزاز و اکرام جس کی حیثیت محض ذاتی تھی، مرتے دم تک بر قرار رہا۔

اس کے دور وکالت پر تبصرہ

منعم وکیل سلطنت کی حیثیت سے نہایت ناکام رہا۔ اپنے پہلے دور اقتدار میں وہ ماہم انگہ اور اس کے جتھے کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گیا اور اپنی کمزوری، نیز اتکہ خاں کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کے باعث، اس نے اپنے عہدے اور مرتبے کو بھی ذلیل کیا۔ اکبر اس کی کمزوری کو سمجھ چکا تھا اور مظفر کو دیوان مقرر کرنے کے بعد اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ منعم کو دارالسلطنت سے دور ہی رکھے۔ بالآخر اسے مشرق میں بھیج دینا اکبر کا بہت دانش مندانہ اقدام

---

۱ - اس کی جاگیر جونپور سے چوساندی تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں بنارس اور غازی پور بھی شامل تھے (اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۲۹۸)

تھا - اگر کڑے کے واقعے کے بعد منعم دربار میں موجود رہتا تو ممکن تھا مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں اور امرائے سلطنت دو گروہوں میں بٹ جاتے مگر وہ سیاسی مرکز سے ہٹا کر ایک ایسی جگہ بھیج دیا گیا جہاں نہ صرف اس کی فوجی قیادت کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا گیا بلکہ خود اسے بھی اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے اور مرنے کے بعد نام چھوڑ جانے کا موقع مل گیا -

منعم خاں کے طرز عمل نے سلطنت میں وکیل کی حیثیت کا تعین بھی کر دیا۔ اس کی یہ اہمیت کہ وہ مملکت میں سیاہ و سفید کا مالک اور نظم و نسق کی روح و رواں تھا ، ختم ہو گئی - مال گزاری اور مالیات کے محکمے الگ کر کے ایک ایسے عہدہ دار کے سپرد کر دیے گئے جس کے سامنے وکیل کی حیثیت ماند پڑ گئی - تاہم مملکت میں اس کی حیثیت اعلیٰ ترین شمار ہوتی رہی اور وہ سب سے اونچے عہدے پر متمکن رہا - لیکن اب اس کے اثر کا انحصار ، عہدے کے بجائے اس کی شخصیت ، زمانے کے حالات اور دربار کے ماحول پر رہ گیا - اختیارات ختم ہو گئے اور ان کا نام ھی نام رہ گیا - اسی طرح اس کی امتیازی حیثیت اور وقار کے صرف ظاھری نشانات باقی رہ گئے -

اکبر اس حکمت عملی پر برابر کار بند رہا اور پھر اس عہدے پر فائز ہونے والے کسی شخص کو سابقہ وکیلوں کے سے اختیارات حاصل نہ ہو سکے - منعم خاں کے تبادلے کے بعد اس عہدے پر سات سال تک کسی کا تقرر نہیں ہوا ۱۰۲ - انیسویں سال مظفر کی خدمات

کا اعتراف کیا گیا اور اسے وکالت کے درجے پر ترقی دے دی گئی۔[1] وکالت اور دیوانی، دونوں عہدے اسے بیک وقت تفویض ہوئے لیکن یہ اعزاز اسے زیادہ دنوں تک حاصل نہ رہا۔ جب جاگیروں کے سلسلے میں گھوڑوں کو داغنے سے متعلق مجوزہ اصلاحات پیش ہوئیں تو اس نے انھیں قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے وہ بادشاہ کی نظروں سے گر گیا اور اسی سال اپنے عہدے سے بھی بر طرف ہوا۔

مظفر کی وکالت اور راجہ اور منصور کا مشترکہ طور پر دیوان کے فرائض انجام دینا

یہ بہار کی مہم میں مظفر کی دو سالہ بیش بہا خدمات کا نتیجہ تھا کہ وہ دوبارہ دربار میں طلب کر لیا گیا اور اسے پھر وکالت کے عہدے پر معموری کی عزت بخش دی گئی۔ اس وقت راجہ ٹوڈر مل اور شاہ منصور، دونوں مشترکہ طور پر دیوان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دونوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس کے مشورے سے اپنے فرائض منصبی انجام دیں۔ اس طرح مظفر منعم کی طرح اگرچہ وزارت کا صدر تو ضرور تھا لیکن دوسرے وزرا اس کے ماتحت نہ تھے۔ وہ اس کے رفقائے کار تھے جو اس کے ساتھ کام کرتے تھے اور بادشاہ کی خدمت میں اپنے معروضات اس کے توسط سے پہنچاتے تھے۔

مظفر دو سال تک اس عہدے پر مامور رہا اور وزارت کا کام نہایت خوبی سے انجام پاتا رہا، یہاں تک کہ ۲۲ سنہ جلوس کے

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۶۸ -

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم - صفحات ۱۳۱، ۱۳۲ -

آغاز میں مظفر کا تبادلہ بنگال کر دیا گیا ۔ اس تبادلے سے منعم کی طرح اس کے دور وکالت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور مرکزی حکومت کے انتظامی امور سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہا ۔

اکبر کے وکیلوں میں مظفر ہی وہ آخری وکیل تھا جس کا کچھ اثر اور اختیار انتظامی معاملات میں تھا ۔ لیکن اسے جو عزت حاصل رہی وہ محض اس کے ذاتی اوصاف کی وجہ سے تھی کیونکہ اکبر اس کا احترام اس کی صلاحیت عمل ، اس کی وفاداری ، اس کی فوجی اور وزارتی قابلیت کی بنا پر کرتا تھا ، نہ کہ اس کے عہدے کی بنا پر ۔

۴۳ سنہ جلوس میں اس عہدے پر عبدالرحیم خان خاناں کا تقرر ہوا ، لیکن محض عنایت خسروی اور ازدیاد مرتبت کے طور پر ، کیونکہ وہ بچپن سے بادشاہ کے ساتھ وابستہ تھا ۔ اسے کوئی حقیقی اختیار دینا مقصود نہ تھا ۔ چنانچہ یہ اعزاز زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا ۔ وہ قندھار کی مہم پر بھیج دیا گیا اور دیوان کے فرائض خواجہ شمس الدین کی نگرانی میں انجام پاتے رہے ۔[1]

خان اعظم کی وکالت

چالیس سنہ جلوس میں خان اعظم مرزا عزیز کوکا جو اکبر کا منظور نظر ، پرانا ساتھی اور ساتھ کا کھیلا ہوا تھا ، عہدۂ وکالت پر مامور ہوا ۔ اگرچہ اسے بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل حاصل تھا اور اس کے دور وکالت میں شروع سے آخر تک

۱ - اکبر نامہ ، جلد سوم صفحہ ۷۵۱ ۔ اگرچہ وہ قندھار میں مامور تھا لیکن کام سندھ میں کرتا رہا اور فتح سندھ میں مصروف رہا ۔ لیکن واپسی کے بعد بھی سابق عہدے پر اس کا تقرر نہ ہوا ۔

خود بادشاہ نے اس کا بہت خیال رکھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے نظم و نسق میں اس نے کبھی اپنا ذاتی اثر استعمال نہیں کیا ۔ خسرو کے خسر کی حیثیت سے وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا ، جو جہانگیر کی تخت نشینی کے خلاف تھے اور اس نے اس بارے میں اکبر سے واضح طور پر اظہار خیال بھی کر دیا تھا لیکن اس کی بات پر قطعاً توجہ نہ ہوئی ۔ اس جانب دارانہ رویے کے باعث اس کا وقار یقیناً بہت کچھ گھٹ گیا ہوگا۔ اگرچہ اکبر کے انتقال تک وہ اس عہدے پر مامور رہا لیکن اس زمانے کے کسی انتظامی معاملے میں اس کا دخل ظاہر نہیں ہوتا ۔

پس خان خاناں کی وکالت کی طرح اس کا دور وزارت بھی حقیقی اختیارات کے استعمال اور کسی کار نمایاں کی انجام دہی کے بجائے زیادہ تر ظاہری شان و شوکت اور ذاتی تزک و احتشام کی علامت کے طور پر گزرا ۔[1]

۱۲ سنہ جلوس میں منعم خاں کے تبادلے کے بعد عہد اکبری کے باقی ماندہ ۳۸ سال کے دوران میں منصب وکالت پر تقریباً تین سال تک مظفر اور عبدالرحیم خان خاناں فائز رہے اور دس سال تک خان اعظم۔ اکبر کے جانشین اس معاملے میں بھی اسی کی حکمت عملی پر کار بند رہے اور بعد میں کسی وکیل کو وہ رسوخ و اختیار نصیب نہ ہو سکا جو ایک مطلق العنان شہنشاہ کے وزیر خاص کو عموماً حاصل رہتا ہے ۔

---

۱ - اکبر نامہ' جلد سوم- ماثر الامرا- جلد اول صفحہ ۶۸۰- بڑی شاہی مہر (اُزک نہیں) اسی کی تحویل میں رہتی تھی ۔ وہ قلعہ اسیر گڑھ کے محاصرے میں بادشاہ کے ساتھ تھا ۔

شریف کو بلند ترین درجہ اور امیرالامراء[1] کا اعلیٰ ترین خطاب عطا کیا گیا اور وہ طبل و علم اور تمن توغ کے ان تمام اعزازات سے سر فراز ہوا جو بیرم خاں کو حاصل تھے۔ اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس کی وجہ سے جہانگیر کے دور میں منصب وکالت کے حامل کو از سر نو پہلے ہی سے اختیارات حاصل ہو جائیں گے لیکن ۲ سنہ جلوس میں وہ سخت علیل ہو گیا اور اس منصب پر دوسرے شخص کا تقرر لازم ہوا۔

اب اس عہدے پر آصف خاں کا تقرر ہوا اور اسے بھی وہی منصب پنج ہزاری عطا کیا گیا۔ جہانگیر نے اپنے نئے وکیل پر یہ نوازش بھی کی کہ تناول طعام کی دعوت کو شرف قبول بخشا اور خاندان شاہی اور امرائے سلطنت کے ساتھ اس کے گھر قدم رنجہ فرمایا۔[2]

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ صحت یاب ہونے کے بعد شریف شریک دربار ہونے لگا۔ لیکن پھر کبھی اسے کامل صحت نصیب نہ ہوئی اور جہانگیر کا بیان ہے کہ اس کی قوت حافظہ بالکل زائل ہو چکی تھی۔ 'جو کچھ اس سے کہا جاتا تھا وہ اسے لمحے بھر کے بعد بھول جاتا تھا'۔[3] اسی لیے آصف خاں منصب وکالت پر حسب سابق برقرار رہا لیکن چوتھے سال یہ دونوں دکن بھیج

۱۔ خان خاناں کا خطاب نہیں دیا جا سکا کیونکہ عبدالرحیم اس کا حامل تھا۔

۲ - تزک - صفحہ ۵۰- معتمد خاں- صفحہ ۲۸- آصف خاں (جعفر بیگ قزوینی)۔

۳ - تزک - صفحات ۵۰، ۱۱۳ -

دیے گئے جہاں کی فوجی صورت حال اس امر کی متقاضی ہو گئی تھی کہ وہاں زیادہ فوجیں جمع کر دی جائیں اور مہم کے سر کرنے میں زیادہ مستعدی سے کام لیا جائے۔ یہ دونوں آخر وقت تک وہیں رہے اور انہیں دارالسلطنت واپس آنے کا کبھی موقع نہ دیا گیا۔[۱]

آصف خاں کی موت پر جہانگیر نے جو بات کہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اس پر اعتبار نہ تھا اور آخر تک اس کی طرف سے شکوک باقی رہے۔ اس طرح ایک شخص خرابی صحت کی بنا پر الگ ہوا اور دوسرا اعتماد شاہی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے علٰحدہ کیا گیا۔ اگر ان میں سے کوئی بھی دربار میں موجود رہتا تو سلطنت کے نظم و نسق میں کچھ نہ کچھ دشواریاں ضرور پیدا ہوتیں اور دیوان کے اختیارات پر بھی کچھ اثر پڑتا۔ اس طرح جہانگیر بھی قدم بہ قدم اکبر کی راہ پر گام زن رہا۔ چنانچہ اس نے بھی منعم کی طرح آصف خاں کو میدان جنگ میں مصروف کر دیا جہاں اس کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا تھا۔ لیکن مجموعی حیثیت سے جہانگیر اپنے دونوں وکلا کے علم و استعداد کی تعریف کرتا ہے۔[۲]

آصف خاں، آخری وکیل سلطنت

تخت نشینی کے چوتھے سال کے بعد جہانگیر نے اکبر کے تتبع میں امور سلطنت کا انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اکیسویں سال تک کوئی وکیل مقرر نہ کیا۔ اپنے عہد حکومت

۱ - تزک - صفحات ۱۰۸، ۱۱۳ - شریف اور آصف دونوں کا انتقال ۸ سنہ جلوس میں ہوگیا۔

۲ - تزک - صفحات ۱۰۸ اور ۱۱۳ -

کے آخری سال میں جب جہانگیر مہابت خاں کی گرفت سے خلاصی پا کر کابل سے واپس آیا تو منصب وکالت اعتمادالدولہ کے فرزند آصف خاں کو عطا کیا گیا لیکن اگر یہ اقدام اس کے باپ کے انتقال کے بعد، ۱۶ سنہ جلوس ہی میں کیا جاتا تو سلطنت اس تراج اور انتشار سے محفوظ رہتی جو درمیانی زمانے میں رونما ہوا۔ آصف خاں کے ساتھ دیوان کی حیثیت سے ابوالحسن کا تقرر بھی ہوا۔

اس طرح ۲۲ سالہ عہد حکومت کے دوران میں کل تین اشخاص مجموعی طور پر صرف پانچ سال تک منصب وکالت پر فائز رہے۔

آصف خاں، شاہ جہاں کے دور میں بھی اپنے منصب پر برقرار رہا۔ بادشاہ کا خسر ہونے کی حیثیت کے علاوہ، اس حیثیت سے بھی کہ وہ شاہجہاں کو تخت شاہی تک پہنچانے کا موجب بنا تھا، اسے وہ تمام اعزازات حاصل رہے جو کسی وزیر کو حاصل ہو سکتے تھے۔ اسے منصب ہشت ہزاری سے سرفراز کیا گیا جس سے بلند تر اعزاز اس وقت تک امرائے سلطنت میں کسی کو عطا نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے لیے ' فرامین میں عموی (چچا)' کا لقب تحریر کیا جاتا تھا۔[1] اس کی دختر یعنی ملکہ ممتاز محل کی درخواست پر مہر شاہی بھی اسی کے سپرد کر دی گئی تھی۔[2] اسے نوبت رکھنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی جو صرف خاندان شاہی کے افراد سے مخصوص

---

۱ - لاہوری - جلد اول، صفحہ ۱۱۴ -

۲ - لاہوری - جلد اول، صفحہ ۱۸۰ — ۴ سنہ جلوس میں جب وہ دکن بھیج دیا گیا تو مہر بیگم صاحب کو دے دی گئی اور اس کے بعد اسی کی تحویل میں رہی - (صفحہ ۴۰۶)

تھی -[1] لیکن جہاں تک نظم و نسق کے دستور کا تعلق ہے اس میں اس کی شخصیت کی عظمت کے باوجود کوئی تبدیلی روا نہ رکھی گئی اور دیوان کی حیثیت اور اختیارات میں کوئی فرق نہ آیا -

آصف خاں نے ۱۰ سنہ جلوس میں داعی اجل کو لبیک کہا[2] اور اس کے بعد شاہ جہاں نے اپنے عہد حکومت میں پھر کسی کو وکیل مقرر نہ کیا - اس کے مقرر کردہ باقی وزرا دیوان کل ہوا کرتے تھے نہ کہ وکیل -

وکیل کا انصرام کار | وکالت کے پہلے دور میں اتکہ خاں اور منعم ، سیاست ، مالگزاری اور مالیات کے متعلق تمام امور کے ذمہ دار تھے اور زمانہ ما بعد کے دیوان کی طرح دیوان خاص میں بیٹھ کر روز مرہ کا معمولی کام بھی کرتے تھے - اسی دیوان میں اتکہ خاں کے قتل کیے جانے کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وکیل سلطنت کی مسند پر بیٹھا کرتا تھا اور ان لوگوں کی نشست بھی اسی دیوان میں تھی جنھیں بادشاہ اس محکمے کا کام انجام دینے کے لیے مقرر کیا کرتا تھا - جس وقت ادھم خاں دیوان میں داخل ہوا ، وہاں شہاب الدین اور منعم بھی ان دیگر "عمائد کے ساتھ موجود تھے جو سرکاری فرائض انجام دے رہے تھے"-[3]

---

۱ - آئندہ صفحات میں ' انعامات و امتیازات ' کے تحت دیکھیے -

۲ - لاهوری ، جلد دوم- صفحہ ۲۰۷- انتقال کے وقت اس کا منصب ، ۹ هزار ذات اور ۹ هزار سوار کے "تمام دو اسپہ و سہ اسپہ" تھا - جس سے ۱۶ کڑور ۲۰ لاکھ دام بطور مشاہرہ حاصل ہوتے تھے - یہ رقم مالیت میں ۴۰ لاکھ روپے سالانہ کے برابر تھی -

۳ - اکبر نامہ ، جلد دوم ' صفحہ ۱۷۳ ' ترجمہ - صفحہ ۲۶۹ - ۷ سنہ جلوس -

مالگزاری اور مالیات کی علحدگی کے بعد، دفتر کا روز مرہ کا کام دیوان ہی کے سپرد رہا ہوگا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مظفر اپنی وکالت کے زمانے میں نظم و نسق میں نسبتاً زیادہ دخیل رہا اور چونکہ اس کے بارے میں واضح احکام موجود تھے، اس لیے وہ دیوان کے کام پر نگرانی رکھتا تھا اور تمام کاغذات بادشاہ کے سامنے ضرور اس کے توسط ہی سے جاتے ہوں گے۔ ایک جگہ ابوالفضل نے مظفر کے بارے میں سرسری طور پر جو کچھ لکھا ہے اس سے مظفر کے ان اختیارات کا اندازہ ہوتا ہے جو اسے وزارت کے صدر کی حیثیت سے حاصل تھے۔ ''جب وہ اپنے فرائض منصبی پر مامور ہو کر خدمات شائستہ انجام دینے لگا تو بد نصیبی سے قسمت کی یاوری کو بھول گیا جو خدا نے بخشی تھی اور ہر بات کو اپنی ہی ذات سے منسوب کرنے لگا۔ وہ دنیاوی کامیابی کے نشے میں ایسا مست ہوا کہ تمام انتظامی کامیابیوں کا سہرا اپنے سر باندھنے لگا۔ خارجی امور کے انتظامات پر بھی اس نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جہاں پناہ نے تو تدبیر سلطنت کے لحاظ سے اس کو وکیل کا خطاب بخشا تھا لیکن وہ بے وقوف رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اس عہدے کا واقعی اہل سمجھنے لگا اور اس کے غرور میں آئے دن اضافہ ہونے لگا''۔[۱]

یہ اقتباس اس کے پہلے دور وکالت سے متعلق ہے جب اس نے جاگیرات کے انتظام میں اصلاح کے مسئلے پر استعفاء دے دیا تھا لیکن وہ بہ حیثیت مجموعی بھی اپنی انفرادی رائے کا مالک اور

۱- اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ٦٨، ترجمہ صفحہ ۹۴-

اس پر سختی سے قائم رہنے والا معلوم ہوتا ہے۔ اپنی وکالت کے دوسرے دور میں بھی جب وہ راجہ ٹوڈرمل اور خواجہ شاہ منصور کے ساتھ کام کر رہا تھا اس کا اصول کار وہی رہا جو پہلے تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ اصول کار کے بارے میں ہر معاملے اور اس کی تفصیلات کے متعلق روزانہ اس کے اور راجا کے درمیان جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے۔[1] لیکن تینوں دو سال تک کام کرتے رہے، آخر مظفر کا تبادلہ ہو گیا اور یہ سلسلہ ختم ہوا۔

یہ زمانہ تعمیر و ترقی کا زمانہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو رویہ مظفر نے اختیار کیا تھا وہ جاری نہ رہ سکا اور کئی بار طویل مدت تک اس عہدے کے خالی پڑے رہنے کی وجہ سے بھی نظم و نسق میں مظفر کا طرز عمل رواج نہ پا سکا۔ اس کے بعد تمام کام دیوان کی نگرانی میں ہونے لگا اور آئین کے قواعد سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف ایسے کاغذات جو بادشاہ کے ملاحظے میں پیش ہونے والے ہوتے اور اس کے صادر کردہ احکام وکیل کی معرفت گزرتے تھے[2] لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ وہ دیوان کے فرائض منصبی کی انجام دہی کے سلسلے میں کسی طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ صرف کاغذات وصول کرنے اور تمام فرامین پر اپنی مہر لگانے کا اسے حق حاصل تھا۔[3]

---

۱ - بدایونی، جلد دوم - صفحہ ٦٥ -

۲ - مسودہ، ضمیمہ ٦٥٨٥ ' جزو ٥٦ - '' صوبوں کے مالی گوشوارے اور دیگر تمام کاغذات جو دیوان اعلیٰ کے دفتر میں وصول ہوتے ہیں ' وکیل کے دفتر کو بھیجے جائیں ''۔

۳ - مسودہ ضمیمہ ٦٥٨٥ ' جزو ٥٣ - واقعہ نویس وہ تمام اطلاعات جو روزانہ شام تک صوبوں سے وصول ہوتیں (الف) آصف خاں کو پڑھ کر سناتا تھا - (ب) تمام مالی منظوریوں کی اسناد پر اس کی مہر لگائی جاتی تھی -

جہانگیر کے دور میں آصف خاں کو یہ قطعی حکم تھا کہ وہ دیوان میں اجلاس کرے اور سیاسی و مالی امور کا نگران رہے۔[۱] جن حالات میں اس کا تقرر عمل میں آیا تھا ان میں یہ حکم ضروری تھا لیکن شاہ جہاں کے زمانے میں بھی آصف دیوان ہی میں اجلاس کرتا رہا۔ چندر بھان لکھتا ہے کہ وہ دیوان اعلیٰ میں افضل خاں کے ساتھ اجلاس کرتا تھا اور ان دونوں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔[۲]

تاریخ شاکر خانی میں جو محمد شاہ کے دور حکومت سے تعلق رکھتی ہے، ضمنی طور پر اس عہد کے دیوان کی ترتیب کا ذکر آیا ہے جب آصف خاں وہاں اجلاس کیا کرتا تھا۔ آصف خاں کا اجلاس کچہری میں ہوتا تھا اور وہیں اس کے مقابل چار گز کے فاصلے پر افضل خاں بیٹھتا تھا۔ دیوان کے دونوں پیشکار اس کے پیچھے بیٹھا کرتے تھے۔ صادق خاں میر بخشی، آصف خاں کے داھنی طرف اس کی مسند سے دو گز کے فاصلے پر بیٹھتا اور وکیل کے بائیں جانب چار گز کے فاصلے پر بخشی تن بیٹھا کرتا تھا۔ میر بخشی اسے صوبہ داروں، فوجداروں اور صوبوں کے دیوانوں سے متعلق کاغذات پیش کرتا تھا۔ افضل خاں جاگیروں کے ان مقدمات کا فیصلہ کرتا جو اس کے پیشکار پیش کرتے اور اپنے دستخط سے احکام جاری کرتا تھا۔

۱- تزک۔ صفحہ ۳۱۲۔

۲- مسودہ ضمیمہ ۱۸۹۲۔ صفحات ۹۴، ۹۵۔

میر بخشی روزانہ دربار عام میں بادشاہ کے حضور کچہری کی تمام کارروائیوں کی روئداد پیش کیا کرتا تھا۔[1]

تاریخ شاکر خانی کے مؤلف کا خیال ہے کہ آصف خاں کو دیوان میں اجلاس کرنے کا حق خاص طور پر عطا کیا گیا تھا اور اس نے اس امر کو آصف خاں کے خاص اعزازات کی فہرست میں شمار کیا ہے جن میں نوبت کا استعمال اور دیوان خاص و عام کے دروازے تک پالکی میں آنے کی اجازت وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن آصف خاں کو خاص مراعات حاصل ہونے کے باوجود، دیوان اعلیٰ کی حیثیت کم از کم اپنے محکمے کے معاملات کی حد تک، غیر متاثر رہی اور اس بات کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آصف خاں اس کے معاملات میں دخل انداز ہوتا ہو۔[2]

دیوان کے سامنے وکلا کے اثر کا ماند پڑ جانا

اکبر کے وکلا میں مظفر خاں قطعی طور پر سب سے بہتر، سب سے زیادہ لائق اور کام میں سب سے زیادہ ہوشیار وکیل تھا۔ لیکن اس کا مقابلہ راجہ ٹوڈرمل سے تھا جسے اہلیت اور وفاداری کی بنا پر ہمیشہ اکبر کی حمایت اور قدر افزائی حاصل رہی۔ چنانچہ مظفر بھی اس عہدے کا درجہ بلند کرنے میں ناکام ہی رہا۔ عبدالرحیم خان خاناں اور خان اعظم مرزا کوکہ کا تقرر صرف اعزازی معلوم ہوتا ہے۔ ان

---

۱ - مسودہ ضمیمہ ۶۵۸۰، جزو ۵۴ الف، بہادر شاہ کے وکیل امیرالامرا اسد خاں نے آصف خاں کی مثال پیش کرکے درخواست کی کہ وہی مراعات مجھے بھی عطا فرمائی جائیں۔ مذکورہ مسودے میں جو باتیں مذکور ہیں وہ اسی سلسلے میں ہیں۔

۲ - ایضاً - جزو ۵۴ ب اور جزو ۵۵ -

سے نظم و نسق کے کام میں مدد لینے کے بجائے اس طرح صرف ان منظور نظر اشخاص کے مدراج بلند کیے گئے اور ان کی حیثیت اور منصب کو ترقی دی گئی۔ نظم و نسق سے متعلقہ امور حسب سابق دیوان ھی انجام دیتے رھے۔

جہانگیر کے دور میں شریف اور آصف دونوں ھی بہت قابل اور مستعد تھے لیکن چونکہ دونوں کا دکن کی طرف تبادلہ ھو گیا اس لیے وہ اپنے قوت و اثر کا مظاھرہ نہ کر سکے۔ جب ھر طرف ابتری کا دور دورہ تھا تو زمام وزارت ایک اور آصف خاں کے ھاتھ میں آئی لیکن اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ اسے اپنے اعلٰی و ارفع مقام اور اثر و رسوخ کے باوجود دیوان یعنی ابوالحسن کے موجود ھوتے ھوئے فی‌الواقع نظم و نسق میں کوئی دخل حاصل تھا یا نہیں، کیونکہ ابوالحسن ابتدائے دور حکومت سے بادشاہ کے ساتھ مراسم رکھتا تھا اور اعتمادالدولہ کے انتقال کے بعد مسلسل ھر عہدے پر فائز رھا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار اور قابل افسر تھا اور اسے اپنے اعزاز اور منصب کی عظمت کا پورا احساس تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے اختیارات کو استعمال کرنا بھی خوب جانتا تھا۔ چہار چمن میں ایک فقرہ یہ ھے کہ وکیل کے سامنے دیوان میں اس کی نشست کا انداز مشہور ھے۔ اس سے پتا چلتا ھے کہ وہ وکیل کی مطلق پروا نہ کرتا تھا اور ایک فقرے سے اشارۃً یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ جب وکیل دیوان میں داخل

ہوتا تھا تو ابوالحسن اس کی تعظیم کے لیے اپنی جگہ سے نہ اٹھتا تھا۔[1] ہاکنز[2] کے بیان سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے اور یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ وکیل اور بادشاہ دونوں کی وقت پر مدد کرنے کے باوجود ابوالحسن کو شاہ جہاں کے دور میں اس کے منصب سے بر طرف کر کے آصف خاں کے نامزد کردہ شخص ارادت خاں کو یہ منصب کیوں سونپ دیا گیا۔ لیکن شاہ جہاں نے اپنے خسر اور وزیر اعظم کا پورا ادب و احترام ملحوظ رکھنے کے باوجود امور سلطنت میں نہ تو اس کی بالا دستی کو پسند کیا اور نہ اسے اس کے استعمال کا کوئی موقع دیا۔ ایک سال کے اندر ہی ارادت خاں کی جگہ علامی افضل خاں کا تقرر ہو گیا جو بادشاہ کا معتمد علیہ مصاحب اور اپنے دور کا قابل ترین فرد تھا۔ اس طرح آصف خاں کے دور وکالت میں ابوالحسن، افضل خاں اور اس کے انتقال کے بعد بادشاہ کا ایک اور مقرب خاص اسلام خاں،[1] اس کے مدمقابل رہے۔ لہٰذا اسے بھی یہ موقع کبھی نہ ملا کہ اپنا حکم چلا سکے یا حقیقی اختیارات صرف کر سکے۔ سلطنت کے نظم و نسق کی حد تک صرف دیوان کو اختیارات کلی حاصل تھے اور اس زمانے کی تاریخ میں اسی کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔

---

۱ - مسودہ ضمیمہ ۱۸۹۲، جزو ۹۱ "اس کے باوجود اسے علحٰدہ نہیں کیا گیا" (یعنی جہانگیر کے دور حکومت میں) دیوان کے تعلقات میر ساماں (میر جملہ) اور میر بخشی (صادق خاں) کے ساتھ بہت اچھے تھے۔

۲ - ہاکنز۔ صفحات ۸۸ اور ۹۰ تا ۹۲ -

الغرض وکیل کی حیثیت وهی رهی جو اکبر کے دور میں اس منصب کے پہلے پہل قائم ہونے کے وقت تھی - منصب وکالت کے ساتھ جو اعزاز و وقار وابستہ تھا وہ تو بدستور باقی رہا لیکن اس کے اختیارات سلب ہو چکے تھے - اگرچہ سلطنت مغلیہ میں سب سے بڑا عہدہ یہی رہا اور اس منصب پر فائز ہونے والا ، ہمیشہ سلطنت کا ممتاز ترین فرد سمجھا جاتا رہا لیکن اس کے وہ اختیارات ختم ہو چکے تھے جو اس منصب جلیلہ کے نام سے وابستہ تھے -

اس منصب کو گاہ گاہ خالی رکھنے اور بغیر کسی وکیل کے انتظام سلطنت چلانے کے طریقے نے اس کی اہمیت کو اور گھٹا دیا تھا اور یہ نظم و نسق کا لازمی جزو نہ رہا تھا -

اکبر کے دور میں مظفر اور جہانگیر کے دور میں شریف کو منصب وکالت عطا ہونے کی وجہ سے یہ رسم بھی ٹوٹ چکی تھی کہ یہ منصب صرف خاندانی یا با اثر امراء یا دیرینہ خدمت گذاروں هی کو عطا کیا جا سکتا ھے -[1]

لیکن سلب اختیارات سے قطع نظر تمام وکلاء اپنے آقا کے معتمد علیہ اور اس کے نزدیک حد درجہ قابل عزت و احترام رہے - مدارج و مراتب کے اعتبار سے بھی یہ لوگ ملک میں سب سے سربرآوردہ اور عمائد سلطنت میں سب سے ممتاز ہوا کرتے تھے اور

---

۱ - قید سے رہا ہونے کے بعد مظفر نے ایک حاکم پرگنہ کی حیثیت سے ملازمت شروع کی تھی اور شریف کی تو جہانگیر کی تخت نشینی کے قبل کوئی حیثیت هی نہ تھی - جو کچھ اس کے پاس تھا وہ جہانگیر هی نے اسے اپنی شاہزادگی کے زمانے میں دیا تھا -

اسی وجہ سے دیوان سے زیادہ معزز و محترم سمجھے جاتے تھے ۔ بالفاظ دیگر ان کا نام کارپردازان حکومت میں نہیں ، عمائد سلطنت میں سر فہرست رہا کرتا تھا ۔ انھیں اعلیٰ رتبہ ، اعزاز و اکرام اور رعب و داب حاصل تھا مگر اختیارات حاصل نہ تھے ۔

وکلائے سلطنت

نام	سنہ جلوس	مدت
اکبر ۔		
شہاب الدین بہادر خاں	۶	ایک سال
اتکہ خاں	۷	ایک سال
منعم خاں	۷-۱۲	۵ سال
مظفر خاں	۲۲-۲۴	۲ سال
خان خاناں مرزا خاں (عبدالرحیم)	۳۴	چند ماہ
خان اعظم مرزا عزیز کوکہ	۴۰-۵۰	۱۰ سال
جہانگیر ۔		
امیرالامراء شریف خاں	۱	ایک سال
آصف خاں قزوینی	۲-۴	۳ سال
آصف خاں ابوالحسن	۲۱	ایک سال
شاہ جہاں ۔		
آصف خاں ابوالحسن	۱-۱۵	۱۴ سال

اس طرح ۹۷ سال کے عرصے میں یعنی ۱۵۶۰ء سے ۱۶۵۷ء تک دس وکیل گزرے اور اس دوران میں ان کی وکالت کی کل مدت تقریباً ۳۹ سال ہوتی ہے۔ اکبر کے وکیلوں کی وہ فہرست جو آئین کے صفحہ ۲۳۳ میں ملتی ہے، محل نظر ہے۔ اس میں خواجہ جہاں کا نام بھی شامل ہے جس کا تقرر کبھی وکیل کے عہدے پر نہ ہؤا تھا، البتہ چند روز اس نے منعم کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مظفر خاں کا نام اس فہرست میں شامل ہی نہیں، حالانکہ اکبر نامہ میں بحیثیت وکیل اس کا ذکر بکثرت آیا ہے اور اس پر کافی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ مذکورۂ بالا فہرست میں منعم اور مظفر دونوں میں سے کسی کے بھی پہلے دور کی مختصر مدت شامل نہیں ہے۔

باب پنجم

حصہ اول

سرکاری محکمے

خاکہ

اختیارات کی تقسیم اور وزراء کے فرائض :-

تعداد وزرا کے متعلق عباسیوں، عثمانیوں اور ابن خلدون کی رائیں -

سب چار وزیر ضروری سمجھتے ھیں -

سلطنت دھلی کے دور میں بھی نظریہ یہی رہا ، اگرچہ اس پر ھمیشہ عمل نہیں ھوا۔

اکبر اور اس کے مشیروں نے یہ چار وزیر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ (۱) دیوان - (۲) میر بخشی - (۳) میر سامان۔ (۴) صدر -

ہر وزیر کی حیثیت :-

عباسیوں اور عثمانیوں کے دور میں ایک وزیر سب پر حاوی رہتا تھا - ابن خلدون بھی اسی کا مؤید تھا - بلبن کے فرزند بغرا خاں نے کیقباد (سلطان دھلی) کو جو نصیحت کی ہے اس میں وہ اس اصول کی مخالفت

کرتا ہے۔ اس نے چاروں وزیروں کی حیثیت اور درجے میں مساوات قائم رکھنے پر زور دیا ہے۔

اکبر نے اس اصول کی نہ صرف پیروی کی بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ امور مملکت کے متعلق مشورہ صرف چار وزیروں تک محدود نہ تھا بلکہ مجالس مشاورت میں دوسرں کو بھی شریک کیا جاتا تھا۔

اس طرح مملکت کے محکموں کا انتظام تو چار وزراء کے ذمے رہا لیکن مجالس مشاورت میں دوسروں کو بھی شریک کیا جاتا تھا۔ دیوان کا مرتبہ دیگر وزراء سے قدرے بلند کر دیا گیا مگر وہ بالا دست نہ تھا۔

دیوان :— اصطلاح کے معنی۔ دور مغلیہ میں اس اصطلاح کا استعمال۔ مملکت کے محکموں کی جدید تشکیل کا مسئلہ، دیوان کی حیثیت کا تعین

پہلے دیوان مظفر کے دور میں (۹ سنہ جلوس تا ۱۷ سنہ جلوس) حیثیت مسلم ہو گئی

۱۸ تا ۲۰ سنہ جلوس۔ بنگال میں گڑ بڑ کی وجہ سے تبدیلیاں، مظفر کا دوسرا مختصر دور۔ راجہ ٹوڈرمل کا تقرر اور بنگال کو تبادلہ۔ شہاب‌الدین نے تنہا فرائض انجام دیے۔

۲۱ سنہ جلوس — شہاب‌الدین کا تبادلہ مالوہ کر دیا گیا۔ خواجہ شاہ منصور دیوان کل کی حیثیت سے۔

۲۲ سنہ جلوس ــ راجہ ٹوڈرمل اس کے ساتھ شریک ہوا اور مظفر وکیل بنایا گیا

۲۲ تا ۲۴ سنہ جلوس ــ تین افراد کی وزارت ۔ شخصی اختلاف کے باوجود کارگذاری امتیازی رہی ۔ مظفر کا تبادلہ بنگال کا کیا گیا ۔ راجا کی تعیناتی بھی بہار میں کر دی گئی ۔ راجا کی رپورٹ پر خواجہ کو معزول کیا گیا ، لیکن اسے پھر عروج ہوا ۔

۲۴ سنہ جلوس ــ وزیر خاں اور خواجہ منصور ۔ غداری کے الزام میں خواجہ منصور کو سزائے قتل ۔

۲۵ تا ۲۷ سنہ جلوس ــ قلیج خاں ۔ اس کی اصلاحات ۔

۲۷ تا ۳۰ سنہ جلوس ــ راجا اس کا شریک کار بنا ۔ اسے دیوان اعلیٰ بنایا گیا ۔ اس کی اصلاحات ۔

۳۰ تا ۳۴ سنہ جلوس ــ میر فتح الدین شیرازی اور راجہ ٹوڈرمل ۔ فتح اللہ کی اصلاحات ۔ اسی سال دونوں کا انتقال ۔

۳۴ تا ۳۹ سنہ جلوس ــ خواجہ شمس الدین اور قلیج خاں ۔

۳۹ تا ۴۳ سنہ جلوس ــ خواجہ بحثیت دیوان اعلیٰ ۔ قلیج خان کا تبادلہ ۔ خواجہ شمس الدین کا کام ۔

۴۳ سنہ جلوس ــ رائے پاتر داس بحیثیت رفیق کار ۔ خواجہ کا تبادلہ پنجاب کیا گیا ۔

رائے پاتر داس بحیثیت دیوان کل - رشوت ستانی کے باعث
عہدے سے بر طرف کیا گیا -

۴۴ تا ۴۹ سنہ جلوس۔ آصف خاں قزوینی

۴۹ تا ۵۰ سنہ جلوس - مقیم خاں (خطاب وزیر خاں)

۵۰ سنہ جلوس۔ محکمے کو شہزادہ سلیم کی نگرانی میں
دے دیا گیا -

اکبر کے دیوان اور ان کے مختلف دور -

انتظامی نقطۂ نظر سے ۴۲ سالہ دور کی تین حصوں میں
تقسیم -

اکبر کے دیوان - ان کے اوصاف پر ایک نظر-

سرکاری محکمے

منصب وکالت سے اختیارات و فرائض سلب ہو جانے کے باعث یہ ضروری ہوگیا کہ یہ فرائض متعدد وزرا میں اس طرح تقسیم کر دیے جائیں کہ وہ ایک طرف تو نظم و نسق کا بار اٹھا سکیں اور دوسری طرف اپنے اپنے اثر و اختیار کو نامناسب طور پر استعمال نہ کریں - یہ اس طرح ہو سکتا تھا کہ سلطنت کا کام وزراء میں تقسیم کر دیا جائے اور انھیں ایک دوسرے کی مداخلت سے آزاد رکھ کر صرف بادشاہ کے حضور میں جوابدہ قرار دیا جائے۔

وزرا کی تعداد اور محکمے

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ فان کریمر (Von Kremer) کے قول کے مطابق خاندان عباسیہ کے حکمران کے نزدیک ایک معزز قاضی، ایک انصاف پسند کوتوال، ایک کاروباری مہارت رکھنے والا وزیر مالیات اور ایک قابل اعتماد صاحب برید، حکومت کے رکن رکین تھے - فان ہیمر (Von Hammer) کا خیال ہے کہ چار کے عدد کو ترک اور مسلمان دونوں مبارک و مسعود سمجھتے تھے -[۱] ”عثمانی مصنفین اپنی حکومت کو ایک خیمے سے مشابہ قرار دیتے تھے جو چار بلند ستونوں یعنی (الف) وزراء، (ب) ”قاضی عسکروں“ (ج) دفترداروں اور (د) ”نشانچیوں“ پر استادہ ہو“۔[۲]

---

۱ اور ۲ - فان ہیمر، بحوالہ لائبیر (Lybyer) - صفحات ۴—۱۶۳ -

(الف) سلطان کے وزرا و مشیران خاص برائے صلح و جنگ و انتظام عدالت -

ابن خلدون بھی مرکزی حکومت کے چار سر بر آوردہ افسروں کا ذکر کرتا ہے: (الف) وزیر کو حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے فوجی اختیارات بھی حاصل تھے اور وہ دربار میں بھی کام کیا کرتا تھا (ب) دیوان اعمال و خراج (وزیر مال)۔ (ج) حاجب۔ اس کے ذمے دربار کا انتظام ہوا کرتا تھا اور امرائے سلطنت اور دیگر اشخاص دربار شاہی میں بار یابی پانے کے لیے اسی کا وسیلہ اختیار کیا کرتے تھے۔[1] (د) دیوان رسائل و مکاتبت۔ فرامین شاہی اور دیگر مراسلات کے مسودے تیار کرنے کا دفتر اسی کے سپرد تھا۔[2]

سلطنت دھلی کے زمانے میں محکمہ شاہی کا ذکر پہلی مرتبہ بغرا خاں کی اس نصیحت میں ملتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے سلطان کیقباد کو کی ہے۔ اس نے بھی اسے سلطنت کے چار رکن مقرر کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ایک دیوان وزارت کا ذمہ دار اور دوسرا دیوان رسالت کا سر براہ ہو۔ تیسرے رکن کے سپرد دیوان عرض اور چوتھے کے سپرد دیوان انشاء کیا جائے (جو ابن خلدون کے بیان کردہ چوتھے دیوان ھی کے مطابق ہے)

(ب) سربراہان محکمہ عدالت۔
(ج) خزانچی۔ خاص خاص خزانچیوں کو بڑی اھمیت حاصل تھی اور انھیں مالگزاری سے متعلقہ امور میں بادشاہ کی خدمت میں باریابی کا حق تھا۔
(د) محافظ خانہ۔

۱۔ لغوی معنی میں ایک افسر جو بادشاہ کو لوگوں کے ھجوم سے محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہو۔

۲۔ ابن خلدون۔ ترجمہ صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۹۔

لیکن جہاں تک ان محکموں کی عملی تنظیم کا تعلق ہے دو دیوان (پہلا اور تیسرا) سلطنت دہلی کے دور میں آخر تک باقی رہے اور محکمہ عدل قاضی ممالک (قاضی القضاۃ یا صدر) مفتی، محتسب و امیر داد (یا دادبک) پر مشتمل تھا۔[1] چوتھے محکمے کے کام کے متعلق کوئی شہادت نہیں ملتی اگرچہ دبیر (معتمد اعلیٰ) کے تقریباً وہی فرائض تھے اور اس منصب کی علاءالدین خلجی کے زمانے میں بڑی اہمیت تھی۔[2]

اکبر اور اس کے مشیر کار بھی مسلم فقہا اور دوسرے مسلم ممالک کے ناظموں سے متاثر تھے اور اس دستور کے پابند رہے جو سلطنت دہلی کے دور میں بھی رائج تھا۔ اس لیے ان وزیروں کی تعداد چار ہی رہی جو فرائض مملکت کی انجام دہی کے ذمہ دار تھے۔ یہ وزرا وکیل کے علاوہ تھے جو اب نظم و نسق کا مستقل یا ناگزیر رکن نہ رہا تھا۔ دیوان یا دیوان کل (دیوان اعلیٰ) مالگزاری اور مالیات کا ذمہ دار تھا جس کی حیثیت سلطنت دہلی کے دیوان وزارت اور ابن خلدون کے دیوان اعمال کے مشابہ تھی۔

میر بخشی یا بخشی اعلیٰ فوجی محکمے کا سربراہ ہو گیا جس کی حیثیت دیوان عرض کی سی تھی۔ میر ساماں وہ سب سے بڑا انتظامی

۱۔ ان عہدہ داروں کے مرتبے اور فرائض کے تعین کے لیے اس کتاب کا وہ باب دیکھیے جو عدل گستری سے متعلق ہے۔

۲۔ برنی کے قول کے مطابق علاءالدین کے زمانے میں یہ چاروں محکمے موجود تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ دیوان عرض کے سوا باقی تمام محکمے سلطان کے آخری زمانۂ حکومت میں ناکارہ ہو گئے تھے۔ ان محکموں کے وجود کے بارے میں بحیثیت مجموعی بس یہی ایک سرسری تذکرہ ملتا ہے (صفحہ ۳۳۷) اسی طرح جہاں عفیف، فیروز شاہ کے دربار کے انتظامات بیان کرتا ہے وہاں بھی (صفحہ ۲۷۹ پر) ان محکموں کے متعلق سرسری ذکر ملتا ہے۔

عہدہ‌دار تھا جس کے سپرد مملکت کے کارخانوں اور مال خانوں کا اہتمام تھا۔ صدر، محکمہ امور مذہبی اور عدالتی محکموں کا افسر اعلیٰ تھا۔

ان کی حیثیت | خاندان عباسیہ کے مذکورہ بالا حکمران کے مشہور اقوال میں وزیر کا کوئی ذکر نہیں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ منصب اس خاندان کے آخر دور کے وزرائے اعظم کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ سلطنت عثمانی میں وزراء من حیث الجماعت سیاہ و سفید کے مالک ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا ان میں سے ایک کو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کر دینے کے بعد دوسرے وزرا کے لیے کسی قسم کا اختیار استعمال کرنے کا کوئی موقع باقی نہ رہتا تھا۔ قصر حکومت کے باقی چار ستونوں کی حیثیت معمولی افسروں کی سی رہ جاتی تھی جو روز مرہ کے تھکا دینے والے انتظامی کام کی انجام دہی میں مشغول رہتے تھے۔ شہری، فوجی اور عدالتی اختیارات، نیز بادشاہ کو صلاح و مشورہ دینے کا حق صرف وزیر کو حاصل تھا۔ ابن خلدون کی بھی یہی رائے ہے کہ شہری اور فوجی اختیارات وزیر ہی کو حاصل رہنے چاہئیں اور نظم و نسق کا سربراہ بھی وہی ہونا چاہیے۔ یہ تمام فقہا اسی نظریے کے حامی ہیں کہ ایک ہی وزیر کو زیادہ سے زیادہ قوت اور اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ اگر بعض کو اس سے کچھ اختلاف ہے بھی تو وہ اصولی نہیں، صرف فروعی ہے۔

سلطان بلبن کے بیٹے بغرا خاں نے سلطنت کے چار ستونوں کے متعلق جو مشورہ دیا ہے وہ اصولی طور پر مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے

که چاروں کو سلطنت میں برابر کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے اور بادشاہ کے نزدیک چاروں کا مرتبہ یکساں ہونا چاہیے اگرچہ نظم و نسق کی ضروریات کے اقتضاء کے مطابق دیوان وزارت زیادہ توجہ کا مستحق ہے لیکن وہ دوسروں کا حاکم بالا دست نہیں ہونا چاہیے اور نہ یہ ضروری ہے کہ تمام امور اسی کی وساطت سے طے پائیں۔

مجالس مشاورت میں شرکت کے لیے چاروں وزیروں کو برابر کا حق اور چاروں کے مشوروں کو مساوی وقعت حاصل ہونی چاہیے۔ ہر صادر کردہ حکم، ہر ظاہر کردہ رائے اور ہر معین کردہ حکمت عملی پر چاروں کی موجودگی میں بحث و تمحیص ہونی چاہیے اور ان میں سے کسی پر لطف خاص کا اظہار نہ ہونا چاہیے مبادا اس سے باقی ماندہ تین وزرا کی دل شکنی ہو اور نہ ان چار کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو معاملات نظم و نسق میں بے جا مداخلت کا موقع ملنا چاہیے۔

اس طرح وزیر کی جو حیثیت معین ہوئی وہ ایسی ہی ہے جس سے بعد میں اکبر نے بھی اتفاق کیا۔ وکیل کی عدم موجودگی میں شہنشاہ اکبر کے وزیر کو بھی وہی حیثیت حاصل رہی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس کا شمار سلطنت کے چار ستونوں میں ہوا کرتا تھا اور اس کے سپرد ایک علحدہ محکمے کا انتظام رہتا تھا۔ مرتبے اور حیثیت کے اعتبار سے وہ دوسرے وزراء سے کسی قدر بلند تھا مگر وہ کسی کا حاکم بالا دست نہ تھا۔ دوسرے وزراء کے محکموں پر عام نگرانی رکھنا اس کے فرائض میں داخل نہ

تھا ۔ وہ سرکاری طور پر دوسرے وزراء پر نہ کوئی بندش لگا سکتا تھا اور نہ ان پر اثر ڈال سکتا تھا ۔ اپنے اپنے شعبوں کی حد تک دوسرے وزراء اس کی دخل اندازی سے آزاد تھے ۔ لیکن اکبر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور نہ صرف مشوروں کی حد تک بلکہ نظم و نسق کے معمولی کاموں کے سلسلے میں بھی اس نے چاروں وزراء کے فرائض میں کچھ اس طرح کی خوشگوار ہم آہنگی پیدا کر دی کہ حکمت عملی سے متعلقہ امور اور ہر محکمے کے اہم معاملات کے سلسلے میں ہر وزیر کو دوسرے کے ساتھ ربط ضبط قائم رکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی ۔

اکبر نے تدبیر سلطنت کے مشوروں کو صرف چار وزراء تک محدود نہ رکھا تھا بلکہ تمام عائد و امرائے سلطنت کے لیے کچھ مدت تک دربار میں حاضر رہنے کا دستور بنا کر اس نے اپنا دائرہ شوریٰ بہت وسیع کر لیا تھا اور وہ ان لوگوں کے تجربے سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتا تھا ۔

ان دونوں اصولوں پر کن خاص خاص طریقوں سے عملدر آمد کیا جاتا تھا اور اس عملدر آمد کی تفصیلات کیا تھیں اس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا ۔

دیوان

اصطلاح کا مفہوم

ایرانی لفظ ''دیوان'' (بیاے مجہول) کا تعلق لفظ 'دبیر' بمعنی تحریر کنندہ سے ہے اور یہ

سریانی لفظ ''دیپ'' (؟) سے مشتق ہے جو جمع و خرچ کے ان سرکاری رجسٹروں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن میں اندراجات ابتدائی فتوحات کے زمانے میں شام و مصر میں تو بزبان یونانی اور ایران میں بزبان پہلوی کیے جاتے تھے ۔ پھر اس لفظ کا عربی میں ترجمہ ہوا اور یہ اس زبان میں رائج ہو گیا......اس کے بعد یہ نام سرکاری خزانے کے دفتروں کے لیے استعمال ہونے لگا اور بالآخر خلفائے عباسیہ کی حکومت نے بھی اسے اختیار کر لیا......[1] ابن خلدون لکھتا ہے کہ مالگزاری اور مالیات کے افسروں کی رہبری کے لیے وقتاً فوقتاً جو قواعد و ضوابط بنائے جاتے تھے ، ان کے رجسٹر کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا کرتا تھا اور بعد میں اس کا اطلاق نہ صرف خود ان افسروں پر بلکہ ان کے بیٹھنے کے ایوان پر بھی ہونے لگا ۔[2] ایرانیوں کے پاس یہ طریقہ زمانۂ قدیم سے چلا اتا تھا اور اس پر بڑی باقاعدگی سے عمل ہوا کرتا تھا ۔ ''مذکورہ رجسٹر میں ان کی کل آمدنی اور کل مصارف درج ہوا کرتے تھے اور کوئی بات چھوڑی نہ جاتی تھی ۔ وظیفہ پانے کے مستحق اشخاص کے نام اس میں

---

۱ - انسائکلوپیڈیا آو اسلام ۔ صفحہ ۹۷۹ ۔

۲ - ترجمہ ۔ صفحہ ۱۰۵ ۔ وہ اس کے متعلق ایک واقعہ بھی یوں بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ نوشیرواں اس ایوان میں جا پہنچا جہاں اہلکاران محکمہ، اعداد شماری زبانی اور جلد جلد کر رہے تھے ۔ اس نے انھیں اس حال میں دیکھ کر کہا '' یہ سب دیوانے معلوم ہوتے ہیں '' اس وقت سے یہ لفظ وہاں کام کرنے والے اہل کاروں کے لیے اور بعد میں خود اس ایوان کے لیے بھی استعمال ہونے لگا ۔

درجه وار لکھے جاتے تھے تا کہ غلطی کا کوئی امکان باقی نہ رہے''۔[۱]

دور مغلیه میں اس اصطلاح کا استعمال

سلطنت دھلی کے زمانے میں یه لفظ عموماً وزیر مالگزاری و مالیات کے محکمے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ، نیز یہ لفظ محکمۂ فوج کے لیے بھی استعمال ھوتا تھا جو ابتداءً وزیر مذکور کے محکمے کے ساتھ ملحق تھا۔ دور مغلیه میں اس اصطلاح کے مفہوم میں زیادہ قطعیت پیدا ھو گئی اور یہ صرف مالگزاری و مالیات کے سر براہ کے لیے مختص ھو گئی۔ اکبر کے عہد میں اس عہدے کے لیے لفظ وزیر کا استعمال بہت کم نظر آتا ھے ، اس کے بجائے لفظ دیوان زیادہ ملتا ھے۔ عہد جہانگیری میں اس کے بر عکس عمل کیا گیا اور لفظ وزیر کم و بیش مسلسل استعمال ھوتا رھا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اس لفظ کے معنی زیادہ قطعی ھو گئے اور وزیر کو 'دیوان کل' اور اس کے شرکائے کار کو 'دیوان' کہنے لگے۔

چونکہ زیر بحث دور میں نہ تو کوئی تحریری دستور حکومت موجود تھا اور نہ وزراء کے تقرر، یا سلطنت میں ان کی حیثیت اور حکومت کے دوسرے شعبوں سے ان کے تعلق کے تعین ، نیز ان کے فرائض و اختیارات اور ان کے کام کی صراحت کے متعلق کسی قسم کے قواعد و ضوابط نافذ تھے ' اس لیے مغلیه دور کے منصب وزارت

---

۱ - لٹریری ھسٹری - براؤن (تاریخ ادبیات ایران، براؤن)، جلد اول، ۱۹۰۹ ء ، صفحه ۲۰۵ '' مملکت اسلامی میں اس کا رواج خلیفۂ عمرؓ کے زمانے میں ھوا''

کے خد و خال کی وضاحت اس وقت تک نہ مناسب ہوگی نہ صحیح، جب تک کہ وہ تمام باتیں بھی نہ بیان کر دی جائیں جو ان کی تشکیل و تعیین کا باعث ہوئیں۔

تاریخ ہند کا زیر بحث دور ایک صدی سے زیادہ مدت تک کی انتظامی شکست و ریخت اور بد نظمی کے بعد تعمیر و ترقی کا دور تھا۔ گزشتہ کئی صدیوں کی تاریخ نے جو سبق آموز اور عبرت انگیز مثالیں اس دور کے ارباب نظم و نسق کے سامنے پیش کی تھیں ان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ کون سی راہیں خطرناک ہیں اور کہاں ٹھوکر کھا کر گرنے کا اندیشہ ہے لیکن قطعیت کے ساتھ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ صحیح راہ عمل کون سی ہے۔ مغلوں کو رہنے کے لیے ایک گھر تو ضرور مل گیا تھا لیکن اس میں سکونت اختیار کرنا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ اس کے کچھ حصے منہدم ہو چکے تھے، کچھ گر رہے تھے اور مضبوط و مستحکم حصہ بہت تھوڑا باقی رہ گیا تھا۔ لہٰذا اس گھر کی از سر نو تعمیر کے ساتھ اس میں مناسب رد و بدل کرنا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔

بیرم خاں کے زوال کے بعد اکبر نے جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کیا اس پر ہم گذشتہ باب میں نظر ڈال چکے ہیں۔ منصب وکالت کے سلسلے میں ابتداءً جو کام کیا گیا وہ انہدام کا تھا۔ وکیل کا وجود اس گرتی ہوئی عمارت پر ایک گنبد کی طرح نظر آتا تھا جو اس کے لیے بہت بھاری تھا اور نئی عمارت کے لیے بہت بد نما۔ نئے نقشے میں وہ عمارت کے پہلو میں ایک مینار تھا جو

عمارت کا جز نہ تھا بلکہ جو قدیم عمارت اور اس کی شان و شوکت کی ایک یادگار کے طور پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

ابتداءً اس منصوبے پر عملدرآمد کرنے میں یہ دقت پیش آئی کہ موزوں اور قابل آدمی نایاب تھے۔ شہاب الدین ، ماہم انگہ، اتکہ خاں اور منعم کا گروہ پیچیدگیوں کو سلجھانے اور نوجوان شہنشاہ کے دل پر اپنی اہلیت کا سکہ بٹھانے میں ناکام رہا ۔یہ لوگ پرانے طور طریق کے پابند تھے - یہ اپنے فکر و عمل کو جدید ضروریات کے مطابق ڈھال لینے کے قابل نہ نکلے - اس کے علاوہ ان میں وہ تمام قبیح خصائل بھی موجود تھے جو حکومتوں اور سلطنتوں کے زوال کے وقت روبہ انحطاط قوموں میں پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔[1] یہ لوگ اپنے طبقے کی عام سطح سے قطعاً بلند ثابت نہ ہوئے۔ اس دور کے پہلے دو سال میں (یعنی ۱۵۶۰ء سے ۱۵۶۲ء تک) منصب وزارت میں جو تبدیلیاں ہوئیں اور بعد میں منعم کی اپنے پنج سالہ عہد وکالت میں جو حیثیت رہی اس سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے ۔اس تجربے کے بعد پرانے مسلک کے کسی پیرو کو وزارت کا کام سپرد نہ کیا گیا۔[2] پہلا دیوان سلطنت مظفر خان تھا۔

---

۱ - خود غرضی ، فقدان اخلاص ، افتراق وغیرہ اگرچہ جرات ، اہلیت ، علم یا قوت کار کردگی کی کمی نہ تھی—ان خصائل کی یکجائی عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن ایسے حالات عموماً قوموں کی زندگی میں اس کی مثالیں پیدا کر دیتے ہیں۔

۲ - خالصہ اراضی کا انتظام شہاب الدین کے سپرد رہا۔ لیکن اسے منصب وزارت پر فائز ہونے کا موقع کبھی نہ دیا گیا۔

اس کے تقرر کے وقت منصب وکالت سے مالگزاری اور مالیات کا کام علٰحدہ کر دیا گیا ۔ اسے محاصل ملکی کا عملی تجربہ تھا ، بیرم خان کے ماتحت کام کرنے کے علاوہ وہ افسر پرگنہ بھی رہ چکا تھا ۔ علاوہ ازیں دیوان بیوتات کی حیثیت سے کام کرچکنے کی بدولت وہ مرکزی حکومت کے نظم و نسق سے بھی واقف تھا ۔ جو شخص کسی محکمے کے پہلے زینے سے کام شروع کر کے چوٹی تک پہنچے وہ اس محکمے کے کام کی تفصیلات کے ذاتی تجربے سے مالامال ہوتا ہے ۔ ایسا تجربہ یک لخت بر سر اقتدار آ جانے والے افسران اعلیٰ کو حاصل نہیں ہوتا ۔ اعلیٰ طبقے سے تعلقات یا کسی قسم کی سفارش کے بغیر اس پر اکبر کی نظر انتخاب پڑ جانا اس کی قابلیت اور اہلیت کی بہت بڑی دلیل ہے ۔ منعم کے عہد وکالت میں اس نے دیوان کی حیثیت سے کام کیا اور خواجہ جہاں اس کا رفیق کار رہا ۔ یہ سلسلہ ۱۲ سنہ جلوس تک جاری رہا ، جب منعم کا تبادلہ بنگال کا ہو گیا اور خواجہ جہاں اپنے عہدے سے الگ کر دیا گیا ۔ اس تین سال کے عرصے میں اکبر نے دیوان کی حیثیت اور اس کے درجے کو بلند کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس کی حیثیت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکی تھی ۔ اسی کی شکایت پر میر بخشی لشکر خاں اور خواجہ جہاں معزول کیے گئے تھے اور اسی معاملے میں اپنی آلودہ دامنی کے باعث منعم کو مرکزی حکومت سے ہاتھ دھو کر مشرقی حصۂ ملک

میں جانا پڑا تھا - جیسا کہ پہلے[۱] بیان کیا جا چکا ہے ، اس مرحلے پر وزارت کے تین ارکان ہوا کرتے تھے اور تینوں ایک دوسرے کے رفقائے کار کی طرح کام کیا کرتے تھے - ان تینوں کو برابر کی حیثیت اور مساوی اختیارات حاصل تھے۔[۲]

۱۲ سے ۱۷ سنہ جلوس تک مظفر ایک خود مختار وزیر اور دیوان کی حیثیت سے کام کرتا رہا - وہ کسی وکیل کے ماتحت نہ تھا - ۱۳ سنہ جلوس میں کام کی مزید تقسیم کر دی گئی اور اور اراضئی خالصہ کا کام شہاب الدین کو تفویض ہوا - معلوم ہوتا

---

۱ - صفحات ۱۸۲-۱۸۳ کتاب ھذا -

۲ - اکبر نامہ ، جلد دوم، صفحہ ۲۲۹ (۱) - ''خواجہ جہاں اور مظفر امور سلطنت انجام دیتے تھے'' (منعم بادشاہ کے ساتھ مالوہ میں تھا)

اکبر نامہ، جلد دوم، صفحہ ۲۴۸ (۲) ''مظفر خان جس کے مشورے سے امور سلطنت انجام دیے جاتے تھے''

اکبر نامہ، جلد دوم، صفحہ ۲۵۹ (۳) ''خواجہ جہاں جس کے مشوروں پر امور سلطنت کی انجام دہی کا انحصار تھا''

اکبر نامہ، جلد دوم ، صفحہ ۲۷۶ (۴) ''دارالحکومت کا انتظام منعم خان کے اور امور دیوانی مظفر کے سپرد تھے''

اکبر نامہ، جلد دوم' صفحہ ۲۵۹ (۵) منعم' مظفر اور خواجہ جہاں نے مشترکہ طور پر صلح کی گفت و شنید بمقام کڑا کی -

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مندرجۂ بالا مواقع پر، خواہ مذکورہ وزیروں نے مشترکہ طور پر کام کیا تھا خواہ الگ الگ، لیکن بحیثیت وزراء ان کا درجہ مساوی تھا -

ہے کہ یہ اراضی دیوان کے اختیارات سے خارج رکھی گئی تھی اور اس کا انتظام کرنے والا وزیر دیوان کے ماتحت نہ ہوتا تھا۔[۱]

۱۷ سنہ جلوس میں مظفر پر عتاب نازل ہوا اور وہ بادشاہ کی بارگاہ میں گستاخی کرنے کی پاداش میں معزول کر دیا گیا۔

اس طرح مظفر کے عہد دیواتی کے دور اول کا خاتمہ ہو گیا۔ اپنے عہد کے اس آٹھ سال کی مدت میں (یعنی ۹ سے ۱۷ سنہ جلوس تک) محکمے کے سربراہ اور شہنشاہ کے وزیر خاص کے طور پر اس کی حیثیت استوار ہو چکی تھی۔ اس کے اثر اور مرتبے کی مذکورۂ بالا مثالوں کے علاوہ شیخ عبدالنبی کا واقعہ بھی شاھد ہے کہ بڑے بڑے مناصب کے عطا کرنے میں بھی مظفر کو ضرور دخل تھا۔ ابوالفضل اور بدایونی دونوں نے عبدالنبی کے صدر مقرر کیے جانے کا موجب کلی طور پر مظفر خاں کو قرار دیا ہے۔[۲]

یہ وہ زمانہ تھا جب حدود سلطنت کی توسیع اور انتظام حکومت کو استوار بنیادوں پر قائم کرنے کا کام ساتھ ساتھ ہو رہا تھا۔ دوآبہ زیر نگیں آ چکا تھا۔ راجپوتانے کی شورشیں فرو ہو چکی

---

۱ - مولف ماثرالامراء میں صاف صاف لکھتا ہے (۱) شہاب الدین کو اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ دیوان کے ذمے بے انتہا کام تھا اور وہ خالصے کے انتظام پر پوری توجہ نہیں کر سکتا تھا۔ (جلد دوم۔ صفحہ ۵۶۹) - (۲) ۱۹ سنہ جلوس میں ایک سرسری حوالے (اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۸۷) سے پتا چلتا ہے کہ شہاب الدین خالصے کا وکیل تھا۔

۲ - اکبر نامہ، جلد دوم، صفحہ ۲۴۸ - ابوالفضل کا خیال ہے کہ یہ تقرر مظفر نے کیا تھا اور بعد میں اکبر کی منظوری حاصل کرلی تھی۔ بدایونی جلد دوم صفحہ ۷۱ -

تھیں۔ مالوہ اور گجرات فتح ہو چکے تھے اور مغل فوجیں بنگال تک پہنچ چکی تھیں جہاں منعم داد کامرانی دے رہا تھا۔

دوسری طرف اراضی کو خالصہ اور جاگیر میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور دونوں کے انتظام میں اصلاحات عمل میں آ رہی تھیں۔ ایسے زمانے میں مظفر نے محکمۂ مالگزاری کے کام میں کئی اصلاحیں کیں۔

مظفر خاں کی معزولی غالباً اس کے دل سے یہ خیال خام دور کرنے کے لیے ضروری سمجھی گئی تھی کہ اس کے بغیر سلطنت کا کام نہیں چل سکتا اور کچھ یہ جتانا بھی مقصود تھا کہ کوئی فرد تنظیم کے اصول کو توڑنے کا مجاز نہیں ہے۔ بہر حال مقصد حاصل ہو گیا اور مثال قائم کر دی گئی لیکن صرف ایک خطا پر مظفر خاں کو ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی خدمات پسندیدہ ملحوظ رکھی گئیں اور اس کے ہنر اس کے عیوب سے بڑھ کر پائے گئے۔ چنانچہ اسے حجاز چلے جانے کا جو حکم ملا تھا، وہ منسوخ کر دیا گیا اور وہ دوبارہ دربار شاہی میں طلب کر لیا گیا،[1] ۱۸ سنہ جلوس میں اسے مالوے کا حاکم مقرر کرکے بھیج دیا گیا اور یہ اس لیے کیا گیا کہ وہ سمجھ لے کہ اس کے بغیر بھی منصب دیوانی کا کام چل سکتا ہے۔ ۱۹ سنہ جلوس میں اسے منصب وکالت پر فائز کیا گیا اور اس طرح لفظ وکالت سے جو اعزاز و وقار وابستہ تھا وہ بھی اسے عطا کیا گیا۔ اب وہ دیوان بھی تھا اور وکیل بھی۔

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم - ترجمہ - صفحہ ۹ -

لیکن یہ عروج چند روزہ تھا۔ اس نے نظام جاگیرات میں اصلاح کے سوال پر بہت جلد بارگاہ شاہی میں اپنا استعفاء پیش کردیا۔[1]

۲۰ سنہ جلوس میں راجا ٹوڈرمل مشرف دیوان بنایا گیا لیکن اسی سال وہ خان جہاں کی مدد کے لیے بنگال بھیج دیا گیا جو وہاں منعم کے انتقال کے بعد حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح مظفر برسر عہدہ نہ رہا اور راجا ٹوڈرمل میدان جنگ میں کار ہائے نمایاں انجام دے کر اپنے آقا کی خدمت کرتا رہا۔

اس تمام رد و بدل اور الٹ پھیر کے زمانے میں شہاب الدین اراضئی خالصہ کے انتظامات کا نگران رہا اور اگرچہ وہ اپنے کام میں خوب مشاق تھا اور مرتبۂ بلند پر فائز بھی تھا مگر اسے وزارت کا موقع نہ دیا گیا۔[2]

اکبر نئے نئے اشخاص کو تجربۃً اس منصب پر فائز کرتا اور ان کے کام سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ ۲۱ سنہ جلوس میں اسی طرح اس کی نظر انتخاب خواجہ شاہ منصور شیرازی پر پڑی جو مالیات

۱۔ اس طرز عمل سے اس نے اپنی جرأت و خودداری کا ثبوت دیا۔ کچھ عرصے بعد اسے اس شاہی لاؤ لشکر کی سرداری پیش کی گئی جو بہار جا رہا تھا۔ لیکن اپنی شان سے فروتر سمجھ کر اس نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس کا خیال درست تھا، کیونکہ جس افسر کو اس منصب پر مامور کیا گیا تھا وہ اس وجہ سے معزول کر دیا گیا کہ لشکر کا ایک ہاتھی گم ہو گیا تھا اور اس نقصان کا سبب اس افسر کی غفلت قرار دی گئی تھی۔

۲۔ ماثر الامراء۔ جلد دوم، صحفہ ۵۷۰۔ اپنی انتظامی صلاحیتوں اور ملک کی خوش حالی اور رعایا کی مرفہ الحالی کا خیال رکھنے کی وجہ سے بہت نیک نام تھا۔

میں خوب دسترس رکھتا تھا۔[1] چنانچہ وہ دیوان بنا دیا گیا۔ اسی سال شہاب الدین مالوے کا عامل مقرر کیا گیا۔ اس کے دوسرے سال راجا ٹوڈرمل بنگال سے واپس آیا اور اسے پھر ایک مرتبہ یہ منصب عطا ہوا۔ اسی سال (۲۲ سنہ جلوس میں) مظفر کو دربار شاہی میں طلب کرکے، مشرقی اقطاع میں اس کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں منصب وکالت عطا کیا گیا۔

اس کے تقرر کا جو حکم جاری ہوا تھا اس سے تینوں وزراء کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ معاملات سلطنت کی تنقیح کرنے کا کام اس کے سپرد ہوا اور باقی ماندہ دو وزراء کو اس کے مشورے سے اپنے فرائض انجام دینے کا حکم ہوا۔

لہٰذا ایک مرتبہ پھر وزارت کے تین رکن ہو گئے جن میں سے ایک وکیل قرار پایا۔ لیکن جیسا کہ گذشتہ باب میں مذکور ہوا

۱۔ یہاں لفظ ' وزارت ' استعمال ہوا ہے لیکن دیوان اور وزیر کی اصطلاحیں ابوالفضل کی تصانیف میں کوئی قطعی مفہوم نہیں رکھتیں۔ وہ دونوں الفاظ کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرتا ہے اکبر نامہ، جلد سوم۔ صفحہ ۱۹۳ اور پھر صفحہ ۲۹۳ پر وہ خواجہ کو دیوان لکھتا ہے)۔ منصور بھی قید سے رہا کر دیا گیا۔ وہ منعم کا معتمد اور اس کی جاگیر کا نگران تھا۔ منعم کے انتقال کے بعد راجا ٹوڈرمل نے اس سے منعم کی جاگیر کا حساب طلب کیا اور اسی سلسلے میں اسے پابہ زنجیر بھی کر دیا (۲۰ سنہ جلوس)۔ اسے بھی کسی سفارش کے بغیر رہا کیا گیا۔ پہلے اکبر اس سے مل چکا تھا اور اس کے دل میں اس کی جگہ اسی وقت پیدا ہو گئی تھی (ماثرالامراء۔ جلد اول۔ صفحہ ۶۵۳ تا ۶۵۸)

اس طرح گویا ایک مرتبہ پھر بادشاہ نے اپنا حکم چلایا اور ذاتی قابلیت کی قدر کی۔ (بدایونی، جلد دوم، ص ۲۴۰)۔ یہ مورخ اسے ایک ''کلرک'' (نویسندۂ شیراز) کہتا ہے۔

مظفر منعم سے مختلف قسم کا آدمی تھا ۔[1] اس نے اپنے منصب اور مرتبے سے پوری طرح کام لیا ۔ تاہم چونکہ وہ صرف دو ہی سال اس عہدے پر رہا ، اس لیے اس کے طرز عمل سے اس عہدے کی نوعیت پر کوئی اثر نہ پڑا ۔ علاوہ ازیں راجا ٹوڈر مل بھی اب تک کسی کا دبیل بننے کے لیے آمادہ نہ ہو سکا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مظفر اپنے رفقائے کار سے بر سر پیکار ہی رہا مگر با ایں ہمہ یہ وزارت دو سال تک بر قرار رہی اور باہمی اختلافات کے باوجود اس نے اچھے کام انجام دیے ۔ اس موقع پر ابوالفضل ملازمت شاہی میں داخل ہو گیا جس کے توسط سے اس وزارت کے کام کی کچھ زیادہ تفصیلات ہم تک پہنچتی ہیں ۔ جب اکبر نے پنجاب کا دورہ کیا تھا تو ابوالفضل بھی اس کے ساتھ تھا اور دورے کے کوائف کے ذیل میں اس نے بر سبیل تذکرہ ان کے کام کی تفصیل بھی بیان کی ہے ۔

وزارت کا کام اس دورے میں ایک مجلس مشاورۃ[2] برپا ہوئی ، جس میں حسب ذیل امور طے پائے :—

(الف) بہار کی سرکار متعدد عہدہ داروں کو بطور جاگیر تفویض کی گئی ۔[3]

---

۱ ۔ ابوالفضل اس موقع پر لفظ وکالت استعمال نہیں کرتا البتہ اس موقع پر یہ لفظ استعمال کرتا ہے جب ۲۴ سنہ جلوس میں اس کا تبادلہ بنگال کا ہوا تھا ۔

۲ ۔ اکبر نامہ ، جلد سوم ۔ صفحات ۲۲۰ تا ۲۰۷ ۔ تینوں وزراء بادشاہ کے ساتھ تھے اور مجلس مذکور انہی تین وزراء پر مشتمل تھی ۔

۳ ۔ شجاعت خاں ۔ میر معزالملک اور چند دیگر عہدہ دار ۔

(ب) ٹکسالوں کا انتظام چودھریوں کے ہاتھوں سے نکال کر حکومت کے تحت کیا گیا اور ٹکسالیں حسب ذیل سرکاری عہدہ داروں کے سپرد کی گئیں۔

(۱) لاہور کی ٹکسال مظفر کے سپرد ہوئی۔

(۲) بنگال کی ٹکسال راجا ٹوڈر مل کے سپرد ہوئی۔

(۳) جونپور کی ٹکسال منصور کے سپرد ہوئی۔

(۴) گجرات کی ٹکسال خواجہ عماد الدین حسن کے سپرد ہوئی۔

(۵) پٹنہ کی ٹکسال آصف خاں کے سپرد ہوئی اور

(۶) فتحپور کی ٹکسال خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے سپرد کی گئی۔

(ج) حکم دیا گیا کہ چوکور روپیہ (چہار گوشہ) بنایا جائے۔[۱]

اسی دورے میں راجا کو حکم دیا گیا کہ وہ افغانوں کے ایک جتھے کو منتشر کر کے انھیں مختلف صوبوں میں بھیج دے کیونکہ ان کے مظالم کی کچھ شکایتیں بادشاہ تک پہنچی تھیں اور بعض دیہات اس قدر ان کے زیر اثر تھے کہ عدل و انصاف کے کام میں تاخیر ہوتی تھی اور ان کے خلاف شہادت ملنی بھی دشوار ہو گئی تھی۔[۲]

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم - صفحہ ۲۲۷ - بیورج صفحہ ۳۲۰، ۲ آذر ۲۲ سنہ جلوس -

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم - صفحہ ۲۴۷ -

سید مظفر اور راجا بیربر جالندھر بھیجے گئے تاکہ وہ وہاں جاکر غریبوں کی حالت معلوم کریں اور بادشاہ کو مستحق امداد اشخاص کی خبر دیں۔[1]

حاکم پنجاب، حسین قلی خاں محرم بد انتظامی اور فرائض سے غافل رہنے کی بنا پر معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ سعید خاں مقرر ہوا۔[2]

عمل گذار (کلکٹر) دھلی کے خلاف رعایا کی ایک عرضداشت موصول ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی تحقیقات کے لیے مظفر خاں اور شاہ منصور مقرر کیے گئے۔[3]

دورے سے واپس آنے کے بعد منصور اور مظفر دارالحکومت کے خزانے کے معائنے پر مامور ہوئے۔[4]

۲۴ سنہ جلوس کے شروع میں مظفر صوبۂ بنگال کا حاکم مقرر کیا گیا[5] اور چند ماہ بعد راجا کو فوجی خدمت پر مامور کر کے بہار بھیج دیا گیا تاکہ وہ وہاں سیاسی شورش اور فوجی بغاوت کے فرو کرنے میں مقامی عہدہ داروں کی مدد کرے۔ اس طرح وزارت ٹوٹ گئی اور تنہا خواجہ دیوان کے فرائض انجام دیتا رہا۔

۱۔ اکبر نامہ، جلد سوم۔ صفحہ ۲۴۷۔ ۲۔ ایضاً

۳۔ اکبر نامہ، جلد سوم۔ صفحہ ۲۵۰۔

۴۔ اکبر نامہ، جلد سوم۔ صفحہ ۲۵۷۔ ۲۳ سنہ جلوس۔

۵۔ مظفر نے اس تقرر کو اپنے رتبے کے خلاف سمجھا۔ یہی اس کی نفرت اور دل شکنی کا باعث ہوا۔ اسی سبب سے بنگال کے انتظام میں اس کا دل نہ لگا اور یہی بالآخر اس کی ناکامی اور موت کا باعث ہوا۔ اس موقع پر ابوالفضل نے اس کے حق میں نا انصافی سے کام لیا ہے اور اس پر جو سخت تنقید کی ہے وہ قطعاً نا مناسب ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب خواجہ نے اپنی ذمہ داری پر بہار اور بنگال کی فوجوں کا وظیفہ کم کر دیا۔ اس کی اس حرکت سے فوج کے سربرآوردہ اشخاص کو مزید شکایت کا موقع ھاتھ آیا اور باغیوں کو تقویت پہنچی۔ اس کے باعث صورت حال پر قابو پانے میں راجہ کو بھی دشواریاں پیش آئیں اور اس نے بادشاہ کی خدمت میں جو یادداشت بھیجی اس میں خواجہ کی اس کارروائی پر سخت نکتہ چینی کی اور اس کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی۔ خواجہ کے طرز عمل کو قابل اعتراض قرار دینے میں ابوالفضل بھی راجہ کی تائید کرتا ھے: ”حسابات میں مہارت رکھنے اور (حکومت کو) فائدہ پہنچانے کی غرض سے وہ فوجی مصارف کی جانچ پرتال نہایت باریک بینی سے کرتا تھا۔ وہ وزیر کے فرائض کے صرف ایک پہلو کو مد نظر رکھ کر سرکاری واجبات کی وصولی میں سختی سے کام لیتا تھا ......خواجہ اپنے صحیح راستے سے ھٹ کر سرکاری آمدنی بڑھانے کے درپے ھو گیا۔ اس نے آشوب زمانہ اور نزاکت وقت کا قطعاً لحاظ نہ کیا۔ بس یہ مطالبہ کیا کہ بقایا ادا کر دیا جائے۔ راجہ ٹوڈر مل نے اطلاع دی کہ عمائد سلطنت خانہ جنگی میں مبتلا ھیں اور موت کا بازار گرم ھے۔ ایسے باھمی مناقشات کے زمانے میں عہدہ داران حکومت زمانے کے حالات سے بے خبر رہ کر یا ان سے بے پروا ھو کر کام کر رھے ھیں ....ایسی جسارت کو کیا کہا جائے؟ اور ایسے شخص کا شمار کس زمرے میں کیا جائے گا جو بے سوچے سمجھے مطالبات کیے جا رھا ھو؟“

خواجہ معزول کر دیا گیا اور مشرقی صوبوں کے جنگی سپاھی اس عنایت بے غایت کی اطلاع پا کر از سر نو جاں نثاری پر کمر بستہ

ہو گئے اور انہوں نے ہمت کا قدم آگے بڑھایا۔ صدہا اشخاص نے نافرمانی سے توبہ کی اور دوبارہ اطاعت گزار بن گئے۔''[1]

دیوان کے عہدے پر وزیر خاں سابق حاکم گجرات کا تقرر کیا گیا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ قاضی علی بغدادی اس کا مددگار مقرر ہوا۔ ابوالفضل اس کا ذکر نہیں کرتا لیکن اس موقع پر بدایوانی ہی زیادہ قابل اعتماد ہے کیونکہ قاضی علی سے اسے ذاتی خصومت تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے نائب صدر کی حیثیت سے بادشاہ کی توجہ اس بات کی جانب مبذول کرائی تھی کہ بدایوانی کو خدمت کی شرط پر جاگیر عطا ہوئی ہے لیکن وہ اس وقت کوئی خدمت انجام نہیں دے رہا ہے۔ اس عہدے پر اس کے تقرر کے بارے میں بدایونی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اس کے جذبات کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے۔[2]

اسی سال خواجہ عہدے پر بحال کر دیا گیا، کیونکہ یہ معلوم ہوا کہ حسابات نویسی اور بقایا طلب کرنے میں خواجہ کا کوئی قصور نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف اتنا کہ وہ سرکاری آمدنی میں

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم - صفحات ۳۱۵ - ۳۱۶ اور ۳۶۱ - ۳۶۲

۲ - بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۲۸۷ - " قاضی علی بغدادی دل آزار، منحوس، منکوس، بوم شکل، مردود الرب و الخلق ....

سبحان اللہ ایں چہ ترکیب مناسب است "

اس کی موت پر کہتا ہے :—

چونکہ قاضی علی بغدادی — حسرت یادگار با خود برد
خامۂ منشئ قضا بنوشت — سال‌تاریخ او کہ موذی مرد

اس نے اس کا سال وفات الفاظ، موذی مرد، سے نکالا ہے - صفحہ ۳۸۱

صرف وزیر ان چند خوش قسمت لوگوں میں ہے جن کے خلاف بدایونی کچھ نہیں لکھتا۔

اضافه کرنے کے خیال کے ساتھ وقت کے تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھتا تھا۔[1] اس کی معزولی سے ایک طرف تو راجہ کی دلداری ہو گئی، دوسری طرف مشرق میں اس کے مخالفین کی خوشنودی سے ایک سیاسی مقصد بھی پورا ہو گیا۔ با ایں همه آخر کار ایک قابل اور کار گزار دیوان ان مقاصد پر قربان نہ کر دیا گیا۔ لیکن زیادہ مدت تک بادشاہ کا اعتماد حاصل رہنا خواجہ کی قسمت میں نہ تھا۔ وہ اسی سال اکبر کے خلاف مرزا حکیم کی سازش میں ماخوذ ہوگیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور عدالتی تحقیقات کے بعد اسے قتل کی سزا دی گئی۔ ایک مغل وزیر کو سزائے قتل ملنے کی یہ واحد مثال ہے[2] اور بڑی درد ناک ہے۔

اس واقعے سے ایک نہایت قابل دیوان اور ماہر مالیات کے کارناموں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ اسی کے عہد دیوانی میں

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۳۲۷ - بیورج، صفحہ ۴۸۰ -

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۳۴۴ - بیورج، صفحہ ۵۰۴ - صفحات ۵۰۴ و ۵۰۵ کا حاشیہ بھی دیکھو -

ابوالفضل فیصلے کی تائید کرتا ہے - بدایونی - (جلد دوم - صفحہ ۲۹۳) اسے نہایت مناسب سزا کہتا ہے - ''خوش باش کہ ظالم نہ برد رہ بہ سلامت''، خوش ہو جا کہ ظالم سلامت نہ بچا - مانسریٹ بھی (صفحات ۶۰ و ۹۸) جو بہ دوران مقدمہ کیمپ میں موجود تھا، ابوالفضل کی رائے سے اتفاق کرتا ہے - بظاہر ابوالفضل ہی اس کی اطلاع کا ذریعہ معلوم ہوتا ہے - وہ مختلف مواقع پر اسے اپنا دوست کہتا ہے -

صاحب ماثرالامراء (جلد اول - صفحات ۶۵۶ تا ۶۵۷) بعض ایسی دوسری شہادتوں کی بنا پر جو ہم تک نہیں پہنچیں اس واقعے کو امراء کی سازش کا نتیجہ قرار دیتا ہے - نیز یہ رائے رکھتا ہے کہ ان سازشوں میں راجہ ٹوڈرمل اور کرم اللہ برادر شہباز خاں کا خاص ہاتھ تھا - وہ کہتا ہے کہ جب اکبر کابل پہنچا اور اس نے موقع پر ہر معاملے کی تحقیقات کی تو الزام غلط ثابت ہوا اور اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا -

قلمرو بارہ صوبوں میں تقسیم کی گئی اور ہر صوبے میں حاکم صوبہ کے ساتھ علحدہ علحدہ ایک دیوان اور بخشی کا تقرر ہوا۔[۱] دہ سالہ بندوبست بھی اسی کے زمانے میں کیا گیا اور اسے کامیاب بنانے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے : ''اگرچہ اس عظیم الشان بندوبست کو کامیاب بنانا راجہ ٹوڈرمل اور خواجہ شاہ منصور کے سپرد کیا گیا تھا لیکن راجہ مشرق صوبوں کو بھیج دیا گیا اور تنہا خواجہ نے محض اپنی دانائی اور زیرکی سے ان بلند پایہ ہدایات کو سمجھا اور اس اعلیٰ منصوبے کی تکمیل کی''۔[۲]

اس کی موت پر وزارت کا تیسرا دور ختم ہو گیا اور امور دیوان قلیچ خاں کو تفویض کیے گئے۔ قلیچ خاں گجرات کا حاکم رہ چکا تھا اور اپنی انتظامی صلاحیت کے علاوہ ملک اور رعیت کی خیر خواہی کے لیے بھی مشہور تھا۔[۳]

زین خاں کوکلتاش اور حکیم ابوالفتح کو بھی دیوان میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ یہ حکم بہت مبہم ہے۔ اس میں انھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ دیوان میں بیٹھیں اور معاملات سے باخبر رہیں۔ ان کی حیثیت قطعاً واضح نہیں ہے لیکن ہم انھیں کم از کم، باقاعدہ وزیر نہیں کہہ سکتے۔ نہ کہیں کسی بات کے سلسلے میں ایسا کوئی اشارہ ان کی اس حیثیت کے بارے میں ملتا ہے۔ بہر حال وہ دیوان میں بیٹھتے تھے۔[۴]

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۲۸۲ - بیورج، صفحہ ۴۱۳، ماثرالامراء، جلد اول، صفحہ ۶۵۴، ۲۴ سنہ جلوس۔

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۲۸۲ - بیورج، صفحات ۴۱۳ و ۴۱۴، ماثرالامراء، جلد اول، صفحہ ۶۵۴، ۲۴ سنہ جلوس۔

۳ - ماثرالامراء، جلد سوم، صفحہ ۶۹ -

۴ - اکبر نامہ جلد سوم، صفحہ ۴۴۳ - ۲۵ سنہ جلوس۔

بنگال سے واپس آنے کے بعد راجہ کو بھی وزارت میں شامل کر لیا گیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ھے کہ اُس نے اس پر یہ محسوس کیا کہ اسے بھی دوسروں کی طرح بالکل معمولی شخص سمجھا گیا ھے اور کام کی زبردست ذمہ داری کے خطرات کے خیال سے نیز دورخے اور دہ زبان اشخاص کی حرکتوں کے باعث اس نے دل سے کام نہیں کیا۔ لہٰذا اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اس کا تقرر اشرف دیوان کے عہدے پر کیا گیا اور اس طرح گویا فی‌الواقع اسے وکیل کی حیثیت عطا کردی گئی،،۔[1] اس صورت حال نے قلیج خان کو اس کی اعلیٰ ترین حیثیت سے محروم کردیا اور اب جملہ امور راجہ ٹوڈرمل کے زیر اختیار آ گئے۔

قلیج خان کی وزارت کا ایک عظیم‌الشان کارنامہ یادگار رہے گا۔ اس نے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے قلمرو کے تمام جاگیرداروں اور داروغوں کو ھدایت کی گئی کہ وہ موضع وار تمام باشندوں کی تعداد اور ان کے پیشے قلمبند کریں اور ان کی درجہ بندی کریں انھیں یہ ھدایت تھی کہ وہ کسی ایک فرد کو بھی بے کار یا بے روزگار نہ بننے دیں اور لوگوں کی آمدنی اور خرچ کی سخت جانچ پرتال کریں............تاکہ بہت جلد یہ معلوم ہو جائے کہ کون کون اشخاص بظاھر خوشحال مگر بہ باطن بد حال ھیں۔....... اس حکم سے جو روشن خیالی پر مبنی تھا، ھر کس و ناکس کو فائدہ پہنچا اور وسیع وعریض سر زمین ھند کو بہت امن حاصل ھوا۔[2]

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم - بیورج، صفحہ ۵٦۱ - ۲۷ سنہ جلوس۔
۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحات ۳۴٦ و ۳۴۷ - بیورج صفحہ ۵۰۹۔

اس حکم سے دو باتیں مقصود تھیں - اول قلمرو کی مردم شماری دوم پدرانہ شفقت کے ساتھ امن عامہ کی برقراری، یعنی ملک کے انتظام میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ ہر شہری کو کسی نہ کسی پیشے یا کام میں مصروف رکھنا حکومت کا فرض ہے، تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں کو فائدہ پہنچے - بد قسمتی سے یہ فہرستیں کہیں نہیں ملتیں ورنہ ان سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ قلمرو کے دور دراز گوشوں میں رہنے والوں اور دیہات کے ان باشندوں کی اس وقت کیا حالت تھی جن کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں -

راجہ ٹوڈر مل کی اصلاحات

یہ پہلا موقع تھا جب راجہ کو وزارت میں غلبہ حاصل ہوا اور اس نے اس موقع کو اپنے دو پیش رو وزیروں یعنی مظفر اور منصور کی طرح اپنی قدر و قیمت اور کارگزاریاں دکھانے کے لیے استعمال کیا - ''اس نے عزم و استقلال کے ساتھ آئین خلافت کو بر قرار رکھا اور اس باب میں وہ نہ طاقتوروں سے خائف ہوا نہ مکاروں سے - .... اس نے متعدد ضوابط وضع کیے،، ....

ان میں سے پہلے چند ضوابط محصّلین کے فرائض سے متعلق تھے جن میں لگان کی وصولی کی بابت قواعد اور مقررہ لگان سے زیادہ رقم وصول کرنے پر جرمانے کے احکام شامل تھے -

دوسرا ضابطہ دو کے بجائے ایک محرر (بتکچی ؟) مقرر کیے جانے سے متعلق تھا - تیسرے اور چوتھے مجموعوں میں زراعت کو ترقی دینے سے متعلق قواعد تھے - نیز وہ طریقے بیان کیے گئے تھے

جن پر عمل کر کے لگان کی رقم رفتہ رفتہ وصول کی جا سکے اور بالتدریج بڑھتی بھی جائے ۔ ان میں کاشتکاروں کو نقد قرضے دینے کے قواعد بھی مذکور تھے ۔ محصلین کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ہر سال جملہ حالات کی رپورٹ ارسال کرتے رہیں ۔ انھیں حسابات کا خلاصہ ہفتہ وار بھیجنے کی تاکید کی گئی ۔ نیز یہ حکم دیا گیا کہ وصولی کے روزنامچے ہر ماہ کے آخر میں صدر دفتر کو ارسال کیا کریں ۔

پانچویں اور چھٹے ضابطے کی رو سے نقصان رسیدہ آراضی کی فہرستیں صدردفتر بھیجنے کی ہدایت کی گئی تھی ۔ ساتویں میں سرکش مزارعین کو راہ راست پر لانے سے متعلق احکام تھے ۔

آٹھویں اور نویں ضابطے لگان کی تحصیل سے متعلق تھے اور ان میں محصل، پٹواری اور خزانچی کو ضروری ہدایات دی گئی تھیں ۔

دسواں ضابطہ اس امر سے متعلق تھا ۔ کہ عہدہ داران خالصہ اور جاگیردار اپنے اپنے علاقوں کے بدچلن فرمانبردار اور نافرمان اشخاص کی بابت صحیح صحیح اطلاعات ارسال کیا کریں، تاکہ انھیں جزا وسزا دی جا سکے اور رشتۂ حکومت مستحکم رہے ۔ اس میں قلیج خان کے مذکورۂ بالا کام کا بھی ایک حصہ شامل تھا ۔

گیارھویں ضابطے کے ذریعے یہ معین کیا گیا تھا کہ پیمائش کرنے والوں کو فی بیگھہ کتنی رقم دی جائے ۔[۱]

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحات ۳۸۱ تا ۳۸۳ - بیورج - صفحات ۵۶۳ تا ۵۶۶ -

یہ تجاویز بادشاہ کے حضور میں پیش کی گئیں اور اس نے کافی غور و خوض کے بعد انھیں منظور کر لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ مجلس وزرا میں پیش ہوئیں نہ کسی وزیر سے ان کے بارے میں کوئی مشورہ کیا گیا۔ اکبر اگر چاہتا تو ان سے مشورہ کر سکتا تھا لیکن دیوان کو حق حاصل تھا کہ بحیثیت دیوان جب وہ ان سے مشورہ کرنا نہ چاہتا تو وہ انھیں نظر انداز کر سکتا تھا۔ راجہ نے بھی اس موقع پر یہی کیا ہوگا۔

اس طرح راجہ تیسویں سال تک سیاہ و سفید کا مالک رہا، حتیٰ کہ بادشاہ نے لاہور میں اس کے مکان پر قدم رنجہ فرما کر اس کی عزت افزائی فرمائی۔[۱] اور یہ اعزاز و اکرام بلا وجہ نہ تھا، کیونکہ اس واقعے کے چھ ماہ بعد امیر فتح اللہ شیرازی کو وزارت میں شامل کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ راجہ ٹوڈر مل مالی و انتظامی امور "میر کے مشورے سے انجام دے اور وہ (میر) ایسے تمام پرانے معاملات کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے جو مظفر خاں کے زمانے سے محتاج توجہ ہیں۔ اسے ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی دور اندیشی سے جو باتیں معلوم کرے اعلیٰ حضرت کو ان سے مطلع کرتا رہے"

اس حکم سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اول۔ میر فتح اللہ کے لیے لفظ وکیل، دیوان، یا وزیر استعمال نہیں کیا گیا۔ اسے امین الملک کہا گیا جس طرح راجہ کو اشرف دیوان کہا گیا تھا ان الفاظ کے استعمال سے اکبر کی یہ حکمت عملی بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ لفظ وزیر یا وکیل کے استعمال سے بچتا تھا اور اس عہدے نیز

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم صفحہ ۴۶٦ - پنجاب کا دورہ کرتے ہوئے ۳۰ سنہ جلوس -

اس سے وابستہ جملہ امور کی اھمیت کو گھٹا کر کم سے کم کر دینا چاھتا تھا۔

دوم۔ اس حکم سے یہ قطعاً واضح ھو جاتا ھے کہ میر راجہ پر مسلط کر دیا گیا تھا۔

سوم۔ اس سے یہ بھی واضح ھوتا ھے کہ محکمے میں ایک سے زیادہ وزراء کے تقرر کے باوجود باقی ماندہ کام ختم نہ ھوا تھا چنانچہ فرمان میں اس کا ذکر خاص طور پر کیا گیا۔ اسی طرح اکبر نے ایک دوسرے موقع پر کہا کہ خواجہ (منصور) کے مر جانے پر مالی امور کا انتظام درھم برھم ھو گیا۔[۱]

اس حکم میں قلیج خاں کا ذکر نہیں ھے۔ لیکن میرا خیال ھے کہ بقایا کام کی تکمیل اور راجہ کے غیر مصالحت پسند مزاج کے پیش نظر وہ اپنے عہدے پر برقرار رکھا گیا ھو گا۔[۲]

میر فتح اللہ نے اپنا کام پورے جوش و خروش اور خلوص کے ساتھ شروع کیا۔ اس نے بھی اپنے فاضل پیش روؤں کی طرح چند مزید اصلاحات تجویز کیں جن کے لیے اس وقت تک کافی گنجائش موجود تھی۔ ان تجاویز کا مقصد ایسے انتظامی نقائص کو دور کرنا تھا جو گزشتہ ضوابط کے نفاذ کے بعد ظاھر ھوئے تھے۔ یہ تجاویز راجہ کی تجویزوں سے زیادہ وسیع تھیں۔ ھر تجویز کی تائید میں ایسے واقعات بھی بیان کر دیے گئے تھے، جن سے ثابت ھوتا تھا کہ مجوزہ اصلاح ضروری ھے۔ اس کی ان تجاویز سے جو بیش مختلف عنوانات کے تحت

---

۱ - ماثرالامرا، جلد اول، صفحہ ۶۵۷-

۲ - اس عہدے سے اسے ۳۴ سنہ جلوس میں علحٰدہ کیا گیا جبکہ اسے لاھور میں راجہ کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔

تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں محکمے کے طریق کار کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ نیا وزیر اپنے کام کو خوب سمجھتا تھا۔

پہلی تین تجاویز لگان وصول کرنے، مزارع کو رسید دینے اور حساب رکھنے سے متعلق ہیں۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی تجویز کا تعلق مزارعین کے تساہل سے ہے۔ ان میں رعیت کے مفاد کی خاطر پٹواریوں، مقدموں اور پاکاروں (درمیانی اشخاص) کے کام پر بھی زیادہ کڑی نگرانی رکھنے کے احکام درج ہیں۔

ساتویں سے پندرھویں تک تمام تجاویز اس بارے میں ہیں کہ تحصیل دار کے تعلقات محکمۂ مرکزی سے اور بالخصوص مرکز شعبۂ تنقیح حسابات سے کیسے تعلقات ہونے چاہییں۔ تجاویز میں تحصیل داروں کی وہ مشکلات بھی پیش نظر رکھی گئی ہیں جن کا ذکر انھوں نے فرائض منصبی سے قاصر رہنے کے متعلق اپنے وضاحتی جوابات میں کیا تھا۔ مجوزہ اصلاحات میں ان مشکلات کا حل بھی پیش کیا گیا ہے، بہتر نظم و نسق کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں اور تحصیل داروں کے ساتھ انصاف بھی کیا گیا ہے۔

سولھویں تجویز میں ایک بہترین اصلاح یہ پیش کی گئی ہے کہ مرکز میں ہر پرگنے کا ایک قانون گو رکھا جائے جو حسب موقع اپنے فرائض منصبی سے متعلقہ امور کی وضاحت کرتا رہے۔

سترھویں اصلاح خزانے سے تعلق رکھتی ہے اور اٹھارھویں بقایا رقوم کی جانچ پرتال کی ضروریات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ انیسویں میں جاگیرداروں کی ہمت افزائی کی گئی ہے تاکہ وہ اپنی

جاگیروں کی حالت بہتر بنائیں اور بادشاہ سے یہ سفارش کی گئی ہے کہ ان کے درجات و وظائف میں اضافے کے وقت ان کی جاگیروں کی خوش حالی و ترقی کو پیش نظر رکھا جائے۔ بیسویں تجویز اس سپاہی کی تنخواہ سے جرمانہ وضع کرنے کے قواعد پر مشتمل ہے جو اپنا گھوڑا داغنے کے لیے پیش کرنے سے قاصر رہے۔[1]

یہ تجاویز بادشاہ کی خدمت میں پیش ہو کر منظور ہو گئیں۔ ابوالفضل اس پر اپنی رائے کا اظہار یوں کرتا ہے ''چونکہ یہ تجاویز نیک نیتی اور اصابت رائے پر مبنی تھیں، لہٰذا فوراً منظور کر لی گئیں۔ پرانے حسابات کی حالت درست کی گئی اور اس قابل آدمی کی کاوشوں کی بدولت دارالوزارت عامۃ الناس کے لیے سرچشمۂ مسرت بن گیا''۔

اسی وزارت کے دور میں غلے کی ارزانی کے باعث چار مرتبہ مختلف مقامات پر لگان میں کمی کی گئی اور مرکزی محکمے نے اس سلسلے میں جو شرحیں مقرر کیں ان کا اطلاق عہدہ داروں کی جاگیروں پر بھی کیا گیا۔[2]

۱۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحات ۴۵۷ تا ۴۰۹، بیورج صفحات ۶۸۷ تا ۶۹۳۔

۲۔ (۱)۔ الہ آباد، اودھ اور دھلی کے صوبے — فصل ربیع کے $5\frac{1}{2}$ حصوں میں ایک حصہ۔ اور خاص الہ آباد میں پانچواں حصہ۔ صوبجات الہ آباد و اودھ۔ فصل خریف کا چھٹا حصہ۔ خالصہ کو نقصان ہوا۔ ۷ کڑور، ۷ لاکھ، ۴۷۰۶۲ درم۔ ۴۷۶۸۶۷۱ روپے (اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۴۶۳، ۳۰ سنہ جلوس)۔

(۲)۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۴۹۱۔ ۳۱ سنہ جلوس۔ الہ آباد، اودھ، دھلی چھٹا حصہ چھوڑا گیا۔

(۳)۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۲۳۔ ۳۳ سنہ جلوس۔ آگرہ۔

۳۲ سنہ جلوس میں راجہ ٹوڈر مل کا شہباز خاں میر بخشی سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اس نے اتنا طول کھینچا کہ ایک تحقیقاتی عدالت مقرر کی گئی۔ یہ تحقیقاتی عدالت خان خاناں، میر فتح اللہ، حکیم ابوالفتح اور ابوالفضل پر مشتمل تھی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ''ذاتی نفع کے خیال نے دونوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا''۔ چنانچہ مناسب تدابیر کے ذریعے ''دلوں کا غبار صاف کر دیا گیا''۔[۱]

۳۳ سنہ جلوس میں اکبر نے کشمیر اور کابل کا دورہ کیا جس میں اس کے تمام وزراء بھی اس کے ہمرکاب رہے۔ لیکن یہ دورہ اس کے وزراء کے لیے بہت منحوس ثابت ہؤا۔ کشمیر میں میر فتح اللہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ابوالفتح کی وفات واقع ہوئی اور پھر لاہور میں راجہ ٹوڈر مل کا وقت بھی آ پہنچا اور وہ بھی ملک عدم کی راہ چل کر اپنے رفقائے کار اور مخالفین سے جا ملا۔

میر فتح اللہ کو اس دورے میں، انتقال سے پہلے، ایک تحقیقاتی عدالت کی صدارت کا موقع ملا تھا۔ یہ عدالت ایک شقدار[۲]

دھلی چھٹا حصہ (ربیع) الہ آباد ۱/۴ حصوں میں ایک۔ آگرہ اور اودھ دھلی۔ ایک چوتھائی (خریف)۔

(۴)۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۷۷، ۳۴ سنہ جلوس الہ آباد۔ آگرہ، اودھ، دھلی اور سرکار سہارنپور، بدایوں آٹھواں حصہ۔ سہرند اور حصار۔ دسواں حصہ۔

۱۔ اکبر نامہ۔ جلد سوم، صفحہ ۵۲۵۔ ۳۲ سنہ جلوس۔

۲۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۳۸۔ ۳۴ سنہ جلوس، اللہ بردی شقدار، گماشتہ صادق خاں، متصل سیالکوٹ۔

کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے قائم ہوئی تھی۔ کیونکہ دورے میں اس شقدار کے خلاف ظلم و تعدی کی شکایات پیش کی گئی تھیں۔ شہباز خاں اور قاسم بیگ (میر عدل[۱]) اس تحقیقاتی عدالت کے ارکان مقرر کئے گئے تھے۔ شقدار کا جرم ثابت ہو گیا اور اسے موت کی سزا دی گئی۔

میر فتح اللہ کی موت نے اکبر کو ایک نہایت قابل وزیر کی خدمات سے محروم کر دیا۔ اس کی موت کی خبر سن کر اکبر کی زبان سے جو الفاظ نکلے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ بادشاہ اس کے علم و فضل اور صلاحیت کار کی بڑی قدر کرتا تھا۔ ''میر میرا وکیل، فلسفی، طبیب اور نجومی تھا۔ اس کے انتقال پر مجھے جو رنج ہے، اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اگر وہ فرنگیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہوتا اور فرنگیوں نے بطور فدیہ مجھ سے میری سلطنت کے تمام خزانے طلب کیے ہوتے تو بھی میں اس نفع بخش سودے کو ضرور قبول کرتا اور وہ انمول ہیرا مجھے پھر بھی ارزاں پڑتا''۔ ابوالفضل اسے ''یادگار حکمائے پیشیں'' کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ ''اس عظیم المرتبت ہستی سے مل کر میرے خیالات میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ کمال علم و فضل کے علاوہ، صداقت و دیانت داری اور حسن تدبیر میں اس کا جواب

۱۔ متن میں جو نام درج ہے، یعنی قاسم خاں، غلط ہے۔ نہ وہ میر عدل تھا، نہ موقع پر موجود تھا۔

نہ تھا،، بدایونی بھی اس کے کمالات کا معترف ہے لیکن ساتھ ساتھ برائی بھی کرتا ہے ۔[۱]

میر فتح اللہ اور راجہ ٹوڈر مل کے یکے بعد دیگرے انتقال کر جانے کی وجہ سے قابل ہستیوں کا وہ اجتماع ختم ہو گیا، جس کے باعث وزارت اتنی کامیاب تھی اور ''کام کی گرم بازاری جاتی رہی،،[۲]

اس عہد حکومت کے باقی ماندہ ۱۶ سال میں متعدد تبدیلیاں ہوئیں لیکن خواجہ شمش الدین خوافی کے سوا (جس کا تقرر پہلے میر کی جگہ ہوا اور پھر راجہ کی موت اور قلیج خاں کے حاکم کابل مقرر ہونے (۳۹ سنہ جلوس) کے بعد دیوان کل کے منصب پر فائز کیا گیا) کوئی شخص کسی امتیاز یا خوبی کے لئے قابل ذکر نہیں ملتا ۔ خواجہ شمش الدین خوافی اس عہدے پر فائز ھی تھا کہ ۴۳ سنہ جلوس میں رائے پاتر داس، جو بنگال و بہار کے دیوان کی حیثیت سے امور مال میں تقریباً بیس سال کا تجربہ رکھتا تھا، اس کا شریک کار مقرر ہوا اور یہ حکم جاری کیا گیا کہ دونوں، مظفر اور راجہ کی طرح مل کر کام کریں ۔ لیکن یہ شرکت زیادہ

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۵۸ - بیورج صفحہ ۸۴۸، مآثرالامراء جلد اول، صفحات ۱۰۰ تا ۱۰۴ ۔ بدایونی ۔ جلد دوم، صفحات ۳۱۵، ۳۱۶ - اسے اعتراف ہے کہ ریاضی، طبیعیات، فلکیات، اور علم کے تمام شعبوں میں وہ یگانۂ روزگار تھا ۔ اس کی فضیلت علمی، دانائی اور حسن تدبیر کی وجہ سے بادشاہ اس کی عزت کرتا تھا لیکن فضلاء کی رھی سہی قدر و منزلت بھی میر کی ان حرکتوں کی بدولت جاتی رہی کہ وہ تفنگ بردوش ہرکاروں کی طرح بادشاہ کے پیچھے پیچھے بھاگتا تھا اور امراء کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے ان کے مکانوں پر جایا کرتا تھا ۔

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۶۹، بیورج، صفحہ ۸۶۲ مآثرالامراء، جلد دوم صفحات ۱۲۳ تا ۱۲۹ -

مدت تک قائم نہ رہی ۔ خواجہ کو پنجاب کا حاکم بنا کر پنجاب بھیج دیا گیا اور رائے پاتر داس جو ابھی چند ہی روز بلا شرکت غیرے وزارت کا کام انجام دینے پایا تھا ، رشوت ستانی کے الزام میں عہدے سے برطرف کر دیا گیا ۔[1]

خواجہ شمش الدین ابھی اپنے نئے عہدے پر فائز ہی تھا کہ ہر صوبے میں الگ الگ دیوان مقرر کر دیے گئے اور انھیں براہ راست مرکزی حکومت کے دیوان کل کے ماتحت رکھنے کا فیصلہ ہوا ۔[2]

خالصہ جاگیریں چار حلقوں میں تقسیم کر دی گئیں اور چاروں حلقے مختلف اشخاص کے ماتحت رکھے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتظام زیادہ مدت تک باقی نہ رہا کیونکہ نہ اس کا کہیں ذکر ملتا ہے نہ نئے تقررات ہی کا مذکور ہے ۔[3]

---

۱ - بدایونی ، جلد دوم ، صفحہ ۳۸۰ - اکبر نامہ ، جلد سوم ، صفحات ۵۸۷ تا ۵۸۷ بیورج ، صفحہ ۱۱۳۳ - مآثرالامراء ، جلد دوم ، صفحہ ۱۳۹ -

۲ - اکبر نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۶۷۰ ، ۴۰ سنہ جلوس - ان تقررات کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ، صوبائی دیوان ، والیان صوبہ کے ماتحت ہوتے تھے اور انھیں کی نگرانی میں صوبائی عہدہ داروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے - اس تبدیلی سے وہ براہ راست دیوان کل کی ماتحتی میں آگئے اور والی صوبہ کی نگرانی سے انھیں کوئی واسطہ نہ رہا - بارہ کے بارہ تقررات از سر نو کیے گئے -

۳ - اکبر نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۶۰۵ ، ۳۶ سنہ جلوس (۱) پنجاب ، ملتان ، کابل ، کشمیر ، خواجہ کے ماتحت - (۲) اجمیر ، گجرات ، مالوہ ، خواجہ نظام الدین احمد کے ماتحت - (۳) دھلی ، رائے پاتر داس کے ماتحت - (۴) آگرہ ، الہ آباد ، بنگال اور بہار ، رائے رام داس کے ماتحت -

۳۷ سنہ جلوس میں کشمیر کو بھی دیگر صوبوں کی طرح منظم کیا گیا اور ۳۹ سنہ جلوس میں اسے جاگیروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کا منصوبہ قاضی علی بغدادی نے تیار کیا اور آصف خاں نے اسے عملی جامہ پہنایا۔[1]

رائے پاتر داس کے بعد دیوانی پر آصف خاں فائز ہوا اور ۴۹ سنہ جلوس تک اسی عہدے پر رہا۔ اس کے بعد مقیم خاں، دیوان بیوتات، ترقی پا کر وزیر خاں کے خطاب کے ساتھ اس عہدے پر فائز ہوا۔ ۵۰ سنہ جلوس میں یہ محکمہ شاہزادہ سلیم کی نگرانی میں آگیا اور یہ احکام جاری کیے گئے کہ ''دیوان شہزادہ سلطان سلیم کی ہدایات کے بموجب امور سلطنت انجام دیں اور عہدہ داروں کو مناصب عطا ہونے کی سندات پر شہزادۂ مذکور کی مہر ثبت کی جائے''۔[2]

اسے اکبر کا آخری انتظام سمجھنا چاہئے۔ اس کی تکمیل نہایت مناسب صورت میں اور بہت اچھے طریقے سے کی گئی۔ اس کی وجہ سے جانشینی سے متعلق خواہ مخواہ کی نزاع ختم ہو گئی۔ جانشین کو ذہنی الجھنوں سے نجات ملی اور بادشاہ کو بھی اپنے آخری زمانۂ حیات میں، گزشتہ پانچ سال کی پریشانیوں اور فکروں کے بعد، ذہنی سکون نصیب ہوا۔

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحات ۶۱۷ - ۶۱۹، ۶۲۶ - ۶۲۷، ۶۳۸ اور ۷۲۷ -

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحات ۸۳۸ - ۸۳۹ -

اکبر کے دیوان

نام	سنہ جلوس	مدت
(۱) مظفر خاں (اول)	۹ تا ۱۷	۱۱ سال
وکیل و دیوان (دوم)	۲۲ تا ۲۴	
شہاب الدین خالصہ جاگیرات کے انتظام کا ذمہ دار	۱۳ تا ۲۱	۸ سال
(۲) خواجہ شاہ منصور شیرازی	۲۱ تا ۲۴	۳ سال
(۳) راجہ ٹوڈر مل		
(الف) مظفر کے ماتحت	۲۲ تا ۲۴	۱۰ سال
(ب) دیوان اعلیٰ	۲۷ تا ۳۰	
(ج) میر فتح اللہ کے ماتحت	۳۰ تا ۳۴	
(۴) وزیر خاں	۲۴ تا ۲۵	۱ سال
(۵) قلیج خاں	۲۵ تا ۳۹	۱۴ سال
(۶) میر فتح اللہ شیرازی	۳۰ تا ۳۴	۴ سال
(۷) خواجہ شمش الدین خوافی	۳۴ تا ۴۳	۹ سال
(۸) رائے پاتر داس	۴۳ تا ۴۴	تقریباً ۱ سال
(۹) آصف خاں قزوینی	۴۴ تا ۴۹	۵ سال
(۱۰) مقیم (وزیر خاں)	۴۹ تا ۵۰	۱ سال
(شہزادہ سلیم محکمے کا ذمہ دار بنایا گیا)	۵۰	غیر معینہ مدت

اس طرح تقریباً ۴۲ سال کے عرصے میں (یعنی ۹ سنہ جلوس سے ۵۰ سنہ جلوس تک) دس دیوان گزرے جو اس عہدے پر یکے بعد دیگرے فائز ہوتے رہے اور وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کے شریک کار بھی رہے۔ مذکورۂ بالا اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدۂ مذکور کے لیے کوئی خاص مدت معین نہ تھی۔ تبدیلیاں کسی ضرورت کی وجہ سے یا کسی دیوان کی موت واقع ہو جانے پر کی جاتی تھیں۔ مظفر اور راجہ ٹوڈر مل کا تبادلہ دو مرتبہ بہار اور بنگال کا کیا گیا، تا کہ وہ وہاں فرائض دیوان کے بجائے میدان جنگ میں فوجی خدمات انجام دیں۔

خواجہ شمس الدین، قلیج خاں، وزیر خاں، اور آصف خاں مختلف صوبوں کے صوبہ دار بنا دیے گئے۔ شاہ منصور بغاوت کے جرم میں قتل کیا گیا اور رائے پاتر داس رشوت ستانی کی بنا پر عہدے سے بر طرف کر دیا گیا۔ راجہ ٹوڈر مل اور میر فتح اللہ کا اس عہدے پر فائز ہونے کے دوران ہی میں انتقال ہو گیا۔ سب سے آخری دیوان مقیم جہانگیر کے عہد میں بھی کچھ عرصے تک دیوان رہا اور آصف خاں اس کی ماتحتی میں وکیل مقرر ہوا۔

مذکورۂ بالا دور کی تقسیم

ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تبادلوں یا بر طرفیوں کی وجہ یہ نہ تھی کہ دیوان کسی خاص مدت یا معینہ وقت کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔

اکبر کے دیوان مجموعی طور پر بیالیس سال تک عہدۂ وزارت پر فائز رہے۔ اس دور کو انتظامی نقطۂ نظر سے تین مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ ۹ سنہ جلوس سے شروع ہو کر، جب اس عہدے کی ابتدا ہوئی تھی، ۲۴ سنہ جلوس پر ختم ہوتا ہے یعنی اس وقت جب مظفر کی وزارت کا خاتمہ ہوا۔ اس اثناء میں زیادہ تر مظفر، شاہ منصور اور راجہ ٹوڈر مل دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ پندرہ سال کی مذکور مدت میں آٹھ سال تک تو مظفر ہی بلا شرکت غیرے اس عہدے پر فائز رہا۔ باقی دونوں اشخاص نے مظفر کے دور وزارت کے صرف آخری دو سال اس کے رفقائے کار کی حیثیت سے کام کیا۔ گویا اس عہد کا بڑا حصہ مظفر ہی کا عہد ہے۔ اس کے دونوں رفقائے کار نے نہایت قابلیت سے اس کی مدد کی۔ ان سے پہلے خواجہ جہاں اور شہاب الدین بھی اس سے تعاون کر چکے تھے۔

دوسرا حصہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب مظفر کا تبادلہ بنگال کا ہوا، اور راجہ ٹوڈر مل بھی اس کے بعد وہیں بھیج دیا گیا۔ ان کے بعد جو کام ہوا وہ تنہا منصور نے انجام دیا اور اس کی کامیابی کا سہرا صرف منصور کے سر ہے۔

۲۷ سنہ جلوس میں راجہ ٹوڈر مل کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت اسی نے اپنی وہ تمام اصلاحات نافذ کیں جو زیادہ تر لگان کی وصولی اور اس سے متعلقہ افسروں کے فرائض کی بابت تھیں۔ اسے یہ آزادی صرف تین سال حاصل رہی کیونکہ اس کے بعد میر فتح اللہ شیرازی کو اکبر نے خاص طور پر دکن سے بلا کر دیوان اعلیٰ بنا دیا اور راجہ ٹوڈر مل کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ مظفر، منصور اور راجہ کی طرح فتح اللہ نے بھی

محکمے کی اصلاح میں گہری دلچسپی لی اور کامیابی کے ساتھ متعدد اصلاحات نافذ کیں - دوسرا حصہ ۳۴ سنہ جلوس میں میر اور راجہ دونوں کے انتقال پر ختم ہوا - دونوں کو اپنے کام میں قلیج خاں کی مدد حاصل رہی ، جس کا تقرر اس محکمے میں ۲۵ سنہ جلوس میں ہوا تھا -

اس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے حصے میں راجہ ٹوڈر مل مظفر کے ماتحت رہا اور دوسرے میں میر فتح اللہ کی وجہ سے اس کے کارنامے ماند پڑ گئے لیکن اس کے باوجود اسے اپنی کامل جرأت اور مثالی وفاداری و دیانتداری کے طفیل امتیازی حیثیت حاصل رہی - ابوالفضل کے الفاظ میں ''وہ حق پسندی ، صاف گوئی جرأت ، اور ہندوستان کے حالات کی واقفیت ، نیز اس ملک کے نظم و نسق کے کام کی قابلیت میں یگانۂ روزگار تھا'' -[1]

تیسرا حصہ ۳۴ سنہ جلوس سے شروع ہوتا ہے جب دوسرے گروہ میں سے صرف قلیج خاں باقی رہ گیا تھا - لیکن اس امر کے باوجود کہ وہ مزید پانچ برس اسی عہدے پر مامور رہا ، اسے کوئی امتیاز حاصل نہ ہوا - اس مدت میں پانچ اشخاص دیوان ہوئے ان میں تنہا خواجہ شمس الدین ہی اپنے کارہائے نمایاں کے لیے

---

۱ - اکبر نامہ - جلد سوم - صفحہ ۵۶۹ - بیورج صفحہ ۸۶۲ - ان الفاظ کے علاوہ مولف لکھتا ہے - ''اگر اس میں تعصب ، رسوم و قواعد کی بے جا تقلید اور کینہ توزی کے عیوب نہ ہوتے اور اگر اس میں اپنی بات پر اڑے رہنے کا نقص نہ ہوتا تو اس کا شمار دنیا کی برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا (اس کی موت سے) بے لوث خدمت گزاری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور کاروبار کا بازار سرد پڑ گیا'' -

ملک کے نظم و نسق میں اس کا کیا حصہ تھا اس کے لیے مور لینڈ کی کتاب The Agrarian System کے صفحات ۸۶ اور ۲۵۵ تا ۲۵۸ دیکھیے -

مشہور ہے - اگرچہ اسے بھی وہ امتیاز حاصل نہ ہو سکا جو پہلے دو گروہوں کے مشہور وزرا کو حاصل ہو چکا تھا ، تاہم وہ اپنی راست بازی ، صاف گوئی اور کار گزاری کے لئے مشہور ہے - ماثر میں لکھا ہے : ''ان اوصاف میں وہ اپنے کسی ہم عصر سے پیچھے نہ تھا'' - [۲]

غرضکہ اکبر کو اپنی ابتدائی تدابیر میں جو کامیابی حاصل ہوئی اور جس سے اس کی سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں وہ پہلے اور دوسرے گروہوں کے انھیں قابل وزیروں یعنی مظفر ، منصور ، راجہ ٹوڈر مل اور میر فتح اللہ کی کار گزاریوں کا نتیجہ تھی -

یہ امر کہ مظفر اور منصور معمولی عہدوں سے ترقی پا کر کسی سفارش کے بغیر وزارت تک پہنچے اس بات کا ثبوت ہے کہ اکبر نے بہترین اشخاص منتخب کیے تھے - راجہ اور میر کی وہ جس طرح عزت کرتا تھا اور جن الفاظ میں ان کی تعریف کرتا تھا ، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں ان کی خدمات اور استعداد کار کی بے حد قدر تھی -

منصور کو سزائے قتل ملنے کے بعد اکبر کا یہ کہنا کہ مالی امور کا انتظام درہم برہم ہو گیا اور میر فتح اللہ کے حکم تقرر میں یہ تحریر کرنا کہ جو کام معرض التوا میں پڑا ہے اسے جلد از جلد اختتام کو پہنچایا جائے ، اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے میں محکمہ کئی خرابیوں کا شکار تھا - علاوہ بریں رائے پاتر داس کا واقعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اکبر کے دور حکومت کے تینتالیسویں سال

---

۲ - ماثرالامراء - جلد اول - صفحہ ۶۶۸ -

تک بھی رشوت ستانی ممکن تھی - حالانکہ اس وقت تک نظم و نسق کا ہر شعبہ نا پسندیدہ اشخاص سے پاک کیا جا چکا تھا - بہر حال جب عنان حکومت اکبر جیسے کسی با خبر اور بیدار مغز شخص کے ہاتھ میں ہو تو نہ فرائض کی انجام دہی میں کوئی غفلت ، اور نہ عہدہ داروں کے طرز عمل میں کسی قسم کی بے ضابطگی چھپی رہ سکتی ہے - چنانچہ یہ دونوں نقائص ظاہر ہو کر رہے اور فوراً ان کا تدارک بھی کر دیا گیا -

بحیثیت مجموعی اکبر کے دیوان اپنے کام میں ہوشیار ، وفادار ، اور محنتی تھے اور علم و فضل اور شائستگی کے ساتھ انہیں اعلیٰ سیرت کی وہ خوبیاں بھی حاصل تھیں جو ذہنی تربیت سے پیدا ہوتی ہیں - بعض اوقات اعلیٰ تر سرکاری منصب حاصل کرنے کے لیے ان میں باہمی رقابت اور ذاتی رنجش کے آثار بھی پیدا ہو جاتے تھے لیکن بادشاہ کی با خبری اور بیدار مغزی انہیں قابو میں رکھتی تھی اور ان باتوں کو نظم و نسق پر اثر انداز نہ ہونے دیتی تھی -

اکبر ان کی کار کردگی اور وفاداری کی وجہ سے ان کی عزت کرتا تھا لیکن نظم و ضبط کا اسے اتنا شدید احساس تھا کہ ضرورت کے وقت وہ مناسب کارروائی سے قطعاً گریز نہ کرتا تھا - اس نے اپنے جانشینوں کے لیے یہ روایت قائم کی کہ ہر خدمت صرف اس خدمت کے اہل شخص کے سپرد ہونی چاہیے اور ترقی و امتیاز کا واحد معیار استعداد کار اور وفاداری ہے -

باب پنجم

حصہ دوم

جہانگیر کے دیوان

خاکہ

تین دور :-

۱ - تجرباتی : مقیم (وزیر خاں) اکبر کا دیوان مستقل کیا گیا - چند روز بعد وزیرالملک اس کا شریک کار بنایا گیا - مقیم کا تبادلہ بنگال کو - غیاث بیگ کا تقرر بحیثیت دیوان - اعتمادالدولہ کا خطاب - اعتمادالدولہ کی بر طرفی اور بحالی - خواجہ ابوالحسن دربار میں آصف خاں کے نائب کی حیثیت سے - اس دور کی خصوصیات -

۲ - اعتمادالدولہ بلا شرکت غیرے وزیر و دیوان - اعتمادالدولہ کی ترقی کے اسباب : (الف) ذاتی اوصاف (ب) اس کی دختر کا اثر (ج) حریفوں کا فقدان—نظام سلطنت میں اعتمادالدولہ کا مقام - وزیر کی حیثیت کے متعلق سر طامس رو کے خیالات -

۳ - سیاسی صورت حال اور پیچیدگیاں - نظم و نسق پر ان کے اثرات - فکر و عمل کی تمام قوتیں جانشینی کا عقدہ حل کرنے کے لئے وقف - خواجہ ابوالحسن اس دور میں شروع سے آخر تک دیوان رہا - دور حکومت کے آخری سال ابوالحسن آصف خاں وکیل بنایا گیا - اس دور کے حالات سے متعلق پلسائرٹ (Palsaert

کا بیان - اس کے ہم عصر معتمد خاں اور بعد میں دور شاہ جہانی کے وقائع نگار لاہوری کی تائید -

تجرباتی دور

عہد حکومت جہانگیری میں وزارت تین ادوار سے گزری - دور اول جہانگیر کے عہد حکومت کے پہلے چھ سال پر مشتمل ہے - اسے ہم تجرباتی دور کہہ سکتے ہیں - اس دور میں بادشاہ اپنے تخت کو پوری طرح محفوظ نہیں پاتا تھا - سیاسی فضا مکدر اور غیر حوصلہ افزا تھی باپ کے وزیروں اور عہدہ داروں کی وفاداری ہنوز پوری طرح متحقق نہ ہو سکی تھی -[1] اس نے اعتدال و مصالحت کا راستہ اختیار کیا اور ان عہدہ داروں کو بھی مستقل کر دیا جنھوں نے اس کی تخت نشینی کی کھلم کھلا مخالفت کی تھی اور اگرچہ وہ کہتا ہے کہ ''میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کسی سے اس کی گزشتہ حرکات کا انتقام نہ لوں گا''[2] تاہم ابھی کچھ وقت تک ان پر نظر رکھنا اور ان کی آزمائش کرنا ضروری تھا -

اس صورت حال نے اسے قدرتی طور پر اپنے ہوا خواہوں پر اعتماد کرنا سکھایا - شریف خاں اس کے بچپن کا ساتھی تھا اور مصیبت کے وقت اس نے ہمیشہ جہانگیر کا ساتھ دیا تھا - اسی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ سب سے پہلے وہ وکیل سلطنت مقرر کیا گیا - وزارت وزیر خاں (مقیم) کے ہاتھوں میں رہی جس کا تقرر ۹م سنہ جلوس اکبر میں ہوا تھا ، لیکن جہانگیر کو اس پر اعتماد

---

۱ - خان اعظم کوکہ جیسے وزیر اور مان سنگھ جیسے جنرل اس کے مخالف تھے -

۲ - تزک - صفحہ ٦ - ترجمہ - صفحہ ١٥ -

نہ تھا - لہٰذا چند ماہ بعد خان بیگ کو جسے جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے قبل وزیر الملک کا خطاب دیا تھا، اس کا شریک کار بنایا گیا - وزیر خاں کو اس حیثیت میں بھی قابل اعتماد نہیں سمجھا گیا اس لیے آخر کار اس کا تبادلہ صوبائی دیوان کی حیثیت سے بنگال کا کر دیا گیا، لیکن اس کا منصب اور درجہ وہی رہا جو پہلے تھا - اس کی جگہ غیاث بیگ، دیوان بیوتات کو وزیرالملک کا شریک کار مقرر کیا گیا اور اسے اعتمادالدولہ کا خطاب عطا ہوا - [1]

یہ انتخاب و تقرر اس نے قطعاً اپنی صوابدید سے کیا اور یہ بالکل ویسا ھی تھا جیسا مظفر کا انتخاب اکبر نے کیا تھا - غرضکہ پہلے سال کے خاتمے کے وقت امیرالامراء شریف خاں وکیل سلطنت تھا اور امور دیوانی کی انجام دھی میں وزیرالملک اور اعتمادالدولہ دونوں شریک تھے -

سال اول خسرو کی بغاوت کی نذر ھوا - دوسرے سال کی ابتدا میں شریف کی خطرناک علالت کے باعث کسی دوسرے شخص کا تقرر ضروری ھو گیا - چنانچہ آصف خاں کا انتخاب ھوا جو اکبر کے زمانے کا آزمودہ اور قابل اعتماد شخص تھا، نیز پہلے میر بخشی اور دیوان بھی رہ چکا تھا - یہ انتخاب واقعی نہایت اچھا ھوا - آصف خاں بیش بہا خدمات انجام دے چکا تھا - صلاحیت کار اور فضیلت علمی کے باعث سب اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور وہ صاحب سیف و قلم کہلاتا تھا - آصف خاں کی درخواست پر خواجہ ابوالحسن اس کا مددگار مقرر ھوا لیکن اس کی حیثیت وزیر سے

---

۱ - تزک - صفحہ ۹ - معتمد - صفحہ ۵۵ مآثرالامراء، جلد سوم صفحہ ۹۳۳ -

زیادہ ایک نائب کی رہی کیونکہ بقول معتمد خاں ، آصف خاں نے اسے دفتر اور سرکاری کاغذات کی نگرانی کی غرض سے لیا تھا ۔[1] اسی سال وزیرالملک کو میر بخشی کا عہدہ سپرد ہوا اور اعتمادالدولہ اس عہدے سے اس لیے معزول کر دیا گیا کہ اس کے بیٹے نے خسرو کو قید سے چھڑانے کی سازش کی تھی ۔[2] اس طرح سارا کام آصف خاں اور ابوالحسن کے ھاتھوں میں آگیا ۔ یہ صورت حال ۴ سنہ جلوس تک قائم رہی ۔ ۴ سنہ جلوس میں آصف خاں دکن بھیج دیا گیا ۔ تزک میں کہیں یہ مذکور نہیں ھے کہ آصف خاں کے تبادلے کے بعد ابوالحسن کی حیثیت کیا رہی ۔ البتہ ھاکنز کے بیان سے معلوم ھوتا ھے کہ جب وہ ۱۶۰۹ء میں آگرے پہنچا تو ابوالحسن ، آصف خاں کی جگہ کام کر رھا تھا ، اور سیاہ و سفید کا مالک تھا[3] لیکن وہ اسے "چیف وزیر" کہتا ھے جو صحیح نہیں ۔ اگرچہ اعتمادالدولہ ۴ سنہ جلوس میں اپنے سابق عہدے پر بحال کر دیا گیا تھا لیکن معلوم یہ ھوتا ھے کہ ابوالحسن ھی پوری طرح محکمے پر حاوی رھا ۔ اس کی حیثیت دربار میں بھی ممتاز تھی اور

---

۱ - تزک ، صفحہ ۵۰ - معتمد ، صفحات ۲۸ و ۳۰۷ - مآثرالامراء ، جلد اول ، صفحہ ۳۷ -

۲ - اس کی برطرفی کی وجہ نہ کہیں تزک میں مذکور ھے نہ معتمد نے اس کا کوئی ذکر کیا ھے - مآثرالامراء میں ھے کہ وہ قید کر دیا گیا اور ۴ سنہ جلوس میں اس نے دو لاکھ روپے بطور جرمانہ ادا کرنے پر رھائی حاصل کی (صفحہ ۲۲۹) ۔ اس کے بیٹے شریف کو دوسروں کے ساتھ قتل کی سزا دی گئی (معتمد - صفحہ ۵۵ ۔ روجرز - صفحہ ۱۲۳)۔

۳ - ھاکنز (Hawkins) صفحہ ۹۰ ، ابوالحسن ، ھاکنز کے خلاف تھا۔

مجالس شوریٰ میں بھی۔[1] یہ صورت حال ۶ سنہ جلوس تک بر قرار رہی۔

خصوصیات۔ دور اول

اس دور کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ جہانگیر نے اپنے وزرا کے تقرر میں اکبر کی طرح اپنے اختیارات سے نہایت آزادانہ طور پر کام لیا۔ یعنی تبدیلیوں، تبادلوں اور تقررات کے مواقع پر کسی اعلیٰ ترین عہدہ دار یا امیر کبیر کا انتخاب ضروری نہیں سمجھا گیا۔ آصف خاں کا معاملہ مستثنیٰ تھا لیکن اس کا تبادلہ دکن کا کر دیا گیا اور اسے پھر کبھی دربار میں واپس آنے کا موقع نہ ملا۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ منصب وزارت پر اب کسی امیر یا سپہ سالار کا تقرر لازم نہ تھا۔ اب وزارت کی حیثیت انتظام سلطنت کے ایک اختصاصی شعبے کی ہو گئی تھی، جس کے لیے عام دفتری کام کے طریقے سے واقف ہونا، مالگزاری اور مالیات سے متعلق مخصوص فنی معلومات رکھنا اور فضیلت علمی سے بہرہ مند ہونا ضروری تھا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مشترک ذمہ داری کا طریقہ، جسے اکبر نے قائم کیا تھا اس دور میں بھی جاری رہا

---

۱ - ہاکنز (Hawkins) "جب میں نے اپنی معاش کے متعلق بادشاہ کی خدمت میں عرض کی تو بادشاہ نے مجھے ابوالحسن کے پاس بھیج دیا۔ اس نے نہ صرف میری معاش کا بندوبست نہ کیا بلکہ مجھے یہ حکم بھی دیا کہ آئندہ میں "سرخ احاطے" کے اندر داخل نہ ہوں یہ عزت کی جگہ ہے جو ہمیشہ مجھے دی جاتی تھی اور مجھے بادشاہ کا قرب حاصل رہتا تھا۔ اس جگہ مجھ سے پہلے تمام قلمرو کے صرف پانچ اشخاص کو باریابی کا موقع ملا تھا" (صفحہ ۹۱)۔

البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اکبر کام کو شرکائے کار[1] کے درمیان تقسیم کرتا تھا لیکن جہانگیر نے کام کو سلطنت کی ملکی تقسیم کے اعتبار سے تقسیم کیا۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وزرا جلد جلد تبدیل کیے گئے جس کے باعث کوئی وزیر بادشاہ پر حاوی نہ ہو سکا اور جہانگیر کو نظم و نسق کے ہر شعبے میں حسب دلخواہ کام کرنے کی آزادی حاصل رہی۔

دور دوم

وزارت کا دوسرا دور ۶ سنہ جلوس سے شروع ہو کر جبکہ اعتمادالدولہ سلطنت کا بلا شرکت غیرے وزیر مقرر ہوا ۱۶ سنہ جلوس میں اس کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔

اعتمادالدولہ

۶ سنہ جلوس میں نور جہاں جہانگیر کے عقد میں آئی۔ اس سے وزراء کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ خواجہ ابوالحسن دکن بھیج دیا گیا اور اعتمادالدولہ بلا شرکت غیرے دیوان ہو گیا۔ لیکن یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اعتمادالدولہ اپنے عروج و امتیاز اور حکومت میں اپنی طاقتور حیثیت کے لیے محض بادشاہ پر اپنی بیٹی کے اثر کا رھین منت تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذاتی صلاحیت، کار گزاری، اور فضیلت علمی،

۱۔ ممالک محروسہ کو نصف نصف تقسیم کیا گیا اور اعتمادالدولہ، وزیر خاں کی جگہ نصف ممالک محروسہ کا وزیر مقرر ہوا (تزک صفحہ ۹)۔ "میں نے دوست محمد سے کہا کہ چونکہ میں پنجاب جا رہا ہوں اور وہ صوبہ اعتمادالدولہ کی دیوانی میں ہے لہٰذا وہ اسے دربار میں بھیج دے" (صفحہ ۲۷)۔

اس کی ترقی کی وجہ (اول) اس کے ذاتی اوصاف تھے

نے بادشاہ کو بھی اسی طرح گرویدہ بنا لیا جس طرح اس کے یہ اوصاف اس کے ہر ملنے والے کو اس کا گرویدہ بنا لیتے تھے ۔ دیوان کی حیثیت سے اس کا تقرر اول سنہ جلوس میں ہوا تھا ۔ یہ تقرر اس وقت ہوا جب جہانگیر نئے آدمیوں کی آزمائش کر رہا تھا اور با اثر دیرینہ ملازمین سے احتراز کر رہا تھا ۔ اعتمادالدولہ کا تقرر کسی کی سفارش کے بغیر محض اس کی ذاتی قابلیت کی بناء پر ہوا ۔ اپنے بیٹے کے سازش میں حصہ لینے کے باعث اسے سخت دھکا لگا لیکن قید سے رہائی کے بعد وہ دو سال سے خدمات مفوضہ انجام دے رہا تھا ۔ یہ مدت بادشاہ کو اپنی وفاداری اور کار کردگی کا یقین دلانے کے لئے کافی تھی ۔ جہانگیر کہتا ہے کہ ''ہم نے اعتمادالدولہ کو ملازمت میں اس کی 'فوقیت' فراواں اخلاص اور معاملات حکومت کے وسیع تجربے کی بنا پر اپنی قلمرو میں وزارت کے عہدۂ جلیلہ سے مفتخر کیا'' ۔

(دوم) اس کی دختر کا اثر و رسوخ

بیٹی کے رشتے نے بھی اسے ایک موقع بہم پہنچایا جس سے اس نے پوری طرح فائدہ اٹھایا ۔ لیکن اس نے ہمیشہ خارجی اثر و رسوخ سے زیادہ اپنی خدمات پر بھروسا رکھا کیونکہ بیرونی اثر و رسوخ کبھی مستقل طور پر قابل اعتماد نہیں سمجھا جا سکتا ۔

(سوم) حریفوں کا فقدان

اس کی ترقی ، اور مسلسل اقتدار و افتخار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرکزی حکومت میں اس کا کوئی حریف نہ تھا ۔

امیرالامراء شریف اور آصف خاں کے بعد وزارت میں وہ سب سے پرانا تھا۔ خواجہ ابوالحسن کا تقرر دیوان کے عہدے پر نہ ہوا تھا اور وہ اپنے عہدے پر مستقل بھی نہیں کیا گیا تھا۔ دو اشخاص اور تھے جن کے متعلق یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ صف اول میں آسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو عبدالرحیم خان خاناں، بادشاہ کا سابق اتالیق تھا جو چند روز عہدۂ وکالت پر بھی مامور رہ چکا تھا اور اپنے منصب، مرتبے اور حیثیت کے لحاظ سے صف اول میں آجانے کا ہر طرح مستحق تھا اور دوسرا شخص خان جہاں تھا جس پر جہانگیر کی خاص نظر عنایت تھی اور جس نے پہلے دو تین سال کے عرصے میں کافی اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ جہانگیر اسے سرکاری خط و کتابت اور شاہی فرمانوں میں بھی فرزند کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

لیکن دکن میں دونوں اپنا اعتبار کھو بیٹھے۔ پہلے خان خاناں اعتماد سے محروم ہوا۔[1] خان جہاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اپنی خدمات پیش کیں۔ اس کی پیش کش قبول کر لی گئی اور فوج کی کمان اس کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ لیکن وہ بھی اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہا اور ذاتی نزاعات و اختلافات سے بلند نہ رہ سکا۔ غرضکہ دونوں دربار سے دور رہے اور انھیں عزت و امتیاز کے ساتھ دارالحکومت واپس آنے کا موقع نہ ملا۔ نئے دیوان کا مقابلہ

---

۱ - تزک صفحہ ۳۲ - خان خاناں کے خلاف شکایات موصول ہوئیں اوز اسے واپس بلا لیا گیا - سال پنجم - معتمد ـ صفحہ ۴۵ -

کرنے والا اب کوئی نہ تھا۔ اس کے لئے میدان بالکل خالی تھا اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔[1]

مختصر یہ ہے کہ اس کے ذاتی اوصاف نے اسے ترقی کرنے کا موقع دیا۔ بادشاہ سے اس کی بیٹی کے رشتے نے اس کام کو آسان کر دیا۔ کسی مد مقابل کے نہ ہونے سے اس کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور وہ اپنے منصب پر اپنی سلیقہ شعاری و صلح پسندی کی وجہ سے بلا خوف و خطر فائز رہا۔ ۲ سنہ جلوس کے ابتدائی حصے میں اس کا منصب صرف ۱۵۰۰ ذات تھا لیکن ایک سال کے اندر اسے دو مرتبہ ترقی دی گئی جس کے باعث وہ ۲۰۰۰ ذات اور ۵۰۰ سوار کے منصب پر فائز ہو گیا اور ۷ سنہ جلوس میں اس کا منصب ۴۰۰۰ ذات اور ۱۰۰۰ سوار کا کر دیا گیا۔ اس منصب نے اس کی ذاتی حیثیت کو اس کے عہدۂ جلیلہ کے شایاں بنا دیا۔

اعتمادالدولہ کا مقام نظام سلطنت میں اعتمادالدولہ کا حصہ کیا تھا اور اسے کتنا رسوخ حاصل تھا ان امور کی بابت اتنی تفصیلات نہیں ملتیں جتنی اکبر کے کسی دیوان کے متعلق حاصل ہو سکتی ہیں۔ جہانگیر کا وقائع نگار کوئی ابوالفضل نہ تھا۔ معتمد بہت اختصار سے کام لیتا ہے اور اپنی فضیلت علمی کے باوجود

---

۱ - تزک صفحات ۹۰ - ۹۵ - ۹۷ اور ۱۰۶ -

معتمد - صفحات ۵۴ تا ۵۶ - اس کا بیان بہت نا مکمل ہے۔ عہدۂ وزارت پر اعتمادالدولہ کے تقرر کے وقت ہاکنز دربار میں موجود تھا۔ وہ لکھتا ہے "اب ایک شخص گیہ بیوگ (غیاث بیگ) جو بادشاہ کا خزانچی تھا بڑا وزیر بنا دیا گیا (یہ ایسا شخص تھا جو بظاہر مجھے بہت کچھ سمجھتا تھا اور جب کبھی مجھے اس سے کام لینے کا موقع ملا میں نے یہ دیکھا کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہے" (صفحہ ۹۴) -

ابوالفضل کی طرح نہ خشک واقعات کو پسند کرتا ہے نہ اس کی طرح کسی واقعے کی جزئیات بیان کرنے پر حاوی ہے - علاوہ بریں محکمہ تکمیل پا چکا تھا اور اب اس کا تعمیری کام باقی نہ تھا - بادشاہ اور دیوان کی کامیابی کا انحصار اب اس بات پر تھا - کہ وہ اکبر کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط پر سختی سے کار بند رہیں اور ان اصول و قواعد کو مستقل قانونی حیثیت دیں -

اعتمادالدولہ کے دور وزارت کے بیشتر حصے میں جہانگیر اجمیر ، مالوہ ، اور گجرات کے دورے میں مصروف رہا - پوری مدت جو پانچ سال چار ماہ ہوتی ہے (۸ سنہ جلوس سے ۱۳ سنہ جلوس تک) وزیر مذکور بھی بادشاہ کے ساتھ ساتھ دورے پر رہا - اس زمانے کے واقعات کے غائر مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جہانگیر امور سلطنت کا انتظام بذات خود کرتا تھا - نظم و نسق کے ہر شعبے میں - یعنی خواہ وہ جنگ کے انتظامات ہوں یا سپہ سالاروں کے تقررات ، فوجوں کے ساز و سامان سے متعلق کوئی بات ہو یا صوبوں کے حاکموں اور دوسرے عہدہ داروں کے تبادلوں اور تقررات کا معاملہ ہو ، ہر جگہ اس کا ہاتھ کار فرما نظر آتا ہے - اس کے برعکس اس واحد وزیر کا اثر کہیں نظر نہیں آتا جو بادشاہ کا ہمرکاب تھا اور جس کی بادشاہ بے انتہا قدر کرتا تھا - صرف چند مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں اس کا اثر اس کے محکمے کے حدود کے باہر نظر آتا ہے - مثال کے طور پر :—

(الف) ۱۰ سنہ جلوس - حسب التماس اعتمادالدولہ دیانت خاں

قلعۂ گوالیار سے رہا کیا گیا اور اس کی ضبط شدہ جائداد اسے واپس دی گئی۔[1]

(ب) حسب التماس اعتمادالدولہ راجہ مان سنگھ اس فوج کا سردار مقرر کیا گیا جو قلعۂ کانگڑہ (پنجاب) فتح کرنے پر مامور تھی۔[2]

(ج) ۱۲ سنہ جلوس۔ حسب التماس اعتمادالدولہ، اعتقاد خاں کو اجازت کورنش عطا ہوئی۔[3]

(د) حسب التماس اعتمادالدولہ، الہ داد خاں کو، جو فوج سے بلا اجازت فرار ہو گیا تھا، حاضر بارگاہ ہونے کی اجازت دی گئی۔[4]

ان مثالوں میں ایسے مواقع پر اس کا نام آیا ہے جہاں وہ ایک وزیر کی حیثیت سے بادشاہ کے حضور میں بعض اشخاص کی سفارش کرتا ہے۔ لیکن، دوسری جانب، اسے اپنے محکمے میں بادشاہ کا پورا اعتماد اور کامل اختیارات حاصل تھے۔ چنانچہ اس بات کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ اس کے محکمے سے متعلق امور بادشاہ کے حضور میں پیش ہوتے تھے۔ اس سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:—

۱ - تزک - صفحہ ۱۴۹ - چند روز بعد اس کی بقایا تنخواہ بھی اسے دے دی گئی - (صفحہ ۱۶۳) -

۲ - تزک - صفحہ ۱۶۳ - مرتضیٰ خاں جس کے ہاتھ میں فوج کی قیادت تھی مر چکا تھا -

۳ - تزک - صفحہ ۱۸۵ -

۴ - تزک - وہ ۱۵ سنہ جلوس میں بمقام کشمیر حاضر دربار ہوا، اس کا قصور معاف کیا گیا اور وہ دوبارہ اپنے منصب ۲۵۰۰ ذات و ۱۲۰۰ سوار پر فائز ہوا -

(۱) روزمرہ کے کام کا طریقہ پوری طرح طے ہو چکا تھا ، اس لئے ہر معاملے کی جانب بادشاہ کی توجہ مبذول کرنا ضروری نہ تھا ۔

(۲) دیوان کو بادشاہ کا کامل اعتماد حاصل تھا اور وہ اپنے اختیارات کو پوری طرح استعمال کر تا تھا ۔ اس لئے کسی شخص کو ایسا کوئی موقع ہی نہ مل سکتا تھا کہ وہ وزیر کو نظر انداز کر کے براہ راست بادشاہ تک جا پہنچے ۔

(۳) دیوان اپنے اختیارات ، نہایت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتا تھا ۔ دیگر حکام اعلیٰ اور امراء سے ایسا کوئی تصادم ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کی جانب بادشاہ کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا ضروری ہوتا جیسا کہ ہم اکبر کے عہد حکومت میں مظفر اور راجہ ٹوڈر مل کے بارے میں دیکھ چکے ہیں ۔[1]

یہ بات جہانگیر کے ان تاثرات سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے جن کا اظہار اس نے اپنے اس وزیر کے انتقال پر کیا ۔ اس کا اختیار جس کی طرف ذیل کے اقتباس میں اشارہ ہے یقیناً صرف وہ اختیار تھا جو اسے اپنے ہی محکمے میں حاصل تھا :-

---

۱ - تزک میں ایسی باتوں کا ذکر نہ ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ محکمے میں رکاوٹ یا مزاحمت کے بغیر کام ہوتا تھا ۔ ہر وہ شخص جو تزک جہانگیری کا مطالعہ غور کے ساتھ کرے اور اس بات پر نگاہ رکھے کہ جہانگیر کی طبیعت کتنی تجسس پسند واقع ہوئی تھی اور تفصیلات نگاری میں اسے کتنا کمال حاصل تھا ، ہرگز یہ خیال نہیں کر سکتا کہ اہم امور انتظامی کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی گئی ہو اور اس کا ذکر اس کے قلم سے بچ گیا ہو یا اس وقت کے روزنامچوں میں درج ہونے سے رہ گیا ہو ۔

''میں کیا بتاؤں کہ مجھ پر اس واقعۂ وحشت اثر سے کیا گزری ۔ وہ ایک عاقل و کامل وزیر بھی تھا اور ایک دانا اور شفیق مصاحب بھی ۔ حالانکہ اس کے کاندھوں پر اتنی بڑی سلطنت کا بار تھا اور کسی آدمی کے لئے نہ یہ ممکن ہے نہ کسی کے اختیار ہی میں ہے کہ وہ ہر شخص کو راضی رکھ سکے ، تاہم جو شخص بھی عرض مطلب یا کار برآری کے لئے اعتمادالدولہ کے پاس گیا وہ اس کے پاس سے کبھی آزردہ واپس نہ آیا ۔ وہ اپنے بادشاہ کا وفادار بھی رہا اور اس کے ساتھ اس نے اہل حاجت کو خوش اور پر امید بھی رکھا'' ۔[1] معتمد خاں نے بھی اس کے کردار کے اس پہلو کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے ۔

غرضکہ بادشاہ اعتمادالدولہ کی بے حد عزت کرتا تھا اور اسے ہر قسم کے اعزاز و اکرام سے نوازتا رہتا تھا ۔ لیکن اس کا اختیار صرف اپنے محکمے تک محدود تھا ، جہانگیر اس زمانے میں ، جملہ امور سلطنت برابر اپنی مرضی کے مطابق ، کسی وزیر یا امیر کا اثر قبول کئے بغیر ، انجام دیتا رہا ۔

رائے جو سر طامس رو کے بیان سے قائم ہوتی ہے

اعتمادالدولہ کے زمانۂ عروج میں سر طامس رو دربار میں موجود تھا ۔ اس کے بیان سے بھی اعتمادالدولہ کے متعلق یہی رائے قائم ہوتی ہے ۔ وہ دس مختلف مواقع پر اس کا ذکر کرتا ہے ۔ لیکن کسی موقع پر اس بات کا ذرہ برابر بھی گمان نہیں ہوتا کہ وہ بادشاہ کے کاموں میں دخیل تھا ۔

---

۱ - تزک ۔ ۱۶ سنہ جلوس ، صفحہ ۳۳۹ ترجمہ ، صفحہ ۲۲۲ ۔

سر طامس رو کے بیان کے مطابق شاہزادہ خرم سب سے زیادہ ذی اثر تھا۔ سرکاری کام میں اس کی مدد کے لئے آصف خاں مقرر تھا۔ رو کو قلعۂ سورت کے متعلق اپنے کام میں ان دونوں سے سابقہ پڑا۔ سورت اس زمانے میں شہزادۂ مذکور کے ماتحت تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ دونوں میں سے کسی کے بھی زیر اثر نہ تھا۔ رو (Roe) کی شکایت پر، جو اس نے اپنے ذاتی معاملے کے متعلق ان کے خلاف کی تھی، دونوں کو بھرے دربار میں ملامت کی گئی۔[۱]

وہ بادشاہ سے اپنی ایک ملاقات اور اپنے معاملے کے متعلق اس کی بحث کا جو ذکر کرتا ہے، اس سے دربار شاہی میں ان سب لوگوں کی صحیح حیثیت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سر طامس رو نے اپنا معاملہ پیش کیا۔ آصف خاں نے اس کی تائید کی۔ شہزادۂ خرم نے اس کی مخالفت کی۔ 'آصف خاں نے باپ کے کان میں کہا کہ وہ خط کا مطالعہ کر کے ہماری مدد کرے ---------' اس کے بعد بحث شروع ہوئی۔ بادشاہ نے سب سے سوالات شروع کیے اور فیصلہ رو کے حق میں ہوا۔[۲]

جب شہزادے کے گول مول جوابات پر رو کو پریشانی ہوتی یا جب وہ آصف خاں کی مدد سے مایوس ہو جاتا تو ہمیشہ یہی کہتا

---

۱ - رو (Roe)، صفحات ۱۱۹، ۱۲۱ - ۱۲۴ رو کی شکایت، صفحہ ۱۳۰، اور بحث، صفحہ ۱۳۱، رو اور آصف خاں صفحات ۱۳۳، ۱۸۸ - بادشاہ نے آصف کو تنبیہ کی، صفحات ۲۲۲، ۲۳۵ -

۲ - رو (Roe) ۴۲۰ -

مجھے ان پر نہیں بادشاہ پر بھروسا ہے اور میں دوبارہ بادشاہ سے بات کروں گا۔

دو مواقع پر سر طامس رو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادہ خرم ، آصف خاں اور نور جہاں تینوں کے درمیان ایک سمجھوتا تھا اور اس وقت ان سب کے مساعی شہزادہ خسرو کے خلاف تھے تاکہ جہانگیر کے بعد خرم کی تخت نشینی کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔ لیکن اس سازش کا تعلق صرف اسی ایک معاملے سے تھا انتظامی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔[1]

جہانگیر خود کہتا ہے کہ "امور سلطنت و ملک داری کے متعلق اکثر میں اپنی ہی رائے کے مطابق عمل کرتا ہوں اور دوسروں کی رائے پر اپنی رائے کو ترجیح دیتا ہوں"۔[2]

۳ سنہ جلوس میں اس نے ایک نوجوان شخص جہانگیر قلی خاں (اسلام خاں) کو صوبۂ بہار کا اور پھر جلد ہی صوبۂ بنگال کا حاکم مقرر کیا۔ اس نوجوان نے عثمان افغان کی باغیانہ سرگرمیوں کے خلاف قابل قدر خدمات انجام دیں اور بادشاہ کا قول ہے کہ اس کے تقرر پر متعدد اعلیٰ ملازمین نے اس کی نو عمری و ناتجربہ کاری کے باعث اس کے خلاف رائے زنی کی "لیکن میں نے اس کے ان ذاتی اوصاف اور استعداد کی بناء پر اس کا تقرر کر دیا جن کی وجہ سے وہ مجھے پسند تھا اور اس نے بھی اس خوبی سے یہ خدمت انجام دی کہ اب تک کوئی دوسرا شخص انجام نہ دے سکا تھا"۔[3]

---

۱ - رو (Roe) صفحات ۲۴۵ - ۳۴۰ ، ۳۶۹ -

۲ - تزک ، صفحہ ۳۲ - ترجمہ ، صفحہ ۶۸ -

۳ - تزک ، صفحہ ۱۰۲ -

اسی طرح ۵ سنہ جلوس میں دکن سے خان خاناں کی طلبی اور اس کے حاضر بارگاہ ہونے پر اس سے اہانت کا برتاؤ،[1] خان اعظم سے عنایت و مرحمت کے سلوک کی موقوفی اور ۸ سنہ جلوس میں اسے قید کی سزا دینے کے بعد ۹ سنہ جلوس میں اس بناء پر اس کا رہا کر دیا جانا کہ جہانگیر نے خواب میں دیکھا کہ اکبر اس کی سزا معاف کر دینے کی سفارش کر رہا ہے،[2] ۱۲ سنہ جلوس میں تین والیان صوبہ کا تقرر اور ۱۳ سنہ جلوس میں مقرب خاں کو صوبۂ گجرات کا حاکم مقرر کرنا، یہ تمام امور اس کے اپنی رائے پر عمل کرنے کی مثالیں ہیں۔

ان اشخاص کا شمار سلطنت کے اعلیٰ ترین اور معتمد ترین عہدہ داروں میں تھا۔ ان کے متعلق بادشاہ نے جو کارروائی کی وہ صورت حال کے اقتضا سے کی۔ وزیر وقت نہ غیر محدود اختیارات رکھتا تھا، نہ اسے بات کی پچ کرنے کی عادت تھی، نہ اس کی طبیعت سازش ہی کی طرف مائل تھی۔

دور سوم

وزارت کا تیسرا دور اعتمادالدولہ کے انتقال اور ۱۶ سنہ جلوس میں دیوان کے عہدے پر خواجہ ابوالحسن کے تقرر سے شروع ہوتا ہے۔

سیاسی حالات اور ان کے اثرات

جہانگیر کی حکومت کے باقی ماندہ چھ سال مسلسل علالت اور پریشانیوں میں گزرے۔ ۱۷ سنہ جلوس کے ابتدائی حصے میں قندھار کے نازک حالات اور زیادہ خراب ہو گئے

۱ - تزک، صفحات ۸۶ و ۸۸۔
۲ - تزک، صفحات ۱۲۶ و ۱۳۲۔

اور وھاں ایک لشکر جرار بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ اسے دوبارہ فتح کرکے ایرانیوں کے قبضے سے نکالا جائے۔ عام انتظامات اور جنگی تیاریوں کی نگرانی کے لئے بادشاہ کشمیر سے لاھور واپس آ گیا۔ دیوان کو حکم دیا گیا کہ جتنے فوجی دستے موجود ھیں سب خان جہاں کے پاس ملتان بھیج دیے جائیں جسے وھاں سے قندھار کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم تھا۔ لیکن ابھی تیاریاں ھو ھی رھی تھیں کہ بادشاہ کو خبر ملی کہ شاہ جہاں نے بغاوت کر دی ھے اور اس کی فوجیں یلغار کرتی ھوئی آگرے کی طرف جا رھی ھیں۔ اس کی وجہ سے صورت حال یکسر بدل گئی اور ایسی پیچیدگیاں پیدا ھو گئیں جنھیں آخر دم تک جہانگیر دور نہ کر سکا۔ انتظامی نقطۂ نظر سے اسے جہانگیر کی شخصی حکومت کا خاتمہ سمجھنا چاھیے۔ اب نہ اس کی صحت اچھی رھی تھی نہ اسے سکون قلب ھی نصیب تھا۔

اس زمانے میں صحت جسمانی کے لحاظ سے اس کی حالت روز بروز خستہ ھوتی جا رھی تھی۔ ان دنوں اس کے بار بار کشمیر جانے کی بابت پلسائرٹ (Palsaert) کہتا ھے: ''بادشاہ اس ملک کو خاص طور پر ترجیح دیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ھندوستان میں زیادہ گرمی پڑنے پر اس کا جسم بھٹی کی طرح تپنے لگتا تھا۔''[1] جہانگیر خود کہتا ھے ''اس نقاھت کی وجہ سے جو دو سال پہلے شروع ھوئی اور جس کا میں ابھی تک شکار ھوں، دل و دماغ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیتے۔'' اس کی حالت کا مزید اندازہ اس کی

۱۔ پلسائرٹ۔ صفحہ ۳۵۔

ایک اور عبارت سے بھی ہوتا ہے جو اس نے ۱۷ سنہ جلوس میں یہ خبر سن کر لکھی تھی کہ شاہ جہاں آگرے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے "جس قدر عنایت و مرحمت میں نے اس پر کی ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی بادشاہ نے آج تک اپنے کسی فرزند پر نہ کی ہوگی - میرے پدر بزرگوار نے جو مہربانیاں میرے بھائیوں پر کی تھیں وہ میں نے اس کے خدام پر کی ہیں ----- خوش بختی کی اس یادداشت کا مطالعہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہ ہوگا کہ میں نے جتنی توجہ اس پر کی ہے میرا قلم اس کی شرح سے عاجز ہے - میں اپنی تکالیف کیا بیان کروں - کوفت اور ضعف کے باوجود، اس گرم آب و ہوا میں جو میرے مزاج کے لئے قطعی ناسازگار ہے، مجھے گھوڑے کی سواری کرنی پڑتی ہے اور ایسے ناخلف فرزند کے خلاف پیش قدمی میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے ------ لیکن میرے دل پر جو بات بہت ہی گراں گزر رہی ہے اور میری غیرت مند طبیعت جس کی وجہ سے رنجیدہ ہے، وہ یہ ہے کہ ایسے وقت جب میرے اقبال مند فرزندوں اور وفا شعار سرداروں کو قندھار و خراسان پر فوج کشی کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی ----- اس نا مبارک فرزند نے اپنی ہی مملکت کے پاؤں پر کلھاڑا مارا ہے اور اس مہم کے حق میں خود سنگ راہ بن گیا ہے ---- لیکن مجھے یقین ہے کہ قادر مطلق میرے دل سے یہ رنج دور کر دے گا" - [۱]

---

۱ - تزک - صفحہ ۳۵۳ - ترجمہ بیورج (Beveridge) جلد دوم، ۱۷ سنہ جلوس -

شاہ جہاں کی باغیانہ سرگرمیوں کے انسداد کے لئے شاہی افواج اس کے خلاف مجتمع ہو گئیں۔ اس مہم کی سر براہی مہابت خاں کو تفویض کی گئی۔ بادشاہ خود فوج کے ساتھ روانہ ہوا اور اس جنگ میں جو دھلی کے قریب ہوئی شاہی فوجیں ظفریاب ہوئیں۔ لیکن شاہ جہاں کی فوجوں کی شکست سے فتنہ پوری طرح فرو نہ ہو سکا۔ شاہ جہاں کی سرگرمیاں تقریباً تین سال تک جاری رہیں یہاں تک کہ ۲۰ سنہ جلوس میں وہ سر اطاعت خم کر دینے پر مجبور ہو گیا۔[۱]

ان واقعات کا برا اثر نہ صرف مرکزی حکومت کے نظم و نسق پر پڑا بلکہ دکن، گجرات، مالوہ، بنگال، اور الہ آباد کے انتظام پر بھی پڑا۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں مذکورۂ بالا مدت کے دوران میں فوجی معرکے ہوئے تھے۔

ابھی اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بادشاہ کی روز افزوں خرابئی صحت کے باعث طاقتور امراء و مصاحبین کی توجہ بادشاہ کی جانشینی کے مسئلے کی جانب منعطف ہو گئی۔ اس معاملے میں نور جہاں اور آصف خاں پیش پیش تھے۔ شروع میں یہ دونوں مہابت خاں کے خلاف متحد رہے جس نے گزشتہ مہم میں بہت قوت اور فوج پر بہت اثر حاصل کر لیا تھا اور جسے شہزادۂ پرویز سے بہت محبت تھی لیکن ملکہ اور اس کا بھائی دونوں پرویز کے خلاف تھے۔ ان کی شدید عملی مخالفت نے بالآخر مہابت خاں کو بہت بد دل کر دیا اور جب بادشاہ کے نام سے اسے حاضر دربار ہونے کا

۱۔ تزک۔ صفحات ۳۹۷ - ۳۹۸ اور ۴۰۰۔

حکم ملا تو وہ خطرے کو بھانپ گیا - اس نے حکم کی تعمیل تو کی لیکن پوری پیش بندی کے ساتھ یعنی چار پانچ ہزار راجپوت سپاہیوں کو لے کر آیا - وہاں پہنچنے پر جب اسے باریابی کی اجازت نہ دی گئی تو اس نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مخالفین پر ایک غیر متوقع ضرب لگائی - جب بادشاہ کشمیر سے کابل کی طرف کوچ کر رہا تھا تو اس نے ناگہانی حملے کی پوری تیاری کر لی اور جب شاہی فوج ذرا آگے بڑھ گئی تو اس نے خیمۂ شاہی کا محاصرہ کرکے بادشاہ کو اپنی حراست میں لے لیا - جہانگیر اس طرح بحالت محاصرہ مہابت کی حفاظت و نگرانی میں سفر کرتا رہا -

اس قضیے میں ایک سال گزر گیا حتیٰ کہ ۲۱ سنہ جلوس میں بالآخر جہانگیر کو آزادی ملی اور مہابت خاں دوبارہ شاہ جہاں کے خلاف مامور ہوا -

دوسرا سال ایسی سرگرمیوں میں گزرا جن کی وجہ سے نور جہاں اور آصف خاں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا - شہزادۂ پرویز کے انتقال سے دونوں کا مشترک حریف ختم ہو چکا تھا اور اب جانشینی کی کشمکش شاہ جہاں (داماد آصف خاں) اور شہر یار (داماد نور جہاں) کے درمیان رہ گئی تھی - اس مہم میں بالآخر آصف خاں اپنی معتدل مزاجی، ہمت اور تدبر کی بدولت کامیاب ہوا -

عہد حکومت جہانگیر کے آخری سال میں جب آصف خاں کابل سے لاہور واپس آیا تو وہ وکیل سلطنت اور حاکم پنجاب مقرر کر دیا گیا - اب وہ حکومت کا سر براہ اعلیٰ تھا اور اسے

اثر و اقتدار حاصل تھا ۔ اس کے علاوہ نور جہاں ایک کمزور معاملے کی حمایت کر رہی تھی ۔ شاہ جہاں کے مقابلے میں شہر یار کی کوئی حقیقت نہ تھی ۔

آصف خاں کو تمام امرائے سلطنت اور اعلیٰ عہدہ داروں کی تائید حاصل تھی ۔ اس لئے وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس مخالفت پر فتح پانے میں کامیاب ہو گیا جو بمقام لاهور اس کے امیدوار کی جانشینی کے سلسلے میں کی گئی اور شاہ جہاں تمام وزرائے سلطنت کی تائید کے ساتھ جہانگیر کی جگہ وارث تخت ہوا ۔[1]

---

۱ ۔ اس زمانے کے حالات و واقعات کا مطالعہ مفصل طور پر اقبال نامۂ معتمد خاں میں کیا جا سکتا ھے ۔ معتمد خاں بخشی دوم اور میر تزک تھا ۔ اس حیثیت سے اس کا تعلق جہانگیر کے ذاتی عملے سے تھا اور تمام واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے تھے ۔ مہابت خاں کے خلاف کارروائیاں کرنے پر وہ آصف خاں کے خلاف ملامت آمیز الفاظ لکھتا ھے (صفحہ ۲۵۳) اور اس پر یہ الزام عائد کرتا ھے کہ اس نے بادشاہ کی مناسب حفاظت میں غفلت سے کام لیا (صفحہ ۲۵۴) ۔ مہابت خاں کی اچانک آمد اور اس سے اپنی ملاقات کے وجوہ بیان کرتا ھے (صفحات ۲۵۴۔ ۲۵۵ ، حاشیہ) ۔ بادشاہ کو مہابت خاں کی قید سے چھڑانے کے لئے امراء نے جو کوششیں کیں اور جس طرح ھاتھی پر سوار ہو کر نور جہاں نے خود اس معرکے کی قیادت کی اور ناکام ہوئی وہ ان تمام باتوں کو بیان کرتا ھے (صفحات ۲۵۹ - ۲٦۵) ۔ آصف خاں کا پسپا ہو کر ملتان جانا اور مہابت خاں کے سپاھیوں کے ھاتھوں گرفتار ہو جانا (صفحہ ۲۷٦) ، کابل میں جہاں نور جہاں جہانگیر کے پاس پہنچ گئی تھی ، مہابت خاں کے خلاف اس کی کارروائیاں (صفحات ۲۷۰ تا ۲۷۵) ، مہابت اس کی شرطیں منظور کر لیتا ھے اور لشکر گاہ سے چلا جاتا ھے ، آصف خاں کو قید سے رہا کر دیتا ھے (صفحات ۲۷٦ - ۲۷۸) ، یہ ساری گفت و شنید نور جہاں کے نام پر افضل خاں کے توسط سے ہوئی ۔ آصف خاں کی رہائی اور واپسی سے متعلق مہابت کے پس و پیش پر نور جہاں کے الفاظ ، اس کا لب و لہجہ اور اس کا غصہ قابل توجہ ھے (صفحہ ۲۷۷) ۔

غرضکہ سب وزرائے سلطنت کی قوت فکر و عمل سیاسی مشکلات اور آئندہ کی الجھنیں دور کرنے میں بھی صرف ہوتی رہی اور گمان غالب ہے کہ نظم و نسق پر اس کا خاصا برا اثر پڑا ہوگا۔

تیسرے دور میں جو جہانگیر کے عہد حکومت کا آخری حصہ تھا تمام اہم امور سلطنت میں نور جہاں کا ہاتھ کار فرما نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف بادشاہ پر حاوی تھی بلکہ سیاسی امور خود انجام دیتی تھی اور صوبوں کے حاکموں کے تقرر اور تبادلے بھی خود کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی سرگرمیاں مفاد سلطنت کے لیے اچھی نہ تھیں۔ وہ بے انتہا شائستہ عورت تھی اور اپنی فراست و ذہانت، انتظامی صلاحیت اور غریبوں کی محبت کے لیے مشہور تھی لیکن جب اس کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ڈور آئی تو اکثر دوسری ذی اقتدار عورتوں کی طرح وہ بھی بری طرح ناکام ثابت ہوئی۔

پلسائرٹ کا بیان

پلسائرٹ جو اس زمانے میں آگرے میں موجود تھا، اسی دور کے حالات کی طرف وقتاً فوقتاً اشارے کرتا ہے: ''اس کے (ملکہ کے) سابق اور موجودہ حامیوں کو معقول صلہ ملا ہے، اور جو لوگ بادشاہ کے مقربین خاص میں ہیں، ان میں سے اکثر محض نور جہاں کی بدولت بام رفعت پر پہنچے ہیں۔[1] نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اس کے اس قدر احسان مند ہیں کہ جہانگیر محض برائے نام بادشاہ ہے۔ حکومت پر نور جہاں کا

---

۱ - پلسائرٹ، صفحہ (۵۰) لیکن یہ رائے وزراء کے بارے میں درست نہیں ہو سکتی۔ نظام وزارت اتنا معقول تھا کہ وزراء میں کوئی تبدیلی نہ کی جا سکی حالانکہ وہ سب ملکہ کے خلاف تھے اور ملکہ کو اپنے اقتدار و اثر کے باوجود، انہیں تبدیل کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اور اس کے بھائی آصف خاں کا کامل قبضہ ہے۔۔۔۔ بادشاہ امور سلطنت کی انجام دہی میں مطلق دلچسپی نہیں لیتا بلکہ اس کے روپے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے امور سلطنت کی انجام دہی سے مطلق سروکار نہیں۔ اگر کوئی شخص دربار میں کوئی عرضداشت پیش کرنے کے لئے باریابی کی اجازت حاصل کر لیتا ہے، یا اگر اسے بالمشافہ عرض حال کرنے کی اجازت مل جاتی ہے تو بادشاہ اس کی عرض سن تو ضرور لیتا ہے مگر ہاں یا نہیں کچھ نہیں کہتا بلکہ اس کے معاملے کو فوراً آصف خاں کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح اپنی بہن ملکۂ نور جہاں کے مشورے کے بغیر کسی اہم معاملے کا فیصلہ نہیں کرتا بلکہ اس کے ایما پر اس کام کو اس طرح انجام دیتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کے اقتدار پر بھی حرف نہیں آنے پاتا''۔[1]

معتمد خاں کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ''جہانگیر کی بادشاہی برائے نام رہ گئی تھی''۔[2] مزید براں لاہوری جس نے عہد حکومت شاہ جہانی میں اپنی تالیف مرتب کی ہے، لکھتا ہے کہ عہد حکومت جہانگیری کے آخری حصے میں جو گڑ بڑ ہوئی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ

---

١ - پلسائرٹ، (صفحہ ٥١)- ١٦٢١ء سے ١٦٢٧ء تک اس کا قیام آگرے میں رہا۔ اس لحاظ سے اس کے قیام کا یہ زمانہ بالکل وہی ہے جو مذکورۂ بالا دور سوم کا ہے۔

٢ - معتمد۔ صفحہ ٧٠۔ لیکن اس کا بیان شروع سے آخر تک پڑھنا چاہیے۔ وہ ملکہ کے ذاتی اوصاف کی اور یتیموں اور مسکینوں کی امداد سے متعلق اس کے جذبے کی بے انتہا تعریف کرتا ہے۔

نور جہاں اپنے داماد شہر یار کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھی تاکہ اس کا اپنا عمل دخل پوری طرح بحال رہے۔ اس کے انتقال کے متعلق کہتا ہے:- ''جملہ امور سلطنت میں وہ اس قدر دخیل تھی کہ اس کی تفصیلات یہاں بیان کرنا ایک وقائع نگار کے لئے مناسب نہیں''۔[۱]

---

۱ - لاہوری ۔ جلد اول ، صفحہ ۱۶۹ - جلد دوم ، صفحہ ۴۷۵ -

باب پنجم

حصہ سوم

شاہ جہاں کے دیوان

خاکہ

شاہ جہاں کا کام نسبتاً بہت آسان رہا۔ تمام وزراء مستقل کر دیے گئے۔

۱ سنہ جلوس :۔گزشتہ دور حکومت کے میر بخشی ارادت خاں کا تقرر۔

۲ سنہ جلوس تا ۱۲ سنہ جلوس :۔ارادت خاں کا تبادلہ دکن کو۔ علامی افضل خاں۔ بادشاہ کا معتمد خاص اور زمانۂ شہزادگی کا فاضل دیوان۔

۱۳ تا ۱۹ سنہ جلوس :۔اسلام خاں۔ حاکم بنگالہ اور زمانۂ شہزادگی میں بادشاہ کا مصاحب۔ دیوان کے دفتر کا داخلی انتظام۔

۱۹ تا ۳۰ سنہ جلوس :۔دیوان کا تبادلہ دکن کو۔ سعداللہ خاں، منظور نظر اور فاضل نوجوان دیوان مقرر ہوا۔ ادنیٰ درجے سے ترقی کر کے اعلیٰ

درجے پر پہنچا - اس کی علمی فضیلت اور انتظامی صلاحیت - سرکاری امور میں اس کی صاف گوئی - شہزادۂ دارا شکوہ کے خلاف فیصلہ اور اس کا نتیجہ - اس کی فوجی خدمات - بلخ کا بندوبست اور دیوانی کے اختیارات - دیگر فوجی مہمات - دیگر وزراء کے مقابلے میں اس کی حیثیت - اس کا انتقال اور باشاہ پر اس کا اثر - دیوان کے انتقال پر شاہ جہاں کا خط میر جملہ کے نام -

۳۰ سنہ جلوس : عہدۂ دیوان کا عارضی انتظام - میر جملہ کا تقرر - اس کا تبادلہ دکن کو - لیکن عہدہ اسی کے لیے محفوظ رہا - اس کے بیٹے کو رائے رایاں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اجازت - عہدۂ مذکور سے متعلق مزید داخلی انتظامات -

۳۱ سنہ جلوس : رائے رایاں اور جعفر خاں دونوں شریک دیوان کی حیثیت سے - مالوے کو جعفر خاں کا تبادلہ - رائے رایاں بلا شرکت غیرے دیوان -
اورنگ زیب کے عہد میں بھی وہی دیوان رہا -
وزرائے شاہ جہاں کی خصوصیات -

شاہ جہاں کے وزراء اور نائب وزراء کی فہرست -
دیوان کا محکمہ اور اس کے دفتر کا کام -

پرانے وزراء مستقل کر دیے گئے

شاہ جہاں کو تخت نشینی کے بعد اپنے وزراء کے انتخاب میں ایسی کوئی مشکل پیش نہ آئی، جیسی اکبر اور جہانگیر کو پیش آئی تھی۔ اکبر کے عہد میں منعم خاں، اتکہ خاں اور ادھم خاں کے مقاصد باہم متصادم رہے اور ان میں باہم رنجشیں رہیں۔ جہانگیر کے عہد میں یہ حال رہا کہ وہ وزیر خاں کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا رہا اور وکیل آصف خاں قزوینی پر اس نے کبھی اعتماد نہ کیا۔ ان کے مقابلے میں شاہ جہاں کو آصف خاں جیسا وکیل مل گیا جو اس کا خسر بھی تھا اور پہلے سے سلطنت کا اعلیٰ ترین عہدہ دار بھی تھا۔ نیز اسی کے اثر و رسوخ اور اسی کی موقع شناسی، سنجیدگی اور عالی ہمتی کی بدولت شاہ جہاں تاج و تخت کا مالک بنا تھا۔ دیوان (ابوالحسن)، میر بخشی (ارادت خاں) دوسرا بخشی (معتمد خاں) جو دیگر وزراء سے کم با اثر نہ تھا اور میر ساماں (میر جملہ) سب کے سب وکیل کے با وفا مددگاروں میں تھے اور ان سب نے اس کے داماد کو صاحب تاج و تخت بنانے میں اس کی مدد کی تھی۔

ارادت خاں

ابوالحسن نے جو خدمات انجام دی تھیں اور آصف خاں کی جس طرح اس نے مدد کی تھی اس کے پیش نظر ہر شخص اسی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا کہ دیوان کے عہدے پر وہی بر قرار رہے گا لیکن آصف خاں نے ارادت خاں کی سفارش کی اور ابوالحسن کی جگہ اس کا تقرر ہوا۔ یہ واحد مثال ہے جبکہ، وکیل کا نامزد کیا ہوا شخص دیوان یا وزیر

بنایا گیا ہو۔ خود ابوالحسن کو اس کے مربی و سرپرست آصف خاں قزوینی نے جہانگیر کے زمانۂ حکومت میں نامزد کیا تھا لیکن اسے دیوان کا منصب نہیں دیا گیا۔[۱]

چہار چمن میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ آصف خاں کے لیے ابوالحسن بحیثیت مجموعی شریک کار تھا[۲] لیکن اس کی سفارش پر مقرر کیا ہوا شخص زیادہ عرصے تک عہدے پر برقرار نہ رہ سکا کیونکہ دوسرے ہی سال وہ حاکم صوبہ کی حیثیت سے دکن بھیج دیا گیا[۳] اور اس کی جگہ عالم متبحر، علامی افضل خاں مقرر ہوا جو بادشاہ کے زمانۂ شہزادگی میں اس کا معتمد ترین دیوان و مشیر کار رہ چکا تھا۔

علامی افضل خاں

افضل خاں اس عہدے پر دس سال تک فائز رہا، یہاں تک کہ ۱۲ سنہ جلوس میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ بحیثیت دیوان بادشاہ کا معتمد علیہ تھا اور تمام لوگ اس کا بے انتہا ادب و احترام کرتے تھے۔ لہذا سلطنت کے نظم و نسق میں اس کا بہت عمل دخل رہا اور آصف خاں کو بحیثیت وکیل نمایاں ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ بادشاہ کے تمام دوروں میں وہ اس کے ساتھ ساتھ رہا اور انتظامی امور کے علاوہ

۱۔ یہ عجیب بات ہے کہ دونوں معاملوں کا تعلق ابوالحسن ہی سے ہے۔ ایک بادشاہ کے ابتدائی زمانۂ حکومت میں اس کا تقرر ہوا۔ اور دوسرے بادشاہ کے دور حکومت میں انہیں حالات کے تحت وہ علحدہ کر دیا گیا۔

۲۔ صفحہ ۹۱۔

۳۔ اعظم خاں کے خطاب کے ساتھ۔ اس کا ذکر آئندہ سطور میں اسی خطاب سے کیا گیا ہے۔

فرامین شاہی کا مسودہ تیار کرنا بھی اسی کے ذمے تھا۔ اس زمانے میں تمام اہم فرامین کا مسودہ اسی نے تیار کیا تھا، بالخصوص ان فرامین کا جو دیگر بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام بھیجے گئے۔[1] اس امر کا مزید ثبوت کہ سلطنت میں اسے بہت بلند مقام حاصل تھا اور امور سلطنت کی انجام دہی میں وکیل سے زیادہ اس کا عمل دخل تھا، ۱۰ سنہ جلوس کے ایک اور واقعے سے ملتا ھے جب شاہ جہاں بوجہ علالت ۱۹ دن صاحب فراش رہا۔ امور سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں افضل خاں کو بادشاہ کی خواب گاہ میں حاضر ہونے کا موقع دیا گیا۔

مولف چہار چمن جس کو افضل خاں کی بدولت فروغ حاصل ہوا تھا اور جو ہر موقع پر اس کے ساتھ رہا تھا، اس زمانے کے

---

۱ - دورۂ پنجاب میں ' ۷ سنہ جلوس ' لاھوری، جلد اول - ۱۰ سنہ جلوس ' لاھوری، جلد دوم ' صفحہ ۲۳۴ - اپنے دفتر اور عملے کے ساتھ ' لاھور ' ۱۲ سنہ جلوس ' لاھوری، جلد دوم ' صفحات ۱۹ اور ۱۱۷ -

خطوط بنام نذر محمد خاں ' شاہ بلخ ' ۶ سنہ جلوس ' لاھوری، جلد دوم ' صفحہ ۳۶۶ - خطوط بنام شاہ ایران ' ۶ سنہ جلوس ' لاھوری، جلد دوم ' صفحہ ۳۷۸ -

مسودۂ صلحنامہ بشکل فرمان بنام عادل خاں (بیجا پور) ' ۹ سنہ جلوس لاھوری، جلد دوم ' صفحہ ۲۰۳ -

خط بنام قطب الملک ' جس میں اس انگشتری کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا تھا جس میں مشہور یاقوت بطور نگین استعمال ھوا تھا - ۹ سنہ جلوس' لاھوری، جلد دوم ' صفحہ ۲۰۹ -

لاھوری، جلد دوم ' صفحہ ۱۳۲ ' افضل خاں کے شاہی معتمد علیہ ہونے کے ثبوت میں ' اس کے انتقال کے وقت اور بیماری کے دوران مں اس کے مکان پر بادشاہ کی تشریف آوری کا ذکر کرتا ھے ' اس نے فی الجملہ ۲۸ سال بادشاہ کی خدمت کی اور ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کیا -

حالات کے بارے میں بہترین سند کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جن شاہی ملازمین سے اسے سابقہ پڑا، ان کے انتظامی کام سے زیادہ، وہ ان کے کردار، صلاحیت عمل اور درجہ و مقام کے ذکر کو اہمیت دیتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے مربی و محسن کی بے انتہا تعریف کرتا اور اسے ایک نہایت قابل، ہوشیار اور ہر دلعزیز دیوان کہتا ہے اور اس کے بیان کی تائید خود شاہ جہاں کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت سے بھی ہوتی ہے، تاہم وہ (مولف چہار چمن) متعلقہ محکمے میں اس کے کام کی تفصیل بیان نہیں کرتا۔ صرف ایک جگہ لکھتا ہے کہ ''مالگزاری اور مالیہ کے انتظام سے متعلق اس نے بعض ضوابط وضع کیے جن کا مقصد یہ تھا کہ رعیت خوش حال ہو، بادشاہ کی خوش حالی کی دعاؤں میں اضافہ ہو اور خود اس کی نیک نامی ہو۔۔۔۔۔۔''[1]

اس کا تصور وزارت

ذاتی صلاحیت، علمی فضیلت اور سلطنت میں اعالی مقام رکھنے کے علاوہ، افضل خاں بہت منکسر المزاج اور سادگی پسند واقع ہوا تھا اور اعتمادالدولہ کی طرح طبعاً امن پسند بھی تھا۔ خود شاہ جہاں کا قول ہے کہ میرے سامنے کبھی افضل خاں نے کسی شخص کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔[2]

---

۱ - ۲ - برہمن، صفحات ۹۴ - ۹۵ - وہ اس کے ایسے اقوال بھی درج کرتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وزارت کے متعلق افضل خاں کا تصور کیا تھا - (۱) ''وزیر دو قسم کے ہوتے ہیں - اول وہ جو بادشاہ کا ارشاد گوش ہوش سے سنتے، اسے اچھی طرح سمجھتے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں - دوم وہ جن کے مشوروں کے مطابق خود بادشاہ عمل کرتا ہے اور جن کی صائب رائے پر اسے اعتماد ہوتا ہے -

اسلام خاں

اسلام خاں حاکم بنگالہ دیوان کل مقرر کیا گیا۔ ابتدا میں وہ صرف ایک محرر تھا لیکن اپنی ذاتی قابلیت اور وفاداری کی بدولت رفتہ رفتہ ترقی

بقیہ حاشیہ صفحہ ما سبق

هم ، آج کل کے وزیر ، بادشاہ کے ارشاد کو نہ صحیح طور پر سمجھ سکتے هیں نہ اس کی مرضی اور پسند کے مطابق اس پر عمل کر سکتے هیں - پھر قسم دوم میں ہمارا شمار کس طرح هو سکتا هے ؟" (۲) بادشاہ کو ایک بڑے دارالحکومت کی ضرورت هوتی هے - خزانے میں جب تک کافی روپیہ نہ هو فوج کی تشکیل نہیں هو سکتی - جب تک فوج کافی نہ هو ملک میں امن و امان بر قرار نہیں رہ سکتا نہ کوئی حکومت قائم رہ سکتی هے ، اور جب تک امن و اماں نہ هو حکومت کو کہیں سے آمدنی نہیں هو سکتی - جب نظم و نسق اچھا هو اور ملک میں خوشحالی هو تو بادشاہ کا خزانہ بھی بھرا رهتا هے ، لیکن ملک اسی وقت خوش حال هوتا هے جب مختار کل (یعنی بادشاہ) سب معاملات کو اچھی طرح سمجھتا هو اور بذات خود ان پر توجہ کرتا هو -

(۳) روپیہ خرچ کر کے فوج کی تشکیل تو هو سکتی هے مگر ملک میں امن و امان قائم نہیں هوتا اور عوام کے قلوب پر فتح حاصل نہیں هوتی جب تک کہ ایک ایسا با اختیار شخص (سر براہ حکومت و وزیر) بر سر اقتدار نہ هو جس کی نظر وسیع هو جو جرات مند هو ، تجربہ کار ، متقی و پرهیزگار اور خوش اطوار هو اور ساتھ ساتھ اس پر اعتماد بھی کیا جاتا هو - نیز اسے (عہدہ داران سلطنت و ملازمین سرکار کا) درجہ بڑھا دینے یا گھٹا دینے ، انہیں انعام و اکرام عطا کرنے ، انہیں ان کے عہدوں پر برقرار رکھنے یا انہیں معزول کر دینے کے پورے اختیارات حاصل هوں - یہ بھی ضروری هے کہ اس کے تابین (ذاتی سپاهی) تعداد میں کافی هوں تا کہ وہ بڑے سے بڑے امراء و سرداران سلطنت سے باز پرس کر سکے -"

کر کے امیر کے درجہ تک پہنچ گیا - بادشاہ کے زمانۂ شہزادگی میں وہ اس کے ملازمین میں شامل تھا اور چند روز دربار شاہی میں اس کا نمائندہ بھی رہ چکا تھا - بادشاہ کی تخت نشینی کے بعد وہ بخشئی دوم اور میر بخشی کے عہدوں پر فائز رہا اور اس نے گجرات و بنگال کے حاکم کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں -

بنگال سے جب تک وہ دارالحکومت نہ پہنچ گیا اس کی اسامی اور اس کے محکمے سے متعلقہ امور کا جو عارضی انتظام کیا گیا اس سے ضمناً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ محکمے میں کس طرح کام ہوتا تھا اور بادشاہ خود کام کی نگرانی کرتا تھا -

دفتر کا داخلی انتظام

دیانت رائے (رائے رایاں) جس کے ذمے محکمے کے شعبۂ خالصہ کا انتظام تھا، عارضی طور پر دیوان مقرر کیا گیا اور حکم یہ جاری ہوا کہ (الف) دیوانی سے متعلق تمام امور بادشاہ کے سامنے

بقیہ حاشیہ صفحۂ ما سبق

غرضکہ اس کے تصور کے مطابق وزیر ایسا ہونا چاہیے جسے کشوری و عسکری دونوں قسم کے اختیارات حاصل ہوں جس پر بادشاہ کو اس قدر اعتماد ہو کہ وہ جو چاہے کر سکے - سلطنت میں اس کا درجہ و منصب سب سے اعلی ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر وہ تابینوں کی سب سے زیادہ تعداد نہیں رکھ سکتا جن کی پرورش کا انحصار اس کے سرکاری منصب پر ہوتا ہے - اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان، تینوں کے وزیروں کو سلطنت میں اعلی ترین درجہ حاصل نہ تھا -

پیش کیے جائیں اور دیانت رائے صرف ان امور کی نگرانی کرے جن کا تعلق تفصیلات یا دفتری کارروائی سے ہو ۔

(ب) منصب داروں کی تنخواہوں کا رجسٹر جعفر خاں کے سپرد کیا جائے۔ وہ اس سے متعلقہ جملہ امور بادشاہ کے سامنے پیش کیا کرے اور حسب الحکم اس پر دستخط کیا کرے ۔

(ج) جاگیروں کی اسناد پر بھی وہی دستخط کیا کرے اور وہی ان پر مہر ثبت کیا کرے ۔[1]

اس سے متعلق برھمن نے مزید تفصیلات بہم پہنچائی ھیں۔ وہ لکھتا ھے : ''دیانت رائے جاگیروں کے کاغذات پر دستخط کرتا نیز دیوان اور کڑوڑیوں کے پروانہ جات پر مہر لگاتا تھا حالانکہ یہ کام دیوان اعلیٰ کا تھا ۔ تاھم شاھی ھدایات کے بموجب وہ جگہ خالی چھوڑ دی جاتی تھی جو دیوان اعلیٰ کی مہر اور دستخط کے لئے مقرر تھی ۔ چونکہ بیباقئی حساب[2] سے متعلق جوابات کی تسوید دیوان اعلیٰ کا کام تھا ، رائے رایاں نے کئی بار یہ کام انجام دینے کی کوشش کی لیکن رائے سوبھا چند[3] نے، جو شعبۂ مذکور کا ذمہ دار تھا اور اپنی دیانت داری و بے لوثی کے لئے مشہور تھا ، ھمیشہ اسے روکا اور اسے کبھی یہ کام نہ کرنے دیا ۔

---

۱ - لاھوری ، جلد دوم ، صفحہ ۱۳۲ ۔

۲ - برھمن ، صفحات ۱۰۰ و ۱۰۱ - اس سے وہ احکام مراد تھے جو جاگیرداروں کے واجب الوصول رقوم کی وصولی کے بارے میں جاری کیے جاتے تھے ۔ یہ کام بڑی ذمہ داری کا تھا ۔

۳ - ۱۳ سنہ جلوس میں لاھور کا دیوان مقرر کیا گیا ۔

اسلام خاں نے ۳ سنہ جلوس میں اپنے عہدے کا جائزہ لیا اور ۹ ، سنہ جلوس تک اس پر برقرار رہا ۔ اسی سال وہ دکن کے چاروں اضلاع کا حاکم بنا کر دکن بھیج دیا گیا ۔

رائے رایاں اپنے سابقہ عہدے پر رہا اور معلوم ہوتا ہے کہ محکمے کا پرانا عہدہ دار ہونے کی حیثیت سے اس کا وہاں کافی اثر تھا ۔ اسلام خاں اس کے ساتھ گام نہ کر سکا اور رائے نے اپنی خوشی سے استعفا دیدیا اور اس کے بعد وہ دیوان بیوتات مقرر کر دیا گیا ۔ برھمن کہتا ہے کہ اس محکمے سے رائے کا تبادلہ ہو جانے کے بعد ہی اسلام خاں کو فی الواقع دیوان سمجھا گیا ۔[1]

خان کی شخصیت ، ایک وزیر کی قابلیت اور ایک امیر کی عظمت کا مجموعہ تھی ۔ ''وہ جفا کش اور ارادے کا پکا تھا ۔ اپنی بات منوا کر چھوڑتا اور اسے اپنے وقار کا بے حد خیال رہتا ۔'' اس کا قول تھا کہ جملہ امور عالم کا انتظام صرف ایک انسان کامل کا کام ہے ۔ وہ ایک کامیاب سپہ سالار بھی تھا ۔ بنگال میں نمایاں خدمات انجام دے چکا تھا اور اپنی فوجی صلاحیت اور علمی فضیلت کی بناء پر 'صاحب سیف و قلم' کے لقب سے مشہور تھا ۔ وہ ایک اچھا انشا پرداز اور شاعر بھی تھا ۔ افضل خاں کی طرح وہ بھی سرکاری دوروں اور جنگی مہموں میں بادشاہ کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور سارا کام خود کرنے کا شائق تھا کسی دوسرے

---

۱ - برھمن ، صفحہ ۱۰۲ -

شخص کی مداخلت وہ قطعاً پسند نہ کرتا تھا ۔ کام سے اسے عشق تھا اور دوسروں سے بھی سختی سے کام لیتا تھا ۔[1]

دیوان کے عہدے پر جتنے تقررات ہوئے ان میں بڑی دلچسپ مثال اس کے (اسلام خاں کے) تبادلے اور سعداللہ خاں کے تقرر کی ہے ۔ خان دوراں نصرت جنگ کے انتقال پر، جو اعلیٰ درجے کا فوجی جنرل اور حاکم دکن تھا، بادشاہ نے اسلام خاں سے کہا کہ تم اس عہدے کے لئے کسی شخص کا نام تجویز کرو ۔ دیوان نے وعدہ کیا کہ میں اس معاملے پر غور کر کے کسی شخص کا نام تجویز کروں گا ۔ وہ مکان گیا اور اپنے خاص مشیروں اور دوستوں سے مشورہ کیا ۔ انھوں نے کئی نام تجویز کیے ۔ لیکن اسلام خاں کو کسی کی رائے پسند نہ آئی ۔ جب اس سے دریافت کیا گیا کہ آپ کس کا نام تجویز کرتے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ میں اپنا نام اس عہدے کے لیے تجویز کرتا ہوں ۔ یہ سن کر سب کو تعجب ہوا لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ خود اعلیٰ حضرت کا میلان خاطر سعداللہ خاں کی طرف ہے اور مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں خود ہی اپنے عہدے سے دست بردار ہو جاوں بجائے اس کے کہ کسی نہ کسی بہانے سے علحدہ کیا جاؤں ۔

چنانچہ اس نے بادشاہ کے سامنے اپنا خیال ظاہر کیا اور بادشاہ نے دریافت کیا ''تمھاری جگہ کون کام کرے گا ۔'' اس پر اس

---

۱ - لاہوری ، جلد دوم ، برہمن ، صفحات ۱۰۰ - ۱۰۲ - مآثرالامراء ، جلد اول ، صفحات ۱۶۲ - ۱۶۶ مخلوط تتمہ ۱۶۷۰۳ ، ورق ۹ - م ، ت ۲۶۱۳۱ ، اوراق ۲۳ اور ۲۴ الف ۔

نے جواب دیا ''سعداللہ خاں سے زیادہ کوئی دوسرا شخص اس عہدے کا مستحق نہیں ہے''۔ شاہ جہاں نے کہا ''منظور ہے''۔ خان کو ترقی کے ساتھ رخصت دی گئی تا کہ وہ اپنا نیا عہدہ سنبھالے ۔ سعداللہ خاں پہلے عارضی دیوان بنایا گیا اور چند ماہ بعد دیوان کل کی حیثیت سے مستقل کیا گیا ۔[1]

سعداللہ کا عروج

متعدد دیگر اشخاص کی طرح اسے بھی اس کی ذاتی قابلیت ، کار کردگی اور وفا شعاری کی وجہ سے عروج حاصل ہوا ۔ اسے بادشاہ نے خود منتخب کیا تھا اور یہ اس بات کا مزید اور زیادہ پختہ ثبوت ہے کہ وہ خاندان ، عز و جاہ ، اور تمول کے امتیازات کے مقابلے میں ذاتی قابلیت کی زیادہ قدر کرتا تھا ۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس عہدے پر کن اوصاف کا آدمی مقرر کیا جاتا تھا ۔

---

۱ - ۱۳ سنہ جلوس میں جب بادشاہ لاہور گیا تھا سعداللہ خاں کی فضیلت علمی کا شہرہ اس کے کانوں تک پہنچا تھا ۔ صدر موسوی خان کے ذریعے وہ حضور شاہی میں پیش ہوا اور روزینہ دار (روزانہ نقد تنخواہ لینے والے) کی حیثیت سے بادشاہ کے ذاتی عملے میں داخل کر نیا گیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے نہ کوئی درجہ دیا گیا نہ وہ منصب داروں میں شامل کیا گیا ۔ ایک سال کے اندر اسے ۱۰۰۰ ذات اور ۲۰۰ سوار کا درجہ عطا ہوا اور اسے 'عرض مکرر' کا عہدہ بھی ملا ۔ یہ عہدہ عموماً ایسے شخص کو دیا جاتا تھا جس پر بادشاہ کو سب سے زیادہ اعتماد ہوتا تھا ۔ دوسرے ہی سال وہ ''داروغۂ غسل خانہ'' بنا دیا گیا ۔ اس عہدے کے لئے اول الذکر عہدے سے بھی زیادہ اعتماد کی ضرورت تھی ۔ ۱۷ سنہ جلوس میں وہ میر سامان بنا دیا گیا اور اس کا منصب دو ہزاری کیا گیا ۔ ۱۸ سنہ جلوس میں اس کا منصب سہ ہزاری کر دیا گیا ۔ ۱۹ سنہ جلوس میں وہ دیوان خالصہ بنایا گیا اور فرامین کی مسودہ نگاری پر مامور ہوا ۔ اسی سال وہ دیوان مقرر ہوا اور بعد ازاں پنج ہزاری منصب کے ساتھ دیوان کل بنا دیا گیا ۔

اس کی صلاحیتیں

سعداللہ خاں ، شاہ جہاں کا سب سے زیادہ ، ذی علم ، سب سے زیادہ کارگزار اور سب سے اچھا دیوان تھا وہ اپنے زمانے کے مروجہ علوم کا منتہی تھا اور اپنے ماتحت عہدہ داروں سے کام لینے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا ۔[1]

چندر بھان کہتا ہے کہ ''حسابات ، مال گزاری اور مالیات کے متعلق اپنی گزارشات قلم بند کرتے وقت اسے نہ اپنے معتمدین کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی نہ اپنے ناظرین حسابات کی ماہرانہ رائے کی'' ۔ ''اس کے علم و فضل کو دیکھ کر ابوالفضل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے'' ۔[2]

محکمے سے متعلقہ امور میں اور ایسے امور میں بھی جن کا تعلق عام حکمت عملی سے تھا ، سعداللہ خاں نے اپنی کارکردگی ،

بقیہ حاشیہ صفحہ ما سبق

۲۰ سنہ جلوس میں بلخ کی مہم میں نمایاں خدمات انجام دینے کے صلے میں اس کا منصب ہفت ہزاری کیا گیا ۔ اور ۲۳ سنہ جلوس ایک کروڑ دام (ڈھائی لاکھ روپے) وظیفہ مقرر ہوا ۔

۱ ۔ فارسی اور عربی کے علاوہ وہ ترکی زبان بھی جانتا تھا ۔ وہ نہایت خوش گفتار اور فصیح البیان مقرر تھا اور علمائے عراق و عجم سے بہتر سمجھا جاتا تھا (برہمن ، صفحہ ۱۹۵) برہمن اس کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس کا مقرب خاص تھا ۔ وہ اس کے متعلق ویسا ہی لکھتا ہے جیسا اسے اپنے ذاتی تعلقات کی بناء پر پاتا ہے ، محض ایک نائب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے دوست کی حیثیت سے بھی ، جو اس کے تمام دیگر شعبہ ہائے زندگی میں اس کے ساتھ رہتا ہو ۔ وہ لکھتا ہے کہ ''بعض اوقات میں شام سے لے کر آدھی رات تک اس کے ساتھ رہتا ہوں'' ۔

۲ ۔ برہمن ، صفحہ ۱۰۵ ۔

صاف گوئی اور دیانت داری کی بدولت بادشاہ کا کامل اعتماد حاصل کر لیا تھا اور انھیں اوصاف کی وجہ سے اس کی ہر جگہ عزت کی جاتی تھی۔ اس کی اعلیٰ حیثیت اور اس کے اثر کی وجہ سے نیز ذمہ داری[۱] کے متعلق اس کے تصورات کے باعث اس کا کام بہت آسان ہو گیا ہوگا اور انھیں باتوں نے اسے اپنے محکمے کی کارکردگی میں اضافہ کرنے کے قابل بنا دیا ہوگا۔[۲]

اسے اپنے کام میں جسونت رائے (۱۵ سنہ جلوس تا ۲۲ سنہ جلوس) اور رگھو ناتھ رائے (۲۳ سنہ جلوس تا ۳۰ سنہ جلوس) سے مدد ملی۔ یہ دونوں دیوانان خالصہ تھے۔ ان کے علاوہ اسے شعبۂ فرامین میں چندر بھان برہمن سے مدد ملی۔[۳] ان سب سے اس کے تعلقات بے انتہا خوشگوار تھے۔

---

۱ - برہمن، صفحہ ۱۱۰ - اس کا قول تھا کہ بادشاہوں کی صحبت میں انسان صرف ایک ہی لطف اٹھا سکتا ہے اور لطف ہے عوام‌الناس کو فائدہ پہنچانے کے لیے اختیارات کا استعمال - یہی وجہ تھی کہ مشاہیر سلف نے بھی بادشاہوں کی صحبت سے علحدگی کے فوائد کے مقابلے میں ان کی مصاحبت کو گوارا سمجھا۔

مآثرالامراء، جلد دوم، صفحہ ۹۴۴ - "ایمانداری بہت اچھی چیز ہے نمک حلالی ایک مسلمہ اصول ہے لیکن جہاں راعی و رعایا کے باہمی معاملات کا سوال ہو وہاں نمک حلالی کا تقاضا یہ ہے کہ رعایا کی بہبود کا خیال رکھا جائے۔"

۲ - = م، ت ۶۵۸۸ - ورق ۹۷ - کروڑیوں کے فرائض میں اصلاحات۔ متعدد پرگنہ جات کو ملا کر حلقے (چکلے) بنانے اور ہر حلقے کو ایک امین فوجدار کے تحت کر دینے سے کروڑی اپنے اختیارات فوجداری سے محروم ہو گئے - ان کا بھتا بھی دس روپے فی صد سے گھٹا کر ۵ روپے فی صد کر دیا گیا۔

۳ - مخطوطہ، اصل ۱۶۹۰ - ورق ۹۷ - برہمن - صفحہ ۱۰۶ -

اس کی صاف گوئی

ان تمام امور میں جن کا تعلق اسے کے فرائض سے ہوتا وہ ہمیشہ انصاف و ایمانداری کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ واجب الوصول سرکاری رقوم کی وصولی میں وہ کبھی اس بات کو برداشت نہ کرتا تھا کہ محصلین کو کسی قسم کا کوئی گزند پہنچے یا کاشتکار کو تکلیف ہو۔ اس کے دور وزارت میں ہندوستان خوشحال ہو گیا۔ حالانکہ دارا شکوہ جیسا شہزادہ اس کے خلاف تھا لیکن اس کی کوئی شکایت کبھی اس کے خلاف کار گر نہ ہوئی''۔ یہ بعد کے ایک مورخ کی رائے ہے جو ایسے تاریخی مواد پر مبنی ہے جو ہم تک نہیں پہنچا [۱]

دارا شکوہ کا معاملہ

اس کی تصدیق اورنگ زیب کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے جو یہ ہے کہ ایک موقع پر دارا شکوہ کے دیوان بھاڑا مل نے کچھ حسابات بادشاہ کے سامنے پیش کئے اور دو لاکھ روپے بقایا کا مطالبہ کیا جو حکومت کے ذمے واجب الادا تھے۔ شاہ جہاں نے وہ کاغذات سعداللہ خاں کے حوالے کر دیے اور اسے حکم دیا کہ وہ دفتر دیوانی سے حسابات کی جانچ کر کے کیفیت پیش کرے۔ سعداللہ نے فوراً کہا کہ اتنی بڑی رقمیں خزانے سے ادا نہیں کی جاتیں اور مطالبۂ مذکور قواعد کے خلاف ہے۔ اس طرح وہ معاملہ ختم ہو گیا۔ دیوان کا فیصلہ آخری فیصلہ تھا۔

---

۱ - مآثر الامراء ، جلد دوم ، صفحہ ۹۴۴ -

دارا شکوہ بھی وہیں موجود تھا ۔ دربار ختم ہو جانے کے بعد اس نے سعداللہ خاں کو بہت سخت سست کہا ۔ یہ تمام واقعہ غسل خانے میں رونما ہوا چنانچہ غسل خانے کے محرر نے اصالةً اس واقعے کی اطلاع شاہ جہاں کو پہنچائی ۔ شاہ جہاں نے فوراً ایک خط میں شہزادے کو لکھا ۔ ''کسی صاف باطن شخص سے جھگڑا کرنا خود اپنا نقصان کرنا ہے ۔ جو شخص آئینے پر تلوار مارتا ہے اپنے آپ کو قتل کرتا ہے ۔[۱] -------- ملازمین شاہی کے جذبات کو مجروح کرنا بہت برا ہے بالخصوص سعداللہ خاں جیسے شخص کے جذبات کو ۔ ملازمین سرکار کے دلوں کو جیتنا دانشمندی ہے اور ایک ایسا فعل ہے جس کے باعث بادشاہ کی اقبال مندی اور ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا ہے'' شام ہوتے ہوتے بادشاہ نے محمودی اور کار چوبی کے کئی تھان بطور تحفہ اپنے منظور نظر دیوان کے پاس بھیجے ۔ اس طرح اس کی عزت افزائی کی گئی اور اس قضیے کا خاتمہ ہوا ۔[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر تقررات کے سلسلے میں بھی شاہ جہاں اپنے وزرا سے مشورہ کیا کرتا تھا ۔ حالانکہ وہ مملکت کے تمام اعلیٰ عہدہ داروں سے بذات خود واقف تھا ۔ سعداللہ خاں کے تقرر اور اسلام خاں کے تبادلے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جبکہ ایک صوبہ دار کے تقرر کے بارے میں دیوان کی سفارش طلب کی گئی تھی ۔ اس کی ایک اور مثال ہمیں اورنگ زیب کی

---

۱ اور ۲ - م ، ت ٦۵۸۸ ، ورق ۵۱ -

معرفت ملتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مرتبہ سعید خاں بہادر[1] نے شاہ جہاں سے ایک شخص کے متعلق سفارش کی اور اس کی بڑی تعریف کی۔ بادشاہ نے اس کی سفارش منظور کر لی اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ وہ مناسب اور مستحق اشخاص ہی کی سفارش کرتا ہے۔ تاہم یہ حکم دیا کہ دیوان اعلیٰ اس کی استعداد کا امتحان لے اور اس کے لیے کوئی مناسب اسامی تجویز کرے۔[2]

اس کی فوجی خدمات

اپنے محکمے سے متعلقہ امور کے علاوہ سعداللہ خاں نے بلخ اور قندھار کی مہموں میں اپنی وزارت کے دوران ہی میں بہت سر گرمی سے حصہ لیا۔

پہلی مہم میں جب شہزادہ مراد نے، جس کے ذمے فوج کی کمان تھی، دارالحکومت واپس آنے کی خواہش ظاہر کی تو اسے نو مفتوح علاقے کو معقول انتظام کیے بغیر چھوڑ آنے کے ارادے پر تنبیہ کی گئی اور سعداللہ خاں کو زبانی ہدایات کے ساتھ وہاں

۱۔ سعید خاں ولد سعید خاں بہادر ظفر جنگ کو خطاب ۲۰ سنہ جلوس میں دیا گیا۔ بعد ازاں اسے کابل بھیجا گیا جہاں وہ ۳۰ سنہ جلوس تک رہا۔ اس طرح مذکورہ معاملے کا تعلق ۲۰ سنہ جلوس سے ہے (کیونکہ نام کے ساتھ لفظ بہادر استعمال کیا گیا ہے) یا اس کا تعلق ۳۰ سنہ جلوس سے ہے جبکہ وہ سعداللہ خاں کے انتقال سے قبل جو اسی سال ہوا واپس آیا (م، ت ۶۵۸۸ - ورق ۵۰ الف)۔

۲۔ م، ت ۶۵۸۸، ورق ۵۰ الف۔

بھیجا گیا تا کہ وہ اسے وہیں ٹھہرے رہنے کی ترغیب دے۔[1] لیکن وہ اپنے ارادے پر مصر رہا جس کی وجہ سے بادشاہ اس سے ناراض ہو گیا۔ وہ منصب اور جاگیر دونوں سے محروم کر دیا گیا اور اسے حکم دیا گیا کہ ملتان جائے اور تا حکم ثانی وہیں ٹھہرا رہے۔ سعداللہ خاں مذکورہ علاقے کا سر براہ مقرر کیا گیا اور وہاں کے کل انتظامات اس کے سپرد کر دیے گئے۔

مفتوحہ ملک کا بندوبست اور اس کے اختیارات

اسے حکم دیا گیا کہ وہ اس علاقے کا بندوبست مالگزاری کرے اور اس کے ساتھ ہی حسب ذیل اختیارات دیے گئے :-

(الف) رعایا کے حالات کی تحقیقات اور حسب ضرورت لگان میں تخفیف کرنا۔

(ب) فوج کی نقل و حرکت سے جو نقصانات ہوئے ہوں ان کا نقد معاوضہ ادا کرنا۔

(ج) نقد تنخواہ پانے والے عہدہ داروں کو، اگر وہ چاہیں، وہاں جاگیریں عطا کرنا۔

(د) حاجتمندوں کو تین ماہ کی تنخواہ کے برابر تک رقم کا مناسب مقدار میں قرضہ دینا۔

(ہ) علاقۂ مذکور سے نئے فوجی سپاہی بھرتی کرنا اور

۱ - لاہوری، جلد دوم - ۲۰ سنہ جلوس، صفحات ۸۰۷ و ۸۰۸ - صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہان مغلیہ مفتوحہ علاقوں سے متعلق اپنے فرائض کی بابت کیا خیالات رکھتے تھے - اس معاملے کا تعلق بلخ کے قبضے سے ہے جہاں کا حاکم نذر محمد خاں شکست کے بعد مفرور ہو گیا تھا -

(و) مہم مذکور میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کے متعلق ان کی خدمات کی بناء پر منصب اور مشاہروں میں ترقی کی سفارش کرنا اور نو مفتوح علاقے کی مالگزاری کا بندوبست کرنا۔[۱]

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وزیر کے فرائض کس قدر وسیع تھے، اس کا مقام کتنا بلند تھا اور بادشاہ اس پر کتنا اعتماد کرتا تھا۔ اس نے احکام شاہی کی تعمیل نہایت خوبی سے کی اور واپسی پر، بطور صلۂ خدمات اس کے منصب میں ایک ہزار سوار کا اضافہ کیا گیا۔[۲]

---

۱ - لاہوری، جلد دوم، ۲۰ سنہ جلوس، صفحات ۵۶۰ و ۵۶۱ - لاہوری، کہتا ہے کہ اس اعتماد کی وجہ سے جو بادشاہ کی نظر میں سعداللہ خاں کو حاصل تھا، نیز حکومت کے راز ہائے سر بستہ سے اس کی واقفیت اور اس کی سریع قوت فیصلہ کے باعث بادشاہ کو ہرگز یہ بات گوارا نہ تھی کہ سعداللہ خاں دربار شاہی سے دور رہے۔ اس کے باوجود ضرورت محسوس ہوئی کہ وہاں ایک قابل اعتماد شخص رہے جو بادشاہ کی طبیعت اور خواہشات سے واقف ہو اور ساتھ ساتھ ایسی حیثیت کا مالک اور ایسے تجربے کا حامل ہو کہ ہر شخص اس کے قول و فعل پر بھروسا کر سکے اور اس کی خوشی لوگوں کی تسلی کا باعث اور ناخوشی ان کے خوف کا موجب ہو۔ چنانچہ بادشاہ نے سعداللہ خاں کو بلخ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

۲ - لاہوری، جلد دوم، صفحہ ۵۸۴ - راستے کی دشواریوں کے باوجود وہ بلخ سے چار دن میں کابل پہنچ گیا۔ جب اس کے ارادے کی اطلاع بادشاہ کو دی گئی تو اس نے شاہی اصطبل سے چار گھوڑے اس کے پاس بھیج دیے تاکہ اس وقت جبکہ خود اس کے گھوڑے حسب دلخواہ کام نہ کر سکیں، وہ شاہی گھوڑوں سے کام لے سکے۔ اس نے جتنی سفارشات کیں سب منظور کی گئیں اور جن اشخاص کو ترقی دی گئی ان میں سعادت خاں، اخلاص خاں، حیات خاں، روپ سنگھ، رام سنگھ اور گوکل داس کے نام شامل ہیں۔ (صفحہ ۵۹۵)۔

۲۲ سنہ جلوس میں وہ اورنگ زیب کے عملے میں شامل کیا گیا اور پھر ۲۵ سنہ جلوس میں، ملتان سے اورنگ زیب کی روانگی سے قبل ھی خود ایک لشکر جرار لے کر بلخ پہنچا۔ ان دونوں مواقع پر، میدان جنگ کے انتظامات، محاصروں کی تنظیم، سرنگیں بچھانے، مورچے تیار کرنے اور دیگر جنگی انتظامات کے سلسلے میں اس نے اپنی غیر معمولی صلاحیت و ھنر کے کمالات دکھائے۔[1]

اس کی دوسری فوجی مہمات

۲۶ سنہ جلوس میں، محاصرہ اٹھا لینے کے بعد وہ واپس آیا اور اسی سال پھر اس نے رانا راج سنگھ کے خلاف فوج کشی کی، جس نے جہانگیر کے ساتھ اپنے دادا کے معاھدۂ صلح کی خلاف ورزی کرتے ھوئے قلعۂ چتوڑ کی مرمت کر لی تھی۔ چنانچہ احکام شاھی کے مطابق وہ قلعہ مسمار کر دیا گیا۔[2]

دیگر وزراء کے مقابلے میں اس کی حیثیت

غرضکہ سعداللہ، ابوالفضل کی طرح جنگی مہمات میں بھی اسی طرح کامیاب ثابت ھوا جس طرح وہ دیگر امور وزارت میں کامیاب رھا، لیکن ان مہمات میں اس کی خدمات

---

۱ - صالح، جلد دوم، مسودہ، ان مہمات میں اس نے کیا حصہ لیا اوراس سلسلے مین اسے کیا انعام و اکرام ملا اس کے لیے دیکھیے صفحات ۳۰۷ ۳۵۴، ۳۹۴، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۳۸، ۳۵۴، ۳۶۹ تا ۳۷۲ - مآثرالامراء، جلد دوم، صفحات ۴۴۶ - ۴۴۸ - برھمن، ان باتوں کا ذکر نہیں کرتا۔

۲ - تفصیل کے لیے حاشیہ نمبر ۱ دیکھیے۔



سعداللہ خاں

شاہ جہاں کا منظور نظر اور مقبول عام دیوان جس کا قول تھا کہ نمک حلالی ایک مسلمہ اصول ہے لیکن آقا کے ان معاملات میں جن کا تعلق غربا سے ہو، وفاداری یہ ہے کہ موخرالذکر کا خیال رکھا جائے۔

یہ تصویر درباری مصور انوپ چتر کی تیار کردہ ہے۔

(مسودہ برٹش میوزیم - تتمہ ۱۸۸۰ نمبر ۳۲)

جس لحاظ سے شاہان گزشتہ کے دیگر وزراء مثلاً منعم اور مظفر، امیرالامراء اور آصف خاں قزوینی کی خدمات سے مختلف تھیں اس کا ذکر ضروری ہے حالانکہ جن حالات میں وہ خدمات انجام دی گئیں وہ سب کے لیے یکساں تھے - دیگر وزراء نے اپنے فرائض وزارت سے علحدہ ہو کر فوجی سپہ سالاروں اور کمان داروں کی حیثیت سے کام کیا تھا - فوجی سپہ سالاروں کی حیثیت سے دارالحکومت چھوڑ دینے کے بعد امور وزارت سے ان کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا لیکن سعداللہ خاں وزیر اعظم کی حیثیت ہی سے باہر گیا اور اسی حیثیت سے اپنے اقتدار و اختیار سے برابر کام لیتا رہا - اس کا معاملہ آصف خاں ابوالحسن کی طرح تھا جسے ۳ سنہ جلوس شاہ جہانی میں دکن بھیجا گیا تھا -[۱] جس طرح اس وقت سپہ سالاران فوج کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور بہ عجلت تمام کارروائی کرنے کے لیے آصف خاں ابوالحسن کے ذاتی وقار و اثر سے کام لینے کی ضرورت تھی اسی طرح سعداللہ خاں کا بلخ بھیجا جانا بھی ناگزیر سمجھا گیا -

اس کا انتقال اور شاہ جہاں پر اس کا اثر

۳۰ سنہ جلوس میں جب مصائب کے سیاہ بادل آسمان پر چھانے لگے تھے، سعداللہ خاں کی اچانک موت نے شاہ جہاں کو اپنے سب سے زیادہ قابل اعتماد، وفادار اور کارگزار وزیر سے محروم کر دیا - اسی زمانے میں شاہ جہاں کو اس کی مدد کی انتہائی ضرورت تھی - بادشاہ کے بعد مملکت میں اسی کا درجہ تھا

---

۱ - لاہوری، جلد دوم، صفحہ ۳۱۹

اور وہ بہت ہر دلعزیز دیوان تھا۔ اس کی حیثیت، اس کی ہر دلعزیزی نیز بادشاہ کی طبیعت پر اس کا اثر، یہ سب ایسی خوبیاں تھیں کہ بہت ممکن تھا وہ اس وقت کے پیچیدہ معاملات کو سلجھانے اور مشکلات کو حل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

سعداللہ خاں، صرف شاہ جہاں کا بہترین دیوان ہی نہ تھا بلکہ وہ شاہان مغلیہ کے طویل سلسلۂ وزراء میں سب سے اچھا وزیر کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں جو درجہ اسے حاصل ہے اور جو ہم عصر مؤرخین ہی کا عطا کردہ ہے، وہ ان وزراء کو بھی نصیب نہ ہو سکا جو اس کے بعد فوراً ہی عہدۂ وزارت پر مامور ہوئے۔ مولف ارشادالوزراء، جس کا تعلق اورنگ زیب کے عہد سے ہے اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے وزراء کی فہرست سے صرف چار نام[۱] منتخب کرتا ہے اور ان میں سعداللہ خاں کو سب سے اونچے درجے پر رکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ وہ پنجابی تھا لیکن نہایت فاضل تھا اور اسے بڑی صلاحیتیں حاصل تھیں۔[۲] اس کی اس رائے سے اہل پنجاب کی قابلیت و ذہانت کو تو کوئی ٹھیس نہیں لگتی مگر سعداللہ خاں کی حیثیت اور زیادہ مستحکم ہو جاتی ہے۔

---

۱ - م، ا - ۲۳، اوراق ۶۴ و ۶۵ - ابوالفضل، اعتمادالدولہ، آصف خاں، ابوالحسن، سعداللہ خاں، میر جملہ کے علاوہ جس کا ذکر اورنگ زیب کے دور حکومت کے تحت کیا جائے گا۔

۲ - م، ا ۲۳۳، اوراق ۶۴ و ۶۵ - (الف) اگرچہ پنجابی بود بسیار فضیلت با استعداد داشت، (ب) وہ اسی طرح اعتمادالدولہ اور آصف خاں کے متعلق بھی طنز کرتا ہے (ورق ۶۸ - جس پر پنسل کا نشان ہے) م - ا ۱۸۴۳ - مخطوطے کے اس صفحے پر متعدد غلطیاں ہیں۔ م - ا ۱۸۷۳، ورق ۲۳۲ -

اس کے انتقال پر شاہ جہاں کا خط

شاہ جہاں نے جو خط اس کے انتقال پر علی مردان خاں کو لکھا ہے اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دیوان کی قدر وقیمت اپنے آقا کی نظر میں کیا تھی اور اس کے انتقال پر بادشاہ کو کس قدر صدمہ ہوا۔ شاہ جہاں نے جتنی قدر سعداللہ کے کمالات کی اس کی زندگی میں کی یا جس طرح اس کے انتقال کے بعد اس کی وفاداری اور قابلیت کے متعلق اپنے ایک خط میں اظہار خیال کیا،[1] اس سے بڑھ کر کوئی ثبوت کسی وزیر کی وفاداری اور قابلیت کا نہیں ہو سکتا۔

عارضی انتظامات

سعداللہ خاں کے انتقال نے شاہ جہاں کو عملاً کسی دیوان اور قابل اعتماد مشیر سے محروم کر دیا۔ دیانت رائے کی طرح، دیوان خالصہ رائے رگھو ناتھ رائے کا عارضی طور پر تقرر کیا گیا اور اسے رائے رایاں کا خطاب عطا ہوا۔ علاوہ بریں چندر بھان برہمن، رائے کے خطاب کے ساتھ فرامین کی مسودہ نگاری پر مامور ہوا۔ اس عارضی دیوان نے بھی انھیں احکام کے بموجب کام کیا جو اس سے پہلے ایک ایسے ہی موقع پر جاری کیے گئے تھے۔ دیوان اعلیٰ کی مہر اور دستخط کے لیے جو جگہ مخصوص تھی وہ خالی چھوڑ دی جاتی تھی اور تمام اہم امور بادشاہ کی ذاتی نگرانی میں انجام پاتے تھے۔

۱- م- ا- ۱۸۹۲، اوراق ۱۰۷- ۱۰۹، اس خط کا چربہ ضمیمے میں دیکھیے۔

میر جملہ

میر جملہ معظم خاں کے خطاب کے ساتھ دیوان مقرر ہوا اور اس نے سعداللہ خاں کے انتقال سے چار ماہ بعد کام شروع کیا لیکن اسی سال وہ دکن بھیج دیا گیا اور اس کے بیٹے محمد امین خاں کو اس کی جگہ عارضی طور پر کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ کاغذات پر دستخط اسی کے ہوتے تھے مگر مہر معظم خاں کی لگائی جاتی تھی۔

دکن میں اسے زیادہ عرصے تک قیام کرنا پڑا جس کے باعث کام میں ہرج واقع ہوا۔ چنانچہ رگھو ناتھ رائے کو پھر ایک موقع دیا گیا اور اس مرتبہ اسے اختیارات بھی زیادہ دیے گئے۔ محمد امین کو دیوانی سے ہٹا کر بخشی بنا دیا گیا۔ رگھو ناتھ کو اجازت دی گئی کہ وہ تمام کاغذات پر دستخط کرے حتیٰ کہ اسے محاسبات کے جوابات کے مسودے پر بھی دستخط کرنے کا اختیار دیا گیا۔ یہ ایسا حق تھا جو نہ دیانت رائے کو ملا تھا نہ محمد امین کو۔ کچھ دن بعد وزیر خاں بھی، جس کا تعلق محکمۂ دیوانی سے تھا، قائم مقام دیوان کا شریک کار بنایا گیا اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ تمام اہم کاغذات پر رائے رایاں کے دستخط کے نیچے اپنے دستخط بھی کیا کرے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی اپنی مہر لگانے کی اجازت نہ تھی۔ معظم خاں کو ابھی تک عہدے پر برقرار رکھا گیا تھا اور اس کی مہر استعمال کی جاتی تھی۔[1]

۱۔ صالح، جو اس عہد کا خاص وقائع نگار ہے، اس کے متعلق خاموش ہے۔ اسی طرح صادق خاں بھی ان واقعات کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس کے متعلق معاصر مؤرخین میں صرف برہمن کا بیان ملتا ہے اور وہ وزارت سے قریبی تعلقات رکھنے کی بنا پر سب سے زیادہ مستند بھی ہے۔

جعفر خاں

۳۱ سنہ جلوس میں جعفر خاں دیوان بنایا گیا لیکن رائے رایاں کو بھی عہدے پر برقرار رکھا گیا اور محاسبات پر نئے دیوان کے ساتھ دستخط کرنے اور پروانہ جات پر جعفر خاں کی مہر کے نیچے مہر لگانے کے اختیارات بھی اسے حاصل رہے۔[1] چندر بھان اب رائے رایاں کے ماتحت کر دیا گیا اور اس کا تبادلہ دیوان کے دفتر میں ہو گیا۔

غرضکہ اکبر کے دور حکومت کی دو عملی اس زمانے میں پھر رائج کی گئی لیکن اس مرتبہ محکمہ دیوانی کی یہ دو عملی زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی۔ جعفر خاں کا تبادلہ مالوے کا کر دیا گیا اور رائے رایاں بلا شرکت غیرے دیوان رہا۔ وہ راجہ کے خطاب کے ساتھ اس عہدے پر ایک مستقل وزیر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔[2]

---

۱ - جعفر خاں کا منصب ۵۰۰۰ ذات و سوار کا تھا اور رائے رایاں ۱۰۰۰ ذات اور ۴۰۰ سوار کا منصب رکھتا تھا۔

۲ - راجہ کا خطاب اسے عالمگیر نے دیا - عالمگیر ھی نے اس کا منصب سہ ھزاری کیا اور اسے عہدۂ مذکور پر مستقل کر دیا۔ وہ اپنے انتقال تک جو ۶ سنہ جلوس عالمگیری میں ہوا اپنے اس عہدے پر برقرار رہا۔

م - ا - ۱۶۹۰ - ورق ۹۴ - ت ۱۶۷۰۳ ' اوراق ۱۴۰ اور ۵۱۵ - ۵۶۲

م - ا - ۱۸۹۲ - اوراق ۱۱۳ - ۱۱۷ -

م - ت - ۱۶۷۰۳ - ورق ۱۴۰ -

دور حکومت شاہ جہانی کے آخری حصے کے متعلق صالح بہت اختصار سے کام لیتا ھے اور ۲۸ سنہ جلوس سے ۳۱ سنہ جلوس تک تو وہ مذکورہ بالا امور کی بابت گویا کچھ بتاتا ھی نہیں (صفحات ۵۱۵ - ۵۶۲) -

دور شاہ جہانی میں وزارت کی اہم خصوصیات

شاہ جہاں کے ۳۱ سالہ دور حکومت میں چھ مستقل دیوان ہوئے۔ ان کے علاوہ دو اشخاص قائم مقام دیوان بنائے گئے۔ اس مدت کے ۲۷ برس تین اشخاص یعنی افضل خاں،[1] اسلام خاں[2] اور سعداللہ خاں[3] کی وزارت میں گزرے اور باقی چار سال دوسرے تین اشخاص کے دور وزارت میں ختم ہوئے۔

شاہ جہاں کے دور حکومت میں بھی وزارت کی اہم خصوصیات وہی تھیں جو اکبر اور جہانگیر کے دور حکومت میں بیاں ہوئیں۔ حیثیت یا درجے کا لحاظ کیے بغیر صرف ذاتی قابلیت کی بناء پر کسی شخص کو منتخب کر لینے کا طریقہ جو پہلے رائج تھا اسی پر شاہ جہاں کے دور حکومت میں بھی عمل کیا گیا۔ افضل خاں اور اسلام خاں کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ اس وقت سے بادشاہ کے وابستگان دامن میں سے تھے جب وہ ابھی تخت پر بیٹھا بھی نہ تھا اور سعداللہ خاں کو باقی تمام بڑے بڑے امراء پر ترجیح دے کر پانچ سال کی ملازمت کے بعد ھی دیوان بنا دیا گیا۔

چونکہ ان وزراء کا انتخاب ذاتی قابلیت اور بادشاہ سے وفاداری کی بناء پر کیا گیا تھا، اس لیے ان میں سے دو وزیر تو مرتے دم تک دیوان رہے، اور ایک کا تبادلہ دکن کا محض اس لیے کیا گیا تاکہ اس کی جگہ ایک نسبتاً جوان اور زیادہ کار آمد شخص کا تقرر

---

۱ - دس سال - ۲ سنہ جلوس سے ۱۲ سنہ جلوس تک۔
۲ - سات سال - ۱۲ سنہ جلوس سے ۱۹ سنہ جلوس تک۔
۳ - دس سال - ۱۹ سنہ جلوس سے ۳۰ سنہ جلوس تک۔

کیا جائے۔ بہر حال ان میں سے کوئی کسی قصور کی بناء پر بر طرف نہیں کیا گیا۔ غرضکہ جہانگیر کے عہد کی یہ روایت، کہ دیوان مر کر ہی عہدے سے ہٹے، اس زمانے میں بھی برقرار رہی۔

سوم یہ کہ چند روز اس دو عملی کا بھی تجربہ کیا گیا جو عہد اکبری میں وزارت کی اہم ترین خصوصیت تھی لیکن دونوں میں بہت فرق تھا۔ اکبر نے اس طریقے کو راجہ اور مظفر جیسے بڑے بڑے با اثر وزراء کو مقرر کر کے آزمایا لیکن شاہ جہاں نے اس طریقے کا تجربہ نئے اور نا تجربہ کار یا قائم مقام دیوان مقرر کر کے کیا۔

چہارم یہ کہ محکمے کے داخلی انتظامات سے، جن کا علم ضمناً عارضی وزرا کے تقرر کے سلسلے میں ہوا، یہ پتا چلتا ہے کہ اس وقت تک دو عملی کے طریقے میں بہت کچھ ترقی ہو چکی تھی۔ ابوالفضل کے اکبر نامے اور آئین میں ان تفصیلات کا ذکر نہیں ہے جو اس زمانے میں نظر آتی ہیں۔ یہ یقیناً اس ترقی کا نتیجہ تھا جو عہد شاہ جہانی تک اس ضمن میں ہو چکی تھی۔

دیوان اپنے محکمے میں کیا فرائض انجام دیتا تھا اس کا ایک خاکہ نیچے درج ہے:

شاہ جہان کے نائب دیوان

دیوان خالصہ :-

دیانت رائے — یکم سنہ جلوس سے ۱۴ سنہ جلوس تک

بھاڑا مل — ۱۴ سنہ جلوس سے ۱۵ سنہ جلوس تک

جسونت رائے — ۱۵ سنہ جلوس سے ۲۳ سنہ جلوس تک
رگھو ناتھ رائے — ۲۳ سنہ جلوس سے ۳۰ سنہ جلوس تک

دیوان تن :-

رائے مان داس — یکم سنہ جلوس سے ۵ سنہ جلوس تک
میر عبداللیف — ۵ سنہ جلوس سے ۹ سنہ جلوس تک
دیانت رائے — ۹ سنہ جلوس سے ۱۴ سنہ جلوس تک
(خالصہ کے ساتھ شامل)
جسونت رائے — ۱۴ سنہ جلوس سے ۱۵ سنہ جلوس تک
مکند داس — ۱۵ سنہ جلوس سے ۱۶ سنہ جلوس تک
(دیوان بیوتات بنا دیا گیا)
عبدالمالک — ۱۶ سنہ جلوس سے ۲۶ سنہ جلوس تک
رائے رگھوناتھ رائے — ۲۶ سنہ جلوس سے ۳۰ سنہ جلوس تک
(خالصہ کے ساتھ شامل)

دیوان کا محکمہ اور اس کے دفتر کا کام

محکمۂ دیوان، دیوان اعلیٰ یا وزیر کے علاوہ حسب ذیل اشخاص پر مشتمل ہوتا تھا :—

(الف) دیوان خالصہ (خالصہ اراضی کے لئے)
(ب) دیوان تن (تنخواہوں کے لئے)
(ج) مشرف (محاسب خاص)
(د) مستوفی (حسابات کی تنقیح کرنے والا)

ان میں سے ہر شاخ کام کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف شعبوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ ہر عہدہ دار کا ایک مددگار پیشی یا معتمد ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ متعدد منتظمین دفاتر، اور اہل کاروں پر مشتمل ایک بڑا عملہ ہوتا تھا۔ یہ سب محکمے کے طریقۂ کار سے واقف اور اس کے متعلق خاص تربیت پائے ہوئے ہوتے تھے۔

اول الذکر دو عہدہ داروں کی حیثیت بلحاظ تقدم وہی تھی جو فہرست هذا میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ وہ دیوان کے رفیق کار نہیں بلکہ ماتحت ہوتے تھے۔ مشرف کا درجہ فیروز تغلق کے زمانے میں دیوان کے بعد ہوتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں بھی اسے یہی درجہ حاصل رہا۔ مستوفی کی اہمیت بھی اس کے کام کی نوعیت کے لحاظ سے برقرار رہی لیکن اب یہ اس طرح مملکت کا ایک بڑا عہدہ دار نہیں رہا تھا جیسا سلاطین دہلی کے دور حکومت میں ہوتا تھا۔

فیروز تغلق کے دور حکومت میں، مستوفی کی نشست دفتر دیوانی میں، وزیر کے قریب دائیں طرف ہوا کرتی تھی[1] لیکن شاہان مغلیہ کے عہد میں اسے ایسا کوئی امتیاز حاصل نہ تھا۔ بھگوان داس اکبر کا ممتاز ترین مستوفی تھا۔ اس کے انتقال پر اکبر کو بہت صدمہ ہوا لیکن اس وقت جو الفاظ اس کے منہ سے نکلے وہ یہ تھے ”در بتکچیاں بسیار کار آگاہ بود“۔

ایسے وقت جب کہ صوبۂ بہار بغاوت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جاگیرداران بہار سے سختی کے ساتھ روپیہ وصول کرنے کی

۱۔ عفیف، صفحہ ۴۱۹۔

غیر دانشمندانہ پالیسی اختیار کرنے پر ابوالفضل نے شاہ منصور پر جو سخت تنقید کی ہے اس میں وہ دیوان اور مستوفی کے فرق کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ''وہ (دیوان) ایک ایسا وزیر ہوتا ہے جو ذکاوت اور دیانتداری کے ذریعے سرکاری آمدنی میں کمی بھی نہیں ہونے دیتا اور بندگان خدا کی فلاح و بہبود کی کوشش بھی کرتا ہے --- ---- وہ ان امور کو نظر انداز نہیں کرتا جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب ہوتے ہیں۔ نہ وہ فراہمی زر کو بہترین مشغلہ سمجھتا ہے ----- نیز مستوفی کو فرائض محرری انجام دینے، تنازعات کی آگ بھڑکانے اور بقایا رقوم وصول کرکے سرکاری آمدنی زیادہ کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا چاہیے''۔[1]

دیوان اپنے دفتر میں

محض سرکاری اصطلاحات اور الفاظ سے دیوان کے فرائض و اختیارات کی اتنی وضاحت نہیں ہوتی جتنی ان امور کی تشریح سے ہوتی ہے کہ دیوان کے دفتر میں کس طرح کام ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے کس نوعیت کا کام گزرتا تھا اور کن کاغذات پر اس کی منظوری ضروری تھی۔ سر براہ محکمۂ مال ہونے کی حیثیت سے وہ مملکت کے ہر اس عہدہ دار پر نظر رکھتا تھا جو جاگیر سے اپنی تنخواہ وصول کرتا تھا۔ چونکہ مملکت میں سب سے زیادہ عاملانہ اختیارات اسی کو حاصل رہتے تھے، اس بناء پر اختیارات محکمۂ مال کے علاوہ اسے صوبوں اور عہدہ داران صوبہ پر بھی اختیارات حاصل تھے۔ ان عہدہ داروں میں حاکم صوبہ سے لے کر عامل اور پٹواری تک

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۳۱۵ ترجمہ ۴۶۲

سب ھی شامل تھے - وزیر مالیات کی حیثیت سے اس کی نظر ایک ایک پائی (دام) پر رھتی تھی جو شاھی خزانے میں داخل ھوتی یا اس سے باھر جاتی تھی - اس طرح مذکورہ فرائض سہ گانہ کی بدولت اس کا تعلق اپنے ذاتی محکمے کے علاوہ مرکزی حکومت کے تینوں محکموں سے ، امرا و عمائد سلطنت سے ، خواہ وہ کسی عہدے پر فائز ھوتے یا نہ ھوتے ، اور صوبائی نظم و نسق کے ھر شعبے سے قائم رھتا تھا - اس عام نگرانی کے باعث اسے وزرائے مملکت میں قطعی طور پر اعلیٰ ترین مقام حاصل تھا - ''دیوان کے عہدے کا تعلق تمام امور سلطنت سے رھتا ھے لہٰذا اس عہدے پر فائز ھونے والے شخص کی وفاداری کا تقاضا یہی ھونا چاھیے کہ وہ سلطنت کے نظم و نسق کی کامیابی کو کلیۃً اپنی ذات پر منحصر سمجھے ------ جملہ عہدہ داران اعلیٰ و ارفع ، مثلاً با اثر بخشی ، میر ساماں ، بیوتات ، مشرف ---- اور دیگر ملازمین و زمیندار نیز رعایا کے دوسرے تمام طبقے اسی سے رجوع کرتے ھیں '' -[1]

عہدہ داروں کا تقرر

حسب ذیل عہدہ داروں کا تقرر اس کی معرفت ھوتا تھا -

صدر مقام : (الف) صوبیدار ، فوجدار ، دیوان ، کروڑی ، امین اور داروغے -

صوبائی : (ب) مشرف ، تحویلداران دیہات (جو دفتر خزانہ میں تعینات رھتے تھے) ، خزانچی ، خزانے کے داروغے اور محرران دفتر خزانہ -

---

۱ - م - ت ، ۶۵۹۹ ، ورق ۱۱۲ -

(ج) سزا ول — (وہ اشخاص جو اہم و فوری معاملات سے متعلق مرکزی حکومت کے مجریہ احکام پر عمل درآمد کرانے کی خدمت پر مامور ہوتے تھے) -

(د) امین اور کروڑی -

(ہ) تحصیلدار (بقایا جات کی وصولی کے لیے مقرر کیے جاتے تھے) -

(و) زمیندار (مالگزاری وصول کر کے سرکاری خزانے میں داخل کرتے تھے) -

کاغذات و احکام مجریۂ دیوان جن پر بادشاہ کی منظوری یا اس کے دستخط ضروری نہ تھے :—

(الف) تمام وہ کاغذات جن کا تعلق عمال کے سوالات اور ان کے جوابات سے ہوتا تھا -[1]

(ب) منظور شدہ تقررات اور شہزادوں کے نقد مشاہروں کے صداقت نامے اور پرگنوں میں یہ مشاہرے ادا کرنے کے احکام -

(ج) عہدہ داران ماتحت کی تنخواہوں اور عہدہ داران خزانہ اور کروڑیوں کے لیے منظور شدہ حق الخدمت ادا کرنے کا احکام -

---

۱ - جہاں فنی مشکلات ہوتی تھیں عمال سوالات مرتب کرتے اور ضروری احکام کے لیے مرکزی حکومت کو بھیج دیتے تھے - اختصار کے ساتھ وضاحت کرنے کے لیے خاص فارم وضع کیے گئے تھے -

(د) وہ احکام جن میں حکومت کو واجب الادا بقایا رقوم کے ادا کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔

(ہ) ضروری مدد[1] دینے کے احکام۔

(و) واجب الادا بقایا رقوم کے عوض مال یا جائداد کی ضبطی کے احکام۔

(ز) صوبائی خزانوں کی فاضل رقوم کو مرکزی حکومت کے پاس بھیج دینے کے احکام۔

(ح) ایسے معاملات سے متعلق اس کے احکام جن کی جانب بادشاہ نے خاص طور پر اسے توجہ دلائی ہو۔

(ط) ایسے تمام شاہی احکام کی ترسیل جو صوبوں کے لیے اور فوج سے متعلق جاری ہوئے ہوں۔

(ی) واقعہ نویسوں کے پاس سے آئی ہوئی رپوٹوں کی بنیاد پر جاری کیے ہوئے احکام۔

(ک) اور کسی دیگر معاملے پر جس کا حکم بادشاہ نے دیا ہو۔ دفتر سے جاری کیے ہوئے ایسے تمام احکام پر دیوان اپنا خاص نشان لگاتا اور دستخط کرتا تھا۔ ان پر دیوان خالصہ کے دستخط بھی ہوتے تھے۔ جو یہ الفاظ درج کرتا تھا کہ ''نشان اور دستخط کی جانچ کی گئی''۔[2]

۱۔ اس سے وہ مدد مراد ہے جو مشکل اور تکلیف دہ مواقع پر اراضی کا لگان وصول کرنے کے سلسلے میں فوجدار، عاملوں کو دیا کرتے تھے۔ ایسے احکام پر افسر مال کی منظوری ضروری ہوتی تھی تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ اس کے ماتحتوں کی کارروائی درست ہے۔

۲۔ م۔ا۔ ۱۶۴۱ ورق ۳۰ ب اور ت ۶۵۹۹، ورق ۱۵۱ ب۔

دستک یا صداقت نامے ، جو وہ خزانوں اور خزانچیوں کے نام حسب ذیل امور کے لیے جاری کرتا تھا :-

(الف) احکام خزانۂ مرکزی کے تحت تنخواہوں کی ادائی نیز افواج کو پیشگی رقوم کی ادائی کے لیے (بشرطیکہ ایسی ادائی کا حکم بادشاہ نے دیا ہو) ۔

(ب) سفر خرچ کے لیے ۔

(ج) وہ جو سرکاری ملازمین کے نام جاری کیے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے فرائض سنبھالیں ۔

دیوان کے دستخط حسب ذیل کاغذات وغیرہ پر ضروری تھے :-

(الف) صوبوں کے دیوانوں اور عاملوں کے بھیجے ہوئے کیفیت نامے موصول ہونے پر جو مسودات تیار ہوتے تھے ۔ جن امور کی جانب بادشاہ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہوتا وہ دیوان کے دستخط کے بعد اس کی خدمت میں ارسال کر دیے جاتے باقی امور پر محکمہ ھی کارروائی کرتا تھا ۔

(ب) منصب داروں ، برقندازوں اور سواروں کی نقد تنخواہوں کے مطالبات ۔

(ج) خان ساماں (میر ساماں) کے دفتر سے موصول شدہ مطالبات جو نقد تنخواہوں کی ادائی سے متعلق ہوتے تھے ۔

(د) شاھی خزانوں کے نقد فاضلات ، زمینداروں سے متعلق کیفیت نامے ، حسابات کے رجسٹر جو بخشیوں کے دفتر

سے موصول ہوتے تھے - بقایا جات رقوم سرکاری کے گوشوارے ، وہ ان تمام کاغذات کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا -

(ھ) حسابات جن کی جانچ پرتال مستوفیوں نے کی ہو -

(و) ضمانت نامے جو ملازمت اور ادائی بقایا جات وغیرہ کے سلسلے میں لیے جاتے تھے -

ان فرائض کے علاوہ اس کے دفتر میں مالگزاری اور مالیے کے تمام گوشوارے محفوظ رکھے جاتے تھے اور اس کا مطالبہ یہی رہتا تھا کہ تمام دیوان ، امین ، کروڑی اور شاہی خزانچی بعض دیگر کاغذات بھی بلا ناغہ اس کے دفتر میں بھیجتے رہیں -[1]

تمام احکام شاہی کی نقلیں اس کے دفتر میں آتی تھیں اور انہیں وہ بخشیوں اور خان ساماں (میر ساماں) کے دفتر کو ارسال کر دیتا تھا -

دیوان کا دفتر متعدد شعبوں میں منقسم تھا تاکہ مذکورہ فرائض اچھی طرح انجام پا سکیں اور ہر شعبے کے ذمے جو کام تھا اس کی صراحت صاف طور پر کر دی گئی تھی :-

شعبہ (الف) ان کیفیت ناموں اور دیگر کاغذات پر کارروائی کرتا تھا جو صوبوں سے موصول ہوتے تھے -

شعبہ (ب) بقایا سرکاری رقوم کی بابت کارروائی کرتا تھا -

شعبہ (ج) کا تعلق ان پروانہ جات سے تھا جو محکمے سے جاری کیے جاتے تھے -

---

۱ - لر ۱۶۴۱ ، ورق ۴۳ میں ان تمام کاغذات کی فہرست درج ہے - جو اس کے دفتر کو بھیجے جاتے تھے -

شعبہ (د) دستکوں سے متعلق تھا اور
شعبہ (ہ) ان کاغذات سے متعلق تھا جو بادشاہ کو ارسال کئے جاتے تھے -

معلوم ہوتا ہے کہ روزمرہ کے دفتری طریقۂ کار میں دیوان تن کی بہ نسبت دیوان خالصہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی، نیز یہ کہ دیوان خالصہ کا تعلق محض اراضئ خالصہ سے نہ ہوتا تھا - جس طرح ایسے تمام کاغذات پر جن پر بادشاہ کے دستخط مطلوب ہوتے، یا جو بغرض اطلاع اس کے پاس بھیجے جاتے تھے، پیشتر دیوان اعلیٰ کے دستخط لازمی تھے، اسی طرح ضروری تھا کہ وہ تمام کاغذات دیوان خالصہ کی معرفت آگے جائیں جن کا تعلق محض محکمۂ دیوان سے ہو، حالانکہ اکثر کاغذات پر وہ صرف ''ملاحظہ شد'' لکھ دیتا تھا - اس سے پتا چلتا ہے کہ اسے ان معاملات میں فیصلے یا کارروائی کا کوئی اختیار نہ تھا -[1]

اسی طرح تمام کاغذات جن کا تعلق نقد تنخواہوں سے ہوتا تھا دیوان کی معرفت گزرتے تھے اور اس سلسلے میں وہ

---

۱ - جو کاغذات دیوان کے سامنے پیش ہوتے تھے ان پر وہ ایک دو لفظ لکھ دیتا تھا - ہر نوع کے کام کے متعلق خاص خاص الفاظ مقرر تھے - مندرجۂ ذیل نمونہ ان الفاظ کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے - انھیں الفاظ کے ساتھ دستخط کر دئے جاتے تھے : (ا - ۱۶۴۱ ' ورق ۱۵۱) -

تصدیق	یادداشت	روزنامچہ	اسناد
(روزنامچہ میں درج کیا گیا)	(برائے نظر ثانی بھیجا جائے یعنی بادشاہ کے پاس)	(ملاحظہ ہوا)	(عطا ہوئی)

حسب ذیل کاغذات کی تفصیلات اپنے دفتر میں محفوظ رکھتا تھا :—

(الف) فہرست منصب داران جو بخشیوں کے پاس سے موصول ہوتی تھی -

(ب) فہرست محاصل سرکاری جو سال بہ سال وصول ہوتے تھے -

(ج) ضمانت ناموں کے نمونے جو عہدہ داروں اور دوسرے ملازموں سے لیے جاتے تھے -

(د) گھوڑوں کو داغنے اور تصدیق کرنے کا رجسٹر

(ہ) حساب مشاہرۂ منصب داراں -

دفتر مستوفی

دیوان کے دفتر کی طرح مستوفی کا دفتر بھی کئی شعبوں میں منقسم تھا - یہ شعبے علحدہ علحدہ عاملوں ، واجب‌الوصول رقموں ، سرکاری محصولوں ، خزانوں ، جاگیروں ، نقد تنخواہوں میں جاگیروں کی منتقلی ، قرضہ جات اور اسلحہ کے متعلق کارروائی کرتے تھے -[1]

۱ - باب ھذا (باب ٥) کے اسی حصے میں (صفحہ ۲۹۷ سے صفحہ ۳۰۷ تک) جو باتیں مذکور ھوئیں وہ م - ا - ۱۶۴۱ ، اوراق ۳۱ تا ۳۶ اور م - ت - ۶۰۹۹ اوراق ۳۸ - ۱۱۲ - ۱۰۱ و ۱۰۲ ، اور ۱۰۶ سے نیز ت ۶۰۹۸ و ۶۰۹۹ اور تاریخ شاکر خانی میں دیے ھوئے متعدد نمونہ جات تقرر سے ماخوذ ھیں -

باب ششم

میر بخشی

خاکہ

ابتدائیہ	وزیر کے زبردست اختیارات کے خطرات سے بچنے کے لئے وزارت سے محکمۂ فوج کی

علٰحدگی - بلبن اور علاء الدین نے اس سلسلے میں کیا کارروائیاں کیں -

سلاطین دہلی کے دور میں محکمۂ فوج پوری طرح قائم ہوگیا -

محکمے کے مختلف نام - اس کے فرائض -

عہد مغلیہ میں نام کی تبدیلی اور اس محکمے کی ترقی -

مرکزی حکومت کے انتظامی عملے میں میر بخشی کا مقام -

میر بخشی دربار میں (۱) محکمے سے متعلق کام (۲) امیدواران ملازمت کو پیش کرنا - (۳) سپاہیوں اور گھوڑوں کا پیش کیا جانا (۴) عہدہ داروں اور معزز مہانوں کو پیش کرنا - (۵) انعام کے لئے محافظین محل کے نام پیش کرنا -

''غسل خانے'' میں میر بخشی کا کام -

میر بخشی دارالحکومت میں - محل کی حفاظت کے لئے محافظین کا نامزد کرنا - منصب داروں کو طلب کرنا - بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے صوبوں کے خبر نامے وصول کرنا -

میر بخشی بادشاہ کے ساتھ دوروں پر -

میر بخشی اور اس کے دوسرے رفقائے کار میدان جنگ میں ، تین مختلف حیثیتیں :—

(۱) فوج اور اس کے انتظامات کے نگراں بحیثیت مجموعی۔ (۲) بحثیت سپہ سالاراں۔ (۳) کسی شہزادے یا دوسرے کسی بلند منصب امیر کی ماتحتی میں کام کرنے والوں کی حیثیت میں۔

بخشی میدان جنگ میں۔

میر بخشی دفتر میں (۱) تقررات ، تعینات اور اسی قسم کے دوسرے امور کے متعلق دستک (صداقت نامے) جاری کرنا۔ (۲) دیگر کاغذات جن سے اسے سابقہ پڑتا تھا۔

بخشی اول اور بخشی دوم کے مشترک فرائض۔ بخشی سوم اور اس کی حیثیت۔ بخشیوں کی تعداد نہ آئین میں مذکور ہے نہ کسی دوسری جگہ۔ متعلقہ زمانے کے کاغذات سے اس تعداد کا تعین۔

اس عہد کے ممتاز میر بخشیوں کی فہرست۔

میر بخشی کے عہدے کی چند خصوصیات۔

باب چہارم میں بیان ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے بادشاہی نظام میں وزیر کا مقام کیا تھا اور تمام عسکری و کشوری اختیارات ایک ہی وزیر کے ہاتھ میں دے دینے کے طریقے کے خطرات کیا تھے -

سلاطین دہلی میں سب سے پہلے بلبن نے ان خطرات کو اچھی طرح محسوس کیا اور دوسری بادشاہتوں کے تاریخی حالات کی روشنی میں اس نے وزیر کے اختیارات کے خلاف تحفظ کی ایک نہایت معقول صورت یہ نکالی کہ اس سے فوجی محکمہ لے کر ایک دوسرے وزیر کے اختیار میں دے دیا - اپنے دور حکومت میں اس نے اس نئے عہدے کو بے حد اہمیت دی - وہ کہا کرتا تھا کہ اس عہدے پر قلمرو کے اعلیٰ تریں خان کا تقرر ہونا چاہئے اور اسے اپنے محکمے کے متعلق پورے اختیارات حاصل رہنے چاہییں -[۱]

اس کے زمانۂ حکومت میں اس عہدے پر عمادالملک فائز رہا جس کے معقول انتظام کی بدولت اس عہدے نے ایک خاص وقار حاصل کر لیا جو کم از کم خاندان تغلق کے خاتمے تک بر قرار رہا -

بغرا خاں نے بھی اپنے فرزند سلطان کیقباد کو نصیحت کرتے ہوئے اسی بات پر زور دیا کہ فوج کے لئے ایک علحدہ وزیر ہونا چاہیے اور تمام فوجی معاملات اسی کے سپرد ہونے چاہییں -[۲] خود جلال الدین تخت پر بیٹھنے کے قبل اس عہدے پر فائز تھا -[۳]

۱ - برنی - صفحہ - ۱۱۵ -
۲ - برنی ، صفحہ ۱۵۳ -
۳ - برنی - صفحہ ۱۹۷ -

اپنے عہد حکومت میں اس نے یہ عہدہ اپنے بھائی یغرش خاں کے سپرد کر دیا۔[۱] علاء الدین نے اس عہدے کے وقار میں اور اضافہ کر دیا۔ اس کے زمانے کی فوجی ضروریات کے باعث محکمۂ مذکور کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس محکمے میں جس خوش اسلوبی سے کام ہوتا تھا برنی اس کی بے انتہا تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ، ''جہاں تک فوج کی تعداد، اور اس کی کار کردگی، نیز تیر اندازی کی آزمائش اور گھوڑوں کی قیمتوں کے انضباط کا تعلق ہے کبھی کسی پیش رو سلطنت میں اتنا معقول انتظام نہ تھا نہ کسی تاریخ میں اس کا ذکر ہے نہ کسی نے کبھی اپنے ہوش میں اتنا اچھا انتظام دیکھا ہے''۔[۲]

فیروز کے زمانے میں یہ محکمہ پھر عروج پر نظر آتا ہے جب اس کی سربراہی فیروز کے قابل اعتماد غلام، بشیر عمادالملک کے ہاتھوں میں تھی۔ بشیر اپنی انتظامی صلاحیت اور کارکردگی میں شہرۂ آفاق تھا۔ بادشاہ کا منظور نظر ہونے کی وجہ سے اسے اعلیٰ مقام بھی حاصل تھا اور وہ اپنے کام میں بھی بہت ہوشیار تھا۔ ان دونوں خوبیوں نے عہدۂ مذکور کے درجے اور محکمۂ مذکور کے وقار میں چار چاند لگا دیے تھے۔[۳]

---

۱ - برنی - صفحہ ۱۷۴ - ۲ - برنی - صفحہ ۳۳۵ -

۳ - عفیف صفحہ ۳۴۴ - اسی کی طرح ایک دوسرا وزیر مقبول بھی بادشاہ کا منظور نظر وزیر تھا، لیکن وہ اپنی حیثیت، اپنے اختیارات اور بادشاہ کی نظر میں خاص عزت رکھنے کے باوجود جب بشیر عمادالملک کے دروازے کے سامنے سے گزرتا تو اپنے طبل اور شادیانوں کا بجانا موقوف کروا دیتا تھا، اسی طرح جب کبھی وہ اس کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر چلتا تو اپنا چتر علحدہ کروا دیتا تھا۔ نیز بخیال ادب اس کی معیت میں کبھی کسی دوسرے شخص سے گفتگو نہ کرتا تھا۔ (صفحہ ۴۴۴) -

اس طرح مرکزی حکومت میں ایک نیا محکمہ قائم ہو گیا۔ سلطنت دھلی کے دور میں اس کا ذکر متعدد ناموں کے تحت ملتا ھے لیکن سب کے سب کسی امتیاز کے بغیر ایک ھی مفہوم کی ترجمانی کرتے ھیں۔ راوت عرض (برنی ، صفحات ۱۱۴ و ۱۱۵)، عرض ممالک (برنی ، صفحات ۱۷۴ - ۱۹۷ - ۲۴۸ - ۳۲۳، مبارک شاھی ، صفحات ۲۰۱ و ۲۰۲) دیوان عرض (برنی ، صفحات ۶۰ - ۱۱۴ - ۳۶۰ - ۴۷۷ - عفیف اکثر یہی نام استعمال کرتا ھے، صفحات ۲۹۸ - ۴۴۰) عارض (برنی ، صفحہ ۱۱۶ - مبارک شاھی ، صفحات ۵۶ ، ۱۳۵ ، ۲۰۲) -

دیوان عرض کے فرائض

برنی کی کتاب میں متعدد مقامات پر ایسی عبارت ملتی ھے جس سے اس محکمے کے سر براہ کی حیثیت اور اس عہدے کی اھمیت پر بخوبی روشنی پڑتی ھے۔ بلبن کے عمادالملک نے ایک موقع پر کہا کہ ”بادشاہ فوج کا مالک ھے۔ میں اس کا سردار ھوں اور فوج مملکت کی رعایا کی محافظ ھے“۔[1] ایک دوسرے موقع پر اس نے اپنی مسند سے اپنے محکمے کے عہدہ داروں سے خطاب کرتے ھوئے کہا کہ ”تم سب بغور سن لو کہ میں بادشاھوں کی حکومت کا محافظ ، معین ، اور حامی ھوں ، کیونکہ انھوں نے اپنی فوج میرے حوالے کر دی ھے اور اس سے متعلق جملہ امور کی بست و کشاد میرے اختیار میں چھوڑ رکھی ھے۔ اگر میں اپنا فرض ادا نہ کروں اور ھمیشہ فوج میں اضافہ نہ کرتا رھوں اور فوج کے سپاھیوں کو

---

۱ - برنی صفحہ ۱۱۶ -

اپنے بھائیوں اور بیٹوں سے زیادہ عزیز نہ رکھوں تو میں نمک حرام سمجھا جاؤں گا اور داور محشر کے سامنے مجھے ذلیل ہونا پڑیگا۔ اگر میں سپاہیوں کی ضروریات پر نظر نہ رکھوں تو میرا عہدہ بے کار اور فضول ہے"۔[۱]

غرضکہ بلبن کا راوت عرض یا فیروز کا دیوان عرض بادشاہ کا نمائندہ اور محکمۂ فوج کا سر براہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے محکمے میں سیاہ و سفید کا مالک ہوتا تھا۔ بقول بلبن "در دیوان عرض او مطلق العنان باشد" (صفحہ ۱۱۴) بادشاہ تک اسے براہ راست رسائی حاصل تھی۔[۲] فیروز کے عمادالملک کو بھی ہر وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی آزادی حاصل تھی۔[۳]

فوج بھرتی کرنا، فوجی دستوں کو اچھی حالت میں بر قرار رکھنا، فوج کی آزمائش کرتے رہنا، معینہ اوقات میں گھوڑوں اور فرد ملازمان فوج کا معائنہ کرنا اور جنگی مہمات کے لئے انھیں اسلحہ وغیرہ سے لیس رکھنا، محکمۂ مذکور کے مستقل فرائض معلوم ہوتے ہیں۔

---

۱ - وہ اپنی جیب سے خرچ کر کے سپاہیوں کے لیے گھوڑے بہم پہنچاتا اور انھیں مالی امداد دیتا تھا - اسی طرح وہ اپنی تنخواہ سے ہر سال بیس ہزار تنکہ اپنے ماتحت عہدہ داروں اور اپنے ملازمین میں تقسیم کر دیا کرتا تھا - ساتھ ساتھ ان سے یہ درخواست کرتا کہ وہ سپاہیوں کی تنخواہ سے کوئی رقم قانون کے خلاف وضع نہ کریں - (برنی ـ صفحات ۱۱۶ - ۱۱۷)-

۲ - عفیف ـ صفحہ ۲۹۸ -

۳ - عفیف ـ صفحہ ۴۳۷ -

دیوان عرض کے فرائض منصبی کا جو خاکہ اوپر بیان ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عہدہ سلاطین دہلی کے زمانے میں بھی موجود تھا اور یہ کہ فیروز کے زمانے تک نظم و نسق میں اس کا اثر و وقار کافی زیادہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں مغلوں کی آمد کے ساتھ اس کا نام بدل گیا اور اکبر نے رفتہ رفتہ اس کی تشکیل اپنی سلطنت کی ضروریات کے مطابق کر لی۔

لفظ ''بخشی''

لفظ ''بخشی'' غالباً سنسکرت لفظ بھکشو سے ماخوذ ہے جس کا استعمال ابتداءً مشرقی ترکی اور فارسی میں عہد مغلیہ میں نظر آتا ہے۔ اولاً یہ لفظ بدھ مت کی پیشوائیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان معنی میں وہ چین کے ہوشنگ تبت کے لاما اور ''اوغر توئیں'' (Uighur Toin) کا مترادف ہے۔ ترکی النسل محررین کو بھی ''اوغر'' رسم الخط میں ایسی دستاویزات لکھنا پڑتی تھیں جو منگول، اور ترک آبادی کے لئے ہوتی تھیں۔۔۔ ہندوستان کی مغل سلطنت میں بخشی ایک بہت اونچے درجے کا عہدہ دار ہوتا تھا۔ ایک فوجی دستے کا بھرتی کرنا اور اس کے مصارف بھی ادا کرنا اس کی ذمہ داری تھی''۔[1]

سر ڈینی سن راس نے کتاب ''مارکو پولو کے سفر'' (Travels of Marco Polo) کے اشاریہ میں یہ بتایا ہے کہ بخشی، لاماؤں کے ایک طبقے کا خطاب تھا۔ پہلے اسے سنسکرت لفظ بھکشو کی بگڑی ہوئی شکل سمجھا جاتا تھا اس سلسلے میں اس نے مزید حوالہ تنگ پاؤ ۱۹۱۶ء (T'oung Pao 1916) کا دیا ہے۔

---

۱ - انسائکلو پیڈیا آف اسلام - صفحہ ۶۰۰ -

مذکورہ صفحات میں بارتھولڈ لاؤفر (Barthold Laufer) کا وہ مضمون ہے جو اس نے ''تبتی زبان میں دخیل الفاظ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس مضمون میں اس نے اس امر سے بحث کی ہے کہ لفظ بخشی کا تعلق اوغر (Uighur) زبان کے لفظ ''پگ سی'' (Pag-Si) سے کیا ہے، وہ کہتا ہے [1] کہ ''چندر داس نے منگولی زبان کے لفظ ''بکسی'' (Baksi) سے بھکشو کا درست تعلق بتایا ہے''۔ ''منگولی زبان کا یہ لفظ، معلم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور سنسکرت کے الفاظ گرو اور آچاریہ کا مترادف ہے۔ تنگ پاؤ، ۱۹۱۴ء (صفحہ ۴۴) میں، میں نے اس لفظ کے متعلق چند اشارات کئے ہیں اور بتایا ہے کہ سنسکرت کے بھکشو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ تبتی ذریعۂ اطلاع کے بموجب ------ وہ 'ہور' (Hor) کی زبان یعنی ''اوغر'' (Uighur) سے ماخوذ ہے''۔

مزید برآں اس کا بیان ہے کہ یہ لفظ ''اوغر'' زبان کے خاندان سے ہے اور یہ باور کرنے کے معقول وجوہ موجود ہیں کہ منگولوں نے یہ لفظ بھی دوسرے متعدد الفاظ کی طرح اوغر زبان سے لیا ہے''۔ اس لحاظ سے یہ خیال قطعاً ترک کر دینا چاہئے کہ یہ لفظ سنسکرت کے لفظ بھکشو سے ماخوذ ہے۔ وسط ایشیا میں لفظ ''بکسی'' (Baksi) کبھی بدھ مت کے فقیر (بھکشو) کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ بکسی (Baksi) جو ہندوستان کے مسلمان شہنشاہوں کے دور میں ایک فوجی عہدے کا نام تھا اور

---

۱ - صفحہ ۴۴۲ -

اور (Buxee) جو اینگلو انڈین بولی میں تنخواہ بانٹنے والے عہدہ دار کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہ دونوں لفظ الگ ہیں۔ ان کا کوئی تعلق چینی اوغر زبان سے نہیں ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر بخشی کا عہدہ ہندوستان کے شاہان مغلیہ ہی کے دور حکومت سے مخصوص ہے لیکن فوجی محکمہ جس کا انتظام میر بخشی ہی کو سونپا گیا سلاطین دہلی کے زمانے ہی میں ایک علاحدہ محکمہ بن چکا تھا۔

مرکزی حکومت کے انتظامی عملے میں میر بخشی کا مقام

سلطنت مغلیہ میں میر بخشی اپنے محکمے کا اعلیٰ ترین عہدہ دار ہوتا تھا اور اسے دیوان عرض کے تمام اختیارات حاصل تھے، لیکن اس کا عمل دخل اپنے ہی محکمے تک محدود نہ تھا۔ دربار میں بادشاہ کا قرب حاصل رہنے کی وجہ سے اس کا وقار بہت بڑھ گیا تھا۔ فوجی اصولوں کے مطابق ملازمین کی بھرتی، سپاہیوں کی مقررہ تعداد برقرار رکھنے پر عہدہ داروں کے منصب کے قائم رہنے کا انحصار اور ہر سال معینہ مدت گزر جانے پر، مقررہ تعداد میں سواروں کو معائنے کے لیے پیش کرنے کے بعد ان کی تنخواہ کا ادا کیا جانا، یہ تمام امور ایسے تھے جن کی وجہ سے وزیر کے اختیارات کا تقسیم ہو جانا بالکل قدرتی تھا۔ چنانچہ یہی ہوا اور میر بخشی، وزیر کے فرائض و وقار میں برابر کا شریک بن گیا۔

شاہی فرمانوں کی تیاری اور جن مراحل سے یہ فرمان گزرتے تھے، ان کی کیفیت میر بخشی کی مذکورۂ بالا حیثیت کو

بالکل واضح کر دیتی ہے - تمام درجوں کے مناصب پر نیز مملکت کے اعلیٰ عہدوں مثلاً وکالت، وزارت اور صدارت کے عہدوں پر تقررات کے تمام احکام میر بخشی کی معرفت گزرا کرتے تھے - ایسا حکم تقرر جو تعلیقہ (دیکھئے باب ۳) کی صورت اختیار کر لیتا اور جس میں عطائے جاگیر کا ذکر بھی ہوتا، نیز گھوڑوں کو داغ کرنے کی شرط ہوتی، اسی کے پاس بھیجا جاتا تھا - چنانچہ اس نوعیت کے معاملے میں تمام شرائط پر عمل در آمد وہی کراتا تھا - گھوڑے اسی کی نگرانی میں داغے جاتے تھے - وہی سپاہیوں کی مقررہ تعداد کا معائنہ کرتا اور اس کی بنیاد پر ماہوار تنخواہ کا تعین کیا کرتا تھا - جو تعلیقہ (خلاصہ) اس کے پاس آتا اسے وہ اپنے پاس رکھ لیتا تھا اور اس کے بجائے اپنے دستخط اور نشان مہر کے ساتھ ایک صداقت نامہ جاری کر دیتا تھا جسے سر خط کہتے تھے -

اسی صداقت نامے کی بنیاد پر دیوان اپنے کاغذات میں اندراجات کرتا تھا اور پھر انھیں کاغذات کو بادشاہ کے سامنے بغرض منظوری پیش کرتا تھا -

اس طرح جو منظوری حاصل ہوتی اس کی اطلاع میر بخشی کو پھر دی جاتی تھی اور اس کے دستخط اور نشان مہر کے بعد ہی دیوان اسے وکیل کے پاس بھیجا کرتا تھا - فرمانوں کی طرح پروانچے اور برات نامے بھی اسی کی معرفت بھیجے جاتے تھے اور تمام مذکورہ احکام پر بعد تکمیل وہ دیوان سلطنت کی مہر کے برابر اپنی مہر ثبت کرتا تھا -[1]

---

۱ - آئین - صفحات ۱۹۳ - ۱۹۵ - بلاک مین - صفحات ۲۶۰ - ۲۶۳ - باب ۳ بھی دیکھیے -

اوپر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے اثر کا دائرہ مرکزی حکومت کے تمام محکموں تک وسیع تھا اور ان سب سے وہ یکساں معاملت کرتا تھا۔

میر بخشی دربار میں

محکمۂ فوج کے سر براہ کی حیثیت سے اس کا تعلق ہر منصب دار سے رہتا تھا۔ لہٰذا دربار میں اس کی حاضری اس کے مستقل

اپنے محکمے سے متعلق کام

فرائض میں داخل تھی۔ اس حیثیت سے وہ تخت کے داھنی طرف کھڑا ہوتا اور اپنے محکمے سے متعلق امور بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔[1]

امیدواران ملازمت کا پیش کیا جانا

ملازمت کے امیدواروں کو وھی پیش کرتا تھا۔ ''ایرانی، تورانی، رومی، فرنگی، ہندی اور کشمیری سب ملازمت کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ متعلقہ حکام ضوابط کے بموجب ان کی تنخواھیں مقرر کرتے تھے اور بخشی انھیں بادشاہ کے سامنے پیش کیا کرتے تھے''۔[2]

۱۔ باب ۲ دیکھیے۔

۲۔ آئین۔ صفحہ ۱۰۸۔ یہ کام دوسرے بخشی بھی کرتے تھے۔ میر بخشی کی موجودگی ضروری نہ تھی۔ اس سلسلے میں لفظ بخشیاں استعمال کیا گیا ہے۔ آئین صفحہ ۱۹۱

سپاهیوں اور گھوڑوں کا پیش کیا جانا

نئے منصب داروں کے سپاهیوں کو نیز ان کے گھوڑوں کو داغ و نشان کے بعد بادشاہ کے سامنے بخشی پیش کرتے تھے - اسی طرح مستقل عہدہ داروں کے سپاهیوں اور گھوڑوں کو بھی مقرر وقفوں کے بعد وهی پیش کرتے تھے - [1]

عہدہ داروں اور معزز مہمانوں کا پیش کیا جانا

بحیثیت سر براہ محکمہ وہ صوبوں سے آنے والے تمام اعلیٰ عہدہ داروں کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا - اسی طرح ان عہدہ داروں کو جو دارالحکومت سے اپنے اپنے صدر مقامات کی طرف روانہ ہوتے نیز ممالک غیر سے آئے ہوئے سفیروں اور معزز مہمانوں کو بھی وهی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا - اس سلسلے میں ھاکنز (Hawkins) اسے "لفٹننٹ جنرل" کہتا ھے - [2]

انعام کے لیے محافظین محل کے نام پیش کرنا

اعلیٰ ترین عہدہ دار کی حیثیت سے اس کا تعلق محل شاهی کے محافظین سے بھی تھا اور وهی ان کے نام انعامات کے لیے بادشاہ کے سامنے پیش کیا کرتا تھا - بادشاہ انہیں ھاتھی گھوڑے اور دیگر چیزیں بطور انعام عطا کرتا تھا - "بخشی هر روز

---

۱ - دیکھیے صفحہ سابق - نوٹ نمبر ۲ -

۲ - مذکورہ نوعیت کے معزز مہمانوں اور عہدہ داروں کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے کی تفصیلات اس باب میں بیان ہو چکی ھیں جو "بادشاہ اور امور مملکت" کے متعلق ھے لہٰذا انہیں یہاں پھر بیان کرنا ضروری نہیں ھے - ھاکنز صفحہ ۱۱۵ -

ان محافظوں اور سپاھیوں کے نام پڑھ کر سناتے ھیں - اس سلسلے میں وہ ایسے نام سب سے پہلے پیش کرتے ھیں جنھیں پہلے کوئی انعام نہیں ملا ھوتا - اعلیٰ حضرت انھیں گھوڑے عطا فرماتے ھیں - جب کسی سپاھی کو گھوڑا مل جاتا ھے تو اس کا نام پھر سال بھر کسی دوسرے انعام کے لئے پیش نہیں کیا جاتا "۔[۱]

غسل خانے میں بخشی کا کام

میر بخشی غسل خانے میں بھی بادشاہ کے همراہ جاتا اور جب تک وهاں بادشاہ امور سلطنت کی انجام دھی میں مصروف رھتا وہ بھی حضور شاھی میں حاضر رھتا تھا - اس طرح وہ مملکت کے تمام اهم امور سے با خبر ھوتا تھا - یہاں بھی وہ بادشاہ کی داھنی طرف کھڑا ھوتا اور حسب معمول عہدہ داروں کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا کرتا تھا - اس سلسلے میں میر بخشی صلابت خاں کا معاملہ خاص اھمیت رکھتا ھے - راؤ امر سنگھ ایک راجپوت سردار تھا جسے ناگور جاگیر میں ملا ھوا تھا - وہ چند روز کی رخصت لے کر وطن سے دربار شاھی میں حاضر ھوا - ایک دن جب شاہ جہاں نماز مغرب سے فارغ ھو کر امور سلطنت انجام دے رھا تھا - میر بخشی نے راؤ امر سنگھ کو غسل خانے میں بادشاہ کے حضور میں پیش کیا - اس کے بعد راؤ دوسرے اشخاص کے ساتھ بائیں جانب قطار میں کھڑا ھو گیا اور صلابت خاں واپس ھو کر تخت کے داھنی طرف اپنی جگہ پر آگیا - اسی اثناء میں

---

۱ - آئین - صفحہ ۱۹۷ - بلاک مین - صفحہ ۲۶۶ -

بادشاہ ایک فرمان لکھنے میں مصروف ہو گیا اور صلابت خاں شہ نشین سے اتر کر نیچے آیا اور ایک سردار سے گفتگو کرنے لگا جو وہاں موجود تھا اور جو اس وقت شمعدان چار شاخہ کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ اس طرح گفتگو میں مصروف تھا راؤ امر نے اچانک اپنا جمدھر نکالا، اسے ہاتھ میں لیے ہوئے دوڑا اور صلابت کے بائیں پہلو میں اس زور سے گھونپا کہ وہ دستے تک اس کے سینے میں اتر گیا۔ صلابت خاں کی جان وہیں پرواز کر گئی۔ راؤ امر سنگھ پر فوراً ہی خلیل اللہ خاں نے حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ حملے میں دوسرا بخشی اور راجہ بیٹھل داس کا لڑکا ارجن بھی شریک ہو گیا۔ ارجن نے اس پر اپنی تلوار سے حملہ کیا۔ بعد ازاں دوسرے لوگ بھی اس لڑائی میں شریک ہو گئے اور بالآخر راؤ بھی مارا گیا۔[۱]

شاہ جہاں کے دور حکومت میں اہم اور فوری امور کی انجام دہی کے سلسلے میں میر بخشی کو شاہ برج میں بھی آنے کی اجازت تھی۔

---

۱ - لاہوری، ۱۷ سنہ جلوس، جلد دوم، صفحات ۳۸۰ - ۳۸۴ - تحقیقات سے معلوم ہوا کہ راؤ زیادہ شراب خوری کے باعث کچھ دنوں سے کسی دماغی مرض کا شکار تھا۔ راؤ کرن کے ساتھ جاگیر کے متعلق اس کا کوئی جھگڑا تھا اور مقدمہ بادشاہ کے سامنے پیش تھا۔ راؤ کرن سنگھ نے اس کے جارحانہ رویے کے خلاف شکایت کی تھی اور یہ استدعا کی تھی کہ امر مابہ النزاع کے تصفیے کے لیے ایک امین مقرر کر دیا جائے۔ راؤ کرن نے اس معاملے کا ذکر میر بخشی سے بھی کیا تھا اور وہ کچھ عرصے پہلے بادشاہ سے اس کے متعلق عرض کر چکا تھا۔ اس کے سوا بنائے فساد اور کوئی معلوم نہ ہو سکی۔ مقتولین میں دونوں بادشاہ کے منظور نظر تھے اور ان کی موت پر بادشاہ نے اظہار تاسف کیا۔ اس وقت راؤ امر کا منصب ۴۰۰۰ ذات و ۳۰۰۰ سوار تھا۔ راجہ بیٹھل داس کا منصب ۵۰۰۰ ذات اور ۵۰۰۰ سوار تھا اور صلابت خان کا منصب ۴۰۰۰ ذات اور ۲۰۰۰ سوار تھا۔

میر بخشی دارالحکومت میں

مملکت کے اعلیٰ ترین عہدہ دار اور محکمہ فوج کے صدر کی حیثیت سے محافظ دستوں کی فہرست اسی کی تحویل میں رہتی تھی۔ منصب داران دارالحکومت سات دستوں میں منقسم تھے اور ہر دستے کے لیے ہفتے کا ایک ایک دن معین تھا۔ کار منصبی کی انجام دہی ان پر لازم تھی اور انھیں سختی سے اپنے فرض کا پابند رکھا جاتا تھا۔ فہرست مذکور میر بخشی تیار کرتا اور اسے بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ محافظ دستوں کی تبدیلی ہر روز بادشاہ کی نگرانی میں ہوتی تھی۔[1] ہاکنز لکھتا ہے کہ ''وہ تمام اشخاص جو شاہی خزانے سے تنخواہ پاتے ہیں بموجب رسم ہفتے میں ایک دن محافظت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس خدمت سے کوئی مستثنیٰ نہیں رہتا بشرطیکہ وہ تندرست ہو اور شہر میں موجود ہو''۔[2]

اس سلسلے میں شہباز خاں کا واقعہ جو عہد اکبری میں پیش آیا بہت دلچسپ ہے۔

اس کا نام فہرست میں مرزا خاں (بعد میں عبدالرحیم خان خاناں) کے بعد لکھا گیا۔ اس پر وہ نہ صرف بر افروختہ ہوا بلکہ اس نے اس کے متعلق بادشاہ کی موجودگی میں سخت احتجاج بھی کیا اور ایسا کرنے میں حدود شائستگی سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اس بد تمیزی

---

۱ - اکبر کا ناغہ اس دن بھی نہیں ہوا جس دن اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ماتمی لباس پہن کر موقع پر موجود رہا۔(اکبر نامہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۸۳۱)۔

۲ - ہاکنز۔ صفحہ ۱۱۱۔

کی بناء پر اسے کچھ عرصے[1] کے لئے قید کر دیا گیا اور اس کی نگرانی رائے سال درباری کے سپرد کی گئی۔

محافظ دستوں سے متعلق ایک دوسرا اہم واقعہ شیخ فرید میر بخشی کے زمانے میں پیش آیا۔ شیخ فرید نے اپنے اس اختیار کو جو اسے محل شاہی کے محافظ دستوں کی نامزدگی کے بارے میں حاصل تھا، ایک نازک موقع پر ایسی دلیری کے ساتھ استعمال کیا کہ صورت حال خطرناک نہ ہونے پائی۔ اس وقت جب کہ اکبر مرض‌الموت میں مبتلا تھا اور اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ تھی، خان اعظم، وکیل سلطنت اور راجہ مان سنگھ دونوں یہ چاہتے تھے کہ شہزادہ خسرو اکبر کا جانشیں ہو۔ لہٰذا وہ شہزادہ سلیم کو تخت سے محروم رکھنے کے لیے اپنی سازشوں میں منہمک تھے۔ اس عہد کا مورخ تہور خاں لکھتا ہے کہ شیخ فرید نہیں چاہتا تھا کہ اس موقع پر شہر میں کوئی ہنگامہ برپا ہو، لہٰذا اس نے ایک بہت جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ وہ محافظ دستے کے سپاہیوں کو ساتھ لے کر قلعے پر پہنچا۔ تمام بھاری سامان جنگ نکال کر شہر کے باہر روانہ کر دیا اور خود بڑی دلیری اور ایسے وقار کے ساتھ جو اس کی شان کے شایاں تھا، شہزادۂ سلیم کی قیامگاہ پر حاضر ہوا، اس کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہوئے مثل بادشاہ کے اسے سلامی دی۔ ان تمام امرا اور عہدہ داران سلطنت نے بھی جو بدلتے ہوئے حالات کو بغور دیکھ رہے تھے، اس کی تقلید کی اور فوراً اپنی اپنی

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۳۷۵ - ۲۶ سنہ جلوس۔ اس وقت شہباز بنگال میں فوجی خدمات انجام دے کر واپس آیا تھا۔

فوجوں اور اطاعت گزاروں کے ساتھ شہزادۂ سلیم کی خدمت میں حاضر ہو کر خراج اطاعت پیش کیا اور جب اس طرح صورت حال بدل چکی تو مخالفین کی سازشوں کو بے اثر بنانے کے لئے میر بخشی نے دوسرا قدم اٹھایا ۔ اس نے حسب معمول محافظ دستوں کی فہرست جاری کی اور تمام سرداروں کو بہ یک وقت محل میں طلب کر لیا ۔

یہ وار شہزادۂ سلیم کے مخالفین پر اچانک کیا گیا اور اس امر کے باوجود کہ ان کے حامیوں کی تعداد بہت کافی تھی ، انھیں حکم عدولی کی مجال نہ ہوئی ۔ اس انتظام کے بعد شہزادۂ سلیم اکبر کی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا ۔ اکبر نے بھی اسی وقت محض اتفاق سے تھوڑی دیر کے لئے آنکھ کھولی ، شہزادۂ سلیم کو دیکھ کر خوش ہوا ، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور پھر اسے اپنی تلوار خاص عنایت فرمائی ۔ اس طرح ، یہ محض میر بخشی کا جرأت مندانہ اقدام تھا اور حفاظتی دستوں کی نامزدگی اور منصب داروں کی طلبی کے متعلق اپنے اختیار کا دانشمندانہ استعمال ، جس کی بدولت دارالحکومت کا امن بر قرار رہا اور شہزادۂ سلیم کو کسی قسم کی خونریزی کے بغیر تخت نشینی کا موقع مل گیا ۔[1]

---

۱ - زبدۃ التواریخ ۔ م ۔ ت ۱۰۰۵۸۰ ، ورق ۲۴۸ - ماثرالامراء ۔ صفحہ ۶۳۶ میر بخشی کے اس فریضۂ منصبی سے متعلق اروِن (Irvin) نے اپنی کتاب The Army of the Indian Mughals میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میر عرض جس کا ذکر آئین میں صفحہ ۱۵۷ اور ۲۰۹ (بلاک مین) پر درج ہے غالباً میر بخشی ہی کے بجائے استعمال کیا گیا ہے اور لفظ میر بخشی کا استعمال بعد میں شروع ہوا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے دیوان عرض اور سلاطین دھلی کے عارض کی اصطلاحات سے دھوکا ہوا ۔ اکبر کے میر عرض کے فرائض نہ عارض سے ملتے ہیں نہ میر بخشی کے

صوبوں سے آئے ہوئے خبر نامے

وہ خبر نامے بھی میر بخشی ھی کے پاس آتے تھے جو مختلف صوبوں سے واقعہ نویس بھیجا کرتے تھے اور میر بخشی ھی انھیں بادشاہ

بقیہ حاشیہ ما قبل

فرائض کے مترادف ھیں - یہ ایک بالکل دوسرا عہدہ تھا اور ایک مختلف مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا - ۲۰ سنہ جلوس میں جب کشک یا چوکیوں کے نظام کی ابتدا کی گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ دارالحکومت میں رھنے والا ھر سرکاری ملازم ھفتے میں ایک بار، شاھی محل پر پہرہ دے، تو اس خدمت پر مامور امراء میں سے ایک امیر کے ذمے یہ کام بھی ھوتا تھا کہ وہ رعایا کی عرضداشتیں بادشاہ کے سامنے پیش کیا کرے "ایک فاضل امیر کو میر عرض بنایا جاتا تھا تا کہ اس اثناء میں جبکہ وہ چوکی پہرے کی خدمت پر مامور ھو، اپنے ذاتی معاملات کے علاوہ عام لوگوں کے معروضات کی وکالت بادشاہ کے حضور میں کیا کرے تا کہ عامۃالناس انتظار کی تکلیف اور دوسری زحمتوں سے محفوظ رھیں" اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۱۴۶ - ترجمہ، صفحہ ۲۰۷) -

یہ خدمت اس خدمت سے مختلف تھی جس کا تعلق محافظین کے انتظام و نگرانی سے تھا اور جو ایک دوسرے امیر کے ذمے رھتی تھی جو میر کشک کہلاتا تھا -

یہ ھے وہ موضوع جس کے سلسلے میں میر عرض کا ذکر آئین کے ان صفحات میں کیا گیا ھے جس کا حوالہ مسٹر اروِن نے دیا ھے (صفحہ ۲۵۷ پر کشک کا ذکر ھے اور صفحہ ۲۵۹ پر فرامین کے اس مسودے کا جس میں واقعہ نویس کے روز نامچے پر میر عرض بھی تصدیقی دستخط کرتا تھا) -

لیکن جس جملے کا حوالہ مسٹر اروِن نے دیا ھے اس کے بعد آنے والے جملے کی عبارت یہ ھے: "جملہ فرامین شاھی انھیں دونوں عہدہ داروں (یعنی میر عرض اور میر کشک) کے ذریعے اشاعت پزیر ھوتے ھیں وہ رات دن محل میں موجود رھتے ھیں تا کہ بادشاہ کے ھر حکم کی فوراً تعمیل ھو سکے" - یقیناً یہ میر عرض وہ میر بخشی نہیں ھو سکتا جس کا کام کسی دوسری جگہ موجود رھنا اور اپنے دفتر سے متعلقہ امور انجام دینا بھی تھا -

کے سامنے پیش کیا کرتا تھا - جب ان خبر ناموں کو پڑھ کر سنانے کا کام آصف جاہ ، شاہ جہاں کے وکیل سلطنت کے ذمے تھا

بقیہ حاشیہ ما قبل

معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ انتظام کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا اور ۲۲ سنہ جلوس میں عرضیاں پیش کرنے کی خدمت محب علی خاں کے سپرد کی گئی "جو راست باز اور تجربہ کار تھا" اور ابوالفضل کے الفاظ میں "اسے اجازت دی گئی کہ وہ عوام کی عرضداشتوں کی وکالت کیا کرے اور یہ بھی بتایا کرے کہ اس کی رائے میں کیا کارروائی مناسب ہے" اور یہ اس لیے ضروری سمجھا گیا تھا کہ عقل اس امر کی متقاضی ہے کہ شاہان عادل اور دیگر عظیم ہستیاں ، جن کی مصروفیات بے شمار ہوتی ہیں ، محض اپنی زیرکی و دانائی سے مطمئن نہ ہو جایا کریں بلکہ اس کی بھی اجازت دیا کریں کہ کوئی دوسرا شخص جو ذی عقل جہاندیدہ ، اور بے ضرر ہو اپنی معروضات ان کے سامنے پیش کر سکے تاکہ ایسے وقت جب کہ کام کی زیادتی ہو یا جب غصہ غالب ہو جس کے باعث عقلمندوں کے پاؤں بھی ڈگمگا جاتے ہیں ، وہ انھیں مناسب مشورہ دے سکے" (صفحہ ۲۱٦ - ترجمہ ، ۳۰۴) -

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کام جب کسی شخص کو دیا جاتا تھا تو اس کا کوئی تعلق اس کی محلاتی خدمت سے نہ ہوتا تھا - لیکن محب علی خاں زیادہ عرصے تک دارالحکومت میں نہ رہ سکا - وہ دہلی کا حاکم مقرر کر دیا گیا اور پھر اسی پرانے طریقے کے مطابق کام ہونے لگا - ۲۵ سنہ جلوس میں جب کام بہت بڑھ گیا تھا اس کے لیے ایک علحدہ دفتر قائم کر دیا گیا - بعد ازاں یہ کام نہ کسی ایسے امیر کے ذمے رہا جو محل کی خدمت پر مامور ہو نہ دربار کے متعلق کوئی دوسرا امیر اس پر مامور کیا گیا بلکہ یہ ایک ایسے عہدہ دار کے سپرد کیا جاتا تھا جس کے ذمے کوئی دوسری خدمت نہ ہوتی تھی - مرزا خاں (عبدالرحیم خان خاناں) اس عہدے پر سب سے پہلے مقرر کیا گیا - وہ اسباب جن کے بناء پر یہ تبدیلی عمل میں آئی بالصراحت کتابوں میں مذکور ہیں "داد خواہوں کی کثرت اور کام کی زیادتی تھی ، حرص و طمع (آز مندی) کا بازارگرم تھا اور عالی شان دربار کی شان و شوکت کے پیش نظر اعلیٰ حضرت کو یہ خیال گزرا کہ اس عہدۂ جلیلہ پر کسی ایسے ممتاز ، عالی نسب ، اور لائق و فائق شخص کا تقرر ہونا چاہیے جو دقت نظر ، بے لوثی اور ایمانداری میں بلند پایہ ہو -

تو میر بخشی اس کے پاس یہ خبر نامے لے جاتا تھا ، خود بھی دیوان میں وکیل کے ساتھ بیٹھتا اور ایسے صوبائی معاملات ان کے سامنے پیش کرتا تھا جن کا فیصلہ کرنے کے وکیل کو خاص اختیارات حاصل تھے ۔[1]

بقیہ حاشیہ ما قبل
خاص و عام کے ساتھ صلح پسندی اس کا امتیازی وصف ہو ۔ جس کے باعث وہ یگانہ و بیگانہ اور دوست و دشمن میں کوئی فرق روا نہ رکھے بلکہ بادشاہ کے حضور میں تمام مناسب عرضیاں پیش کر کے مناسب اوقات میں ان کے جوابات حاصل کر سکے ۔ بد قسمتی سے ۔۔۔۔۔ اگر اسے پسندیدہ جواب نہ ملے تو افسوس نہ کرے بلکہ دوبارہ کسی وقت درخواست کرنے کی جرات رکھتا ہو ۔۔۔۔۔۔ اس عقلمند بادشاہ کی نظروں نے اس وفادار میں مذکورہ اوصاف حمیدہ کے آثار دیکھ لیے اور اس اعلیٰ عہدے پر مامور کر کے اسے سر فرازی بخشی" ۔ (صفحہ ۲۹۷ ۔ ترجمہ ، صفحہ ۴۳۹) ۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ میر عرض کا عہدہ میر بخشی کے عہدے سے مختلف تھا ۔ نہ محب علی ، جس کا نام اول الذکر مثال میں آیا ہے ، میر بخشی تھا ۔ نہ مرزا خاں جس کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے میر بخشی تھا۔ مسٹر بلاک مین نے مسٹر ارون کی رائے کو صحیح مانا ہے اور اسے اپنی کتاب کے حاشیے میں صفحہ ۲۵۹ پر درج کیا ہے اسی سلسلے میں مسٹر بیورج نے بھی اپنے ترجمے میں (صفحہ ۴۳۹) بلاک مین کا حوالہ دیا ہے ۔

تاہم یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اکبر نامے میں میر عرض کے عہدے کا بہت کم ذکر ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ میر بخشی کا عہدہ اس کی جگہ قائم کیا گیا ہو ۔ میر بخشی کا عہدہ اول الذکر عہدے سے بہت پہلے قائم تھا اور جہاں تک فرائض کا تعلق ہے دونوں عہدے ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے ۔

۱ ۔ اس کا مفصل بیان باب ۴ میں ہو چکا ہے ۔

اس طرح صوبوں کے ساتھ میر بخشی کا تعلق قائم رکھا گیا اور اس فرض کی وجہ سے دارالحکومت میں اس کا اثر اور زیادہ ہو گیا ۔[1]

میر بخشی بادشاہ کے ساتھ دوروں پر

حالانکہ بادشاہ کے دوروں اور بادشاہ کے ساتھ دوروں پر جانے والے عملے کے انتظام کی ذمہ داری میر ساماں کی تھی جو کارخانہ جات کا صدر ہوتا تھا لیکن میر بخشی کا عمل دخل وہاں بھی تھا ۔ محکمۂ فوج ، کے صدر کی حیثیت سے ، نیز بادشاہ اور منصب داروں کے درمیان رابطے کا خاص ذریعہ ہونے کے باعث وہ دوروں اور سیر و شکار میں ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا ۔[2]

دوروں میں وہ شاہی خیمہ و خرگاہ کا انتظام کرتا تھا اور منصب داروں کے لئے ان کے درجات کے مطابق نشستیں متعین کرتا تھا ۔[3]

وہ منصب دار اور حکام جو دوروں میں بادشاہ کے همراہ ہوتے ، اسی کی معرفت دربار میں حاضر ہونے کی اجازت حاصل کرتے تھے ۔

---

۱ ۔ دیوان اعلیٰ کا تعلق ان احکام سے تھا جو ان رپورٹوں کی بناء پر صادر کیے جاتے تھے ۔

۲ ۔ برنیر لکھتا ہے کہ اس عہدے کی ذمہ داریاں ایسی تھیں جن کی وجہ سے "وہ شخص جو اس پر فائز ہوتا تھا دربار شاہی میں حاضر رہنے پر مجبور تھا ۔ اس کے لیے بادشاہ سے دور رہنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا" ۔ (صفحہ ۱۷۱) ۔

۳ ۔ آئین ۔ صفحہ ۴۳ ۔ اکبر کے عہد میں یہ بات مستقل طور پر طے کر دی گئی تھی کہ فوجی پڑاؤ کا قرینہ کیا ہونا چاہیے ۔ صرف پڑاؤ کا مقام طے کیا جاتا تھا ۔

ایسے منصب داروں کی فہرست جو دربار شاہی میں باریاب ہونے کے لائق سمجھے جاتے، ہر ماہ تبدیل کی جاتی تھی۔[۱]

دارالحکومت کی طرح دوروں میں بھی وہ اپنی سرکاری حیثیت سے کام کرتا تھا۔ وہ ہر اس کارروائی کو جو اس سے وابستہ ہوتی بذات خود انجام دیتا تھا۔ فوجوں کی آسائش کی ذمہ داری اسی کی تھی۔ مثلاً ان کی آمد و رفت وغیرہ کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔[۲]

میر بخشی میدان جنگ میں

میر بخشی یا اس کا کوئی رفیق کار میدان جنگ میں تین مختلف حیثیتوں سے کام کرتے تھے۔

اول۔ اگر فوج کی قیادت خود شہنشاہ کرتا، جیسا کہ عموماً اکبر کیا کرتا تھا، یا اگر انتظامات کی نگرانی کرنے اور عہدہ داروں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے اور ان کی کارکردگی کو موثر بنانے کی خاطر شہنشاہ فوج کے ساتھ رہتا جیسا کہ شاہ جہاں بالعموم ہر اہم موقع پر رہا کرتا تھا تو میر بخشی صرف اپنے وہی معمولی فرائضِ انجام دیتا جو وہ دوروں میں انجام دیا کرتا تھا۔

دوم۔ کبھی فوج کے کسی خاص دستے کی ذمہ داری اس کے سپرد کر دی جاتی تو اس صورت میں وہ ایک فوجی جنرل یا سپہ سالار کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

۱۔ آئین صفحہ ۴۳۔ بلاک مین صفحہ ۴۳۔

۲۔ مانسریٹ۔ صفحات ۷۵۔۸۲۔ اس نے وہ انتظامات بیان کیے ہیں جو اس نے اکبر کے دورۂ کابل کے سلسلے میں خود دیکھے تھے۔ وہ فوجی انتظامات، سامان جنگ لے جانے، پلوں کے ذریعے دریاؤں کو عبور کرنے، رسد بہم پہنچانے اور متعدد دیگر امور کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔

سوم - کبھی اسے کسی ایسی فوج کے ساتھ بھیج دیا جاتا جس کی کمان براہ راست کسی شہزادے یا اعلیٰ منصب رکھنے والے کسی امیر کے سپرد ہوتی تھی - مگر اس صورت میں میر بخشی صرف اس وقت بھیجا جاتا جب کہ بہت ذمہ دارانہ نوعیت کی مہم در پیش ہوتی ، یا کسی فوری ضرورت کی بناء پر فوج کے ساتھ میر بخشی کی موجودگی ضروری ہوتی - ۲۵ سنہ جلوس اکبری میں ، شہباز خاں کو ، راجہ ٹوڈر مل اور مرزا عزیز کوکہ کے ساتھ بہار بھیجا گیا تھا - جہانگیر کے زمانے میں خواجہ ابوالحسن کو اس وقت دکن بھیجا گیا جبکہ عبدالرحیم خان خاناں ، امیرالامرا شریف اور آصف خاں قزوینی باہمی جھگڑوں میں منہمک تھے - شاہ جہاں کے عہد میں صلابت خاں کو امیرالامرا علی مردان خاں کے ساتھ منسلک کیا گیا اور بعد ازاں بلخ کی مہم کے سلسلے میں اسے شہزادہ مراد کے ساتھ بمقام کابل رکھا گیا -

مذکورۂ بالا تمام صورتوں میں ، میدان جنگ کا نقشہ مرتب کرنے کے سلسلے میں میر بخشی کا حصہ نہایت اہم ہوتا تھا - اکبر بالعموم ایسی مہموں کی نگرانی خود کیا کرتا تھا ، یا اسے قطعاً اپنے ایسے عہدہ داروں کے ذمے چھوڑ دیتا تھا جیسے بنگال میں منعم خاں اور گجرات میں ، مرزا خاں (عبدالرحیم خان خاناں) تھے - ان صورتوں میں بخشیوں کی نگرانی یا ان کا اثر محض برائے نام ہوتا تھا - جہانگیر فوج کی قیادت سپہ سالاروں[1] کی مرضی پر

---

۱ - وہ مہم جو رانا کے خلاف تھی البتہ اس سے مستثنیٰ ہے - اس کی نگرانی وہ خود اجمیر سے کرتا تھا -

چھوڑ دیتا تھا اور اس بات کا کہیں تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے میدان جنگ میں مصروف فوجوں کو کوئی قطعی ہدایات جاری کی ہوں - یہی وجہ ہے کہ اس کے سپہ سالار اکثر بلند مرتبہ ذمہ دار امراء ہوتے تھے - مثلاً خان خاناں، فرزند خان جہاں، امیرالامرا شریف وکیل، آصف خاں وزیر اور بعد ازاں شہزادہ خرم دکن میں - خان اعظم اور شہزادہ خرم رانا کے خلاف بمقام اجمیر مصروف جنگ رہے اور مہابت خاں کو کابل میں رکھا گیا تا کہ وہ قندھار کی صورت حال پر نظر رکھے -

شاہ جہاں کے زمانے میں بالعموم فوجوں کی روانگی سے قبل جنگ کے نقشے مرتب کر لیے جاتے تھے - سپہ سالاروں کو قطعی ہدایات دے دی جاتی تھیں اور وہ ہمیشہ بادشاہ سے ہدایات حاصل کرتے رہتے تھے کیونکہ اس کا ذاتی تجربہ اس کے متعدد سپہ سالاروں کے تجربے سے کہیں زیادہ تھا -

فوج کے ہر شعبے کا الگ الگ بخشی ہوتا تھا اور اکثر اسے واقعہ نویس کا فرض بھی انجام دینا پڑتا تھا - بادشاہ اور مرکزی حکومت کے پاس بلا ناغہ اطلاعات بھیجی جاتی تھیں - اس طرح بیشتر ایسا کام جو فوجی مہمات میں بخشی کو خود انجام دینا پڑتا پہلے ہی بادشاہ کی موجودگی میں انجام پا جاتا تھا -[1]

---

۱ - اس سلسلے میں شاہ جہاں کی پالیسی کی نمایاں ترین مثال ہمیں ان التظامات کی صورت میں نظر آتی ہے جو ۱۵ سنہ جلوس اور ۱۸ سنہ جلوس میں قندھار اور بلخ کی مہمات کے سلسلے میں کیے گئے تھے -

مہمات میں مصروف فوج کے بخشی کا خاص کام قرضے تقسیم کرنا، پیشگی رقم دینا اور میدان جنگ میں تنخواہیں ادا کرنا تھا۔[1]

۱۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ فوجوں اور جنگی مہموں سے متعلق بخشیوں کے مختلف فرائض کیا ہوتے تھے :—

تزک۔ صفحہ ۵۰، عبدالرزاق کو جو ایک بخشی تھا، موھن داس کی معرفت دو لاکھ روپیہ بھیجا گیا تا کہ وہ اسے اس فوج میں تقسیم کرے جو کابل میں مقیم تھی۔

لاھوری، جلد دوم، صفحہ ۵۵۵، اصالت خاں میر بخشی، شاہ جہاں کے پاس بمقام کابل (۲۰ سنہ جلوس میں) ۵۰۰۰۰۰ روپیہ بھیجا گیا۔

تزک۔ صفحہ ۹۴۔ بخشیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسا انتظام کریں کہ فوجی دستے باقاعدہ یکے بعد دیگرے اٹک کے مقام پر دریا کو عبور کریں۔

تزک۔ صفحہ ۲۴۶۔ میر بخشی ابوالحسن، نے دریائے ماھی پر، احمد نگر سے بادشاہ کے آگرہ چلے جانے کے بعد، تین دن کے اندر ۱۴۰ گز لمبا اور ۴۰ گز چوڑا پل تعمیر کرا دیا جس پر اس کی بے انتہا تعریف کی گئی۔

تزک، صفحہ، ۲۹۱۔ خواجہ ابوالحسن اور صادق، بخشیوں کے ذمے، بادشاہ کی کشمیر سے واپسی پر، فوج کا یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے آگے بڑھنے کا انتظام کریں۔

اکبر نامہ، جلد سوم صفحہ ۵۷۳، ۴۳ سنہ جلوس، بخشیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کر کے "چوکی" کے حکم کے مطابق دریا عبور کرنے کا انتظام کریں۔

سب سے آخر میں یہ ہے کہ میر بخشی اور اس کے رفقائے کار خود میدان جنگ میں کام کرتے اور دوسرے عہدہ داروں کی طرح باقاعدہ غنیم کی سپاہ کے ساتھ جنگ کرتے تھے۔[1]

---

۱ - عہد اکبری میں ، لشکر خاں کے ہاتھ میں اس فوج کی کمان تھی جو ۹ سنہ جلوس میں علی قلی خاں کے خلاف مصروف پیکار تھی (اکبر نامہ ، جلد دوم ، ترجمہ ، صفحات ۳۸۹ - ۳۹۰) اسے اس بات کا بھی اختیار دے دیا گیا تھا کہ اگر غنیم اطاعت قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کرے تو وہ اسے منظور کر سکتا ہے - ۱۸ سنہ جلوس میں خواجہ غیاث الدین علی قزوینی کو گجرات میں نمایاں خدمات انجام دینے پر آصف خاں کا خطاب دیا گیا اور اسی سال لشکر خاں ، رانا پرتاب والئی اودے پور کے خلاف سہم پر مامور کیا گیا (اکبر نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۶۴) اور چند روز بعد منعم خاں کے ساتھ کام کرنے کے لیے بنگال بھیجا گیا - (صفحہ ۷۳) اس نے جنگ میں حصہ لیا (صفحہ ۱۰۴) اڑیسہ میں قلب لشکر کی کمان اس کے سپرد تھی (صفحہ ۱۲۳) میدان کارزار میں زخمی ہوا اور زخموں کی تاب نہ لا کر انتقال کر گیا (صفحہ ۱۲۷) -

اس کے جانشین شہباز خاں نے جودھپور کی سہم میں حصہ لیا - ۲۱ سنہ جلوس (صفحہ ۱۶۷) اور بہار میں اس کے بعد بنگال میں کام کیا - دوسرا بخشی آصف خاں ، رانا کے خلاف ایدر کی سہم میں پیش رو محافظ دستے کا نگراں تھا (صفحہ ۱۷۴) - ۴۵ سنہ جلوس میں میر بخشی شیخ فرید اسیر گڑھ کے خلاف سہم میں شریک تھا (صفحہ ۷۹۸) -

شاہ جہاں کے زمانے میں ، جسونت رائے اور مرحمت خاں دونوں بخشی عبداللہ خاں لودھی کے خلاف جنگ میں شریک تھے جس میں مرحمت زخمی ہوا (یکم سنہ جلوس - لاہوری ، صفحہ ۲۷۸) - اسی عبداللہ کے خلاف معتمد خاں نے بھی لڑائی میں حصہ لیا تھا - (صفحہ ۳۱۱) میر بخشی صادق خاں نے دکن میں کام کیا (صفحہ ۳۲۳) اصالت خاں بخشی ، راجہ جگت سنگھ کے خلاف سہم پر مامور ہوا اور خود اس کے ہاتھ میں فوج کے ایک دستے کی کمان تھی (۱۴ سنہ جلوس ، صفحہ ۲۴۰) - میر اصغر علی ، بخشی فوج اور خسرو بیگ جو آصف خاں کی فوجوں کا بخشی تھا ، میدان جنگ میں لڑتے ہوئے کام آئے (۱۰ سنہ جلوس صفحہ ۲۵۰

بخشیاں دفتر میں

میر بخشی اور اس کے رفقائے کار مذکورۂ بالا خدمات کے علاوہ دیگر غیر فوجی عہدہ داروں کی طرح باقاعدہ دفتر کا کام بھی کرتے تھے۔ وہ جس نوعیت کا کام کرتے تھے اس سے نہ صرف مرکزی حکومت میں، بلکہ سلطنت کے پورے نظام خدمت میں اس محکمے کی موثر نگرانی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ میر بخشی مندرجۂ ذیل امور کے سلسلے میں اپنی مہر اور اپنے دستخط سے صداقت نامے (دستک) جاری کیا کرتا تھا:-

صداقت ناموں کا اجراء

(۱) شہزادوں اور دوسرے افراد کو جن کا تعلق شاہی خاندان سے رہتا تھا نیز عالی منصب امراء اور عہدہ داروں کو عطائے منصب کے احکام اور ان کے مشاہروں میں ترقیوں کی منظوریاں۔

(۲) گھوڑوں کو داغنا۔[1]

(۳) محافظین کے لئے مقام اور وقت خدمت کا تعین۔

(۴) بطور محافظ خدمات انجام دینے کی اجازت کی منسوخی۔

(۵) فوجوں کی فراہمی یا اجتماع۔

بقیہ حاشیہ ما قبل

اور ۱۷ سنہ جلوس صفحہ ۲۷۵) میر بخشی اصالت خاں اور خلیل اللہ خاں بخشی دوم نے بلخ کی مہم میں بہت نمایاں حصہ لیا اوراپنی ممتاز جنگی خدمات کی وجہ سے ۱۹ سنہ جلوس اور ۲۰ سنہ جلوس میں بڑی شہرت حاصل کی (صفحات ۴۹۱ - ۵۲۰) انھیں خدمات کے صلے میں ان کا درجہ بلند کیا گیا۔ (صفحات ۵۵۴ - ۵۵۵)۔

۱- نمبر - ۲ - ۵ - اور ۶ - اس امر کا صداقت نامہ کہ گھوڑوں پر نشان لگا دیے گئے ہیں اور سواروں کا معائنہ ہو چکا ہے۔

(۶) امراء اور منصب داران عالی مرتبت کے انتقال یا برطرفی پر ان کے فوجی دستوں کا معائنہ اور ان کے گھوڑوں کے نشانات کی جانچ ۔[۱]

(۷) منصب داروں کے تقرر کے احکام ۔

(۸) صوبوں کے بخشیوں اور واقعہ نویسوں کا تقرر ۔

(۹) محافظ دستے کے محرر ، امین اور داروغے کا تقرر ۔

(۱۰) شاہی خدمت میں حاضر رہنے والے سواروں کی جانچ کرنے اور ان کے گھوڑوں پر نشان لگانے کے لیے داروغہ ، امین ، اور مشرف کا تقرر اور مختلف صوبوں اور فوجوں میں ان کو کام سپرد کرنا ۔

دیگر کاغذات

میر بخشی کے دیگر فرائض حسب ذیل تھے :—

(۱) امرائے عالی منصب سے متعلق احکام کی یادداشتیں اسی کی معرفت گزرتی تھیں ۔

(۲) فوجوں کی تقسیم مختلف شعبوں میں اسی کے دفتر میں کی جاتی تھی ۔

(۳) بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہنے کے لیے امراء کی فہرست وہی مرتب کرتا تھا ۔

(۴) دربار میں جتنے تقرر اس کی موجودگی میں ہوتے تھے ، ان کی تصدیق وہی کرتا تھا ۔ اسی کے دفتر میں

---

۱ ۔ یہ اس لیے ضروری تھا تا کہ جتنے سوار اس وقت واقعی ان کی خدمت پر مامور ہوں ان کی تنخواہوں کا حساب بیباق کیا جا سکے ۔

یادداشت پر نظر ثانی ہوتی اور اس پر مہر لگائی جاتی تھی -

(٥) صوبوں کے واقعہ نویسوں اور بخشیوں نیز محافظ دستوں کے عملے کے بھیجے ہوئے کاغذات وہی وصول کرتا اور ان سے متعلقہ کارروائی وہ خود براہ راست انجام دیتا تھا -

میر بخشی حسب ذیل کاغذات اپنے دفتر میں محفوظ رکھتا تھا :-

کاغذات جو اس کے دفتر میں محفوظ رہتے تھے

(۱) فہرست منصب داران متعینہ دارالحکومت و صوبجات -

(۲) منصب داروں کے ذمے واجب‌الادا رقوم کا حساب -

(۳) تنخواہوں کی بر آورد کے گوشوارے -

(۴) دستورالعمل جس کا اطلاق نقد تنخواہوں اور جاگیروں نیز جاگیروں کے نقد تنخواہوں میں تبدیل کیے جانے پر ہوتا تھا -

(٥) فہرست جس میں منصب داروں کے درجے ان کی تنخواہیں اور تنخواہ وصول کرنے کے طریقے درج ہوتے تھے -

(٦) کاغذات جن میں منصب داروں اور سواروں کا حلیہ (چہرہ) درج ہوتا تھا -

(۷) گھوڑوں پر نشان لگانے اور ان کی جانچ پرتال سے متعلق کاغذات۔

(۸) صوبوں اور مختلف فوجوں میں منصب داروں کی حاضری کے کاغذات۔

(۹) محل میں محافظین کی حاضری کے کاغذات۔

(۱۰) فوجوں کی فہرستیں اور دشمن کے مقابلے میں ان کی ترتیب۔

میر بخشی اور بخشی دوم کے مشترک فرائض

بڑے بڑے امراء سے متعلق احکام کی اطلاعات میر بخشی کی منظوری کے بعد، بخشی دوم کے دفتر سے بھی گزرا کرتی تھیں۔ اسی طرح وہ (بخشی دوم) صداقت نامے نمبر ۹ و ۱۰[1] منصب داروں کے درجوں اور تنخواہوں سے متعلق کاغذات (نمبر ٥) اور وہ کاغذات بھی اپنے دفتر میں وصول کرتا تھا جن کا تعلق گھوڑوں پر نشان لگانے، (سواروں کی) جانچ پرتال اور صوبوں میں، فوجوں میں اور حفاظتی فرائض انجام دینے کے سلسلے میں منصب داروں کی حاضری سے ہوتا تھا۔ (نمبر ۷، ۸ اور ۹)۔

نئے تقررات کے احکام جو میر بخشی کی موجودگی میں جاری ہوتے تھے، ''عرض مکرر'' کے بعد بخشی دوم کے دفتر میں ارسال کئے جاتے اور داغ کے بعد وہاں ان کا اندراج ہوتا تھا۔

میر بخشی کی غیر موجودگی میں بخشی دوم ان منصب داروں کی فہرست تیار کرتا تھا جو روزانہ دربار شاہی میں حاضر رہتے تھے۔

---

۱ - صفحہ ۳۳٥ پر مذکور ہے۔

لیکن اس کی غیر موجودگی میں جتنے احکام جاری ہوتے تھے ، اس کے سامنے اس کے دفتر میں پیش کیے جاتے تھے ۔[1]

جہاں تک منصب داروں کی تنخواہوں کے حساب کا تعلق تھا میر بخشی اپنے دفتر میں وہ تمام کاغذات رکھتا تھا جن پر اس کی مہر ثبت ہوتی اور اس کے دستخط ہوتے تھے ۔ لیکن تنخواہ پر اثر انداز ہونے والی رخصت اور غیر حاضری سے متعلق کاغذات بخشی دوم کے دفتر میں رکھے جاتے تھے ۔

فوجی محاسب (صاحب توجیہ) آمد ، خرچ ، کا حساب ، مد وار رکھتا تھا ۔ لیکن میزان برأت نویس لگاتا اور وہی اس کا اندراج بھی کرتا تھا ۔[2]

بخشی سوم

بخشی سوم کے فرائض کی نوعیت بھی وہی تھی جو پہلے دو بخشیوں کے فرائض کی تھی ان کے درجوں کا فرق صرف اس طرح برقرار رہتا تھا کہ وہ مختلف درجوں کے منصب داروں کا کام کرتے تھے ۔ میر بخشی کے ذمے شہزادوں اور دوسرے بڑے بڑے منصب داروں سے متعلق کام تھا ۔ بخشی دوم کے ذمے ان سے کم درجے کے منصب داروں سے متعلق کام تھا اور بخشی سوم کے ذمے منصب داروں سے متعلق کوئی کام نہ ہوتا تھا ۔ وہ صرف یومیہ داروں[3] کے تقرر ، ان کی تعیناتی اور ان کی تنخواہوں میں ترقی سے متعلق امور انجام دیتا تھا ۔

---

۱ ۔ ت ۶۵۹۹ ۔ ورق ۱۰۹ اور ا ۱۶۴۱ ، اوراق ۱۷ و ۱۸ الف ۔

۲ ۔ ت ۶۵۹۹ ۔ ورق ۳۸ ۔

۳ ۔ لغوی معنی ہیں یومیہ بھتہ پانے والے ، اصطلاحاً وہ عہدہ داران و ملازمین جنھیں کسی منصب کے بغیر نقد تنخواہیں یا بھتے دیے جاتے تھے ۔ دیوان اعلیٰ ، سعداللہ خاں نے بھی اسی درجے سے ابتدا کی تھی ۔

تعداد بخشیاں

آئین میں کوئی خاص تعداد مذکور نہیں ہے لیکن مختلف مواقع پر لفظ بخشیاں کے استعمال سے پتا چلتا ہے کہ ایک سے زیادہ بخشی ہوتے تھے - اکبر نامے مین لفظ میر بخشی کا استعمال بتاتا ہے کہ ان کے درجوں میں فرق تھا - تاہم اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی تعداد کیا ہوتی تھی - اکبر کے زمانے کے تمام کاغذات میں الفاظ میر بخشی، بخشی یا بخشیاں استعمال کیے گئے ہیں - اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ایک میر بخشی ہوتا تھا اور اس کے علاوہ ایک بخشی اور ہوتا تھا - لیکن اسے بخشی دوم نہیں کہتے تھے جیسا کہ اسے زمانۂ ما بعد کے حکمرانوں کے دور میں کہنے لگے -

احدیوں کا بخشی علحٰدہ ہوتا تھا - اس کا عہدہ مذکورۂ بالا دونوں عہدوں سے مختلف تھا -

جہانگیر کے زمانے میں جو تقرر یکم سنہ جلوس میں کیے گئے ان سے پتا چلتا ہے کہ احدیوں کے بخشی کے علاوہ اس کے تین بخشی تھے - چند روز بعد ایک بخشی، بخشی حضور (یعنی حضور شاہی میں موجود رہنے والا بخشی) کے نام سے مقرر کیا گیا - یہ عہدہ جو دوسرے تینوں عہدوں سے علحٰدہ رکھا گیا، اس پر عبدالرزاق معموری مامور ہوا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ خواجہ ابوالحسن بخشی کے مشورے سے کام کرے - جہانگیر کے زمانے میں جتنے بخشی بہ یک وقت مختلف فرائض کی انجام دہی پر مامور تھے ان کے نام محض حسن اتفاق سے ایک جگہ مل گئے - اس طرح جب نئے

تقررات ہو چکے تو بخشیوں کے عہدوں کی ترتیب حسب ذیل تھی :—

(۱) شیخ فرید — میر بخشی

(۲) خواجہ فتح اللہ
(۳) خواجہ ابوالحسن — بخشیان

(۴) عبدالرزاق معموری ۔ بخشی حضور (خواجہ ابوالحسن کی شرکت میں فرائض منصبی انجام دینے کے لیے)

(۵) بہاری داس ۔ بخشی احدیاں ۔

(۶) زماں بیگ ۔[1] (بعد میں مہابت خاں کا خطاب عطا ہوا ۔) بخشی شاگرد پیشہ (محل شاہی کے اندر کام کرنے والے ملازمین)

معلوم ہوتا ہے کہ بخشی حضور کا عہدہ جہانگیر کے زمانے میں بھی برقرار رہا اور ۹ سنہ جلوس میں ایک تقرر کا ذکر اور ملتا ہے حالانکہ نام مختلف ہے لیکن عہدہ وہی ہے ۔ ابراہیم خاں ، خواجہ ابوالحسن کی شرکت میں کام کرنے کے لئے بخشی گری ٔ دری خانہ کے اعلیٰ عہدے پر مامور ہوا ،[2] اس عہدے کا وہی درجہ تھا جو دیگر معاون بخشیوں کا تھا ۔ مذکورۂ بالا موقع پر ابراہیم خاں کو ۱۵۰۰ ذات اور ۶۰۰ سوار کا منصب عطا ہوا تھا ۔

---

۱ - تزک ـ ۲ سنہ جلوس ـ نمبر (۱) و (۲) (صفحہ ۶)- نمبر ۳ و ۴ (صفحہ ۳۹) نمبر ۵ (صفحہ ۴۹) ـ نمبر ۶ (صفحہ ۱۰) ـ

۲ - تزک صفحہ ۱۲۷

اسی طرح بخشی شاگرد پیشہ کا عہدہ بھی برقرار رہا اور زماں بیگ کو ۱،۵۰۰ ذات کا منصب دیا گیا۔

بعد کے زمانے میں بخشی حضور کا ذکر ایک علحدہ عہدہ دار کی حیثیت سے نہیں ملتا اور میرا خیال یہ ہے کہ عہدۂ مذکور بخشی سوم کے عہدے کے ساتھ مدغم کر دیا گیا۔ بخشی احدیاں کا عہدہ پرانا تھا اور وہ بعد کے فرمانرواؤں کے زمانے میں بھی بر قرار رہا۔ بخشی شاگرد پیشہ عہد شاہ جہانی میں بھی موجود تھا۔[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد حکومت تک بخشیوں کی تعداد تین تھی۔ وہ مرکزی حکومت کے ساتھ منسلک تھے اور سب متحدہ طور پر کام کرتے تھے۔ باقی دو بخشی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان سے الگ حیثیت رکھتے تھے اور چونکہ ان کا تعلق صرف ایک مخصوص طبقۂ ملازمین سے تھا، وہ مرکزی محکمے کے رکن نہیں سمجھے جاتے تھے۔[۲]

اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں مختلف بخشیوں کے لیے عہدے کے مختلف وضاحتی نام متعین نہیں ہوئے تھے۔ سب سے بڑے بخشی کو میر کہتے تھے اور باقی دو صرف بخشی کہلاتے تھے۔ بخشی اول بخشی دوم اور بخشی سوم کے وضاحتی الفاظ

---

۱ - لاہوری۔ صفحہ ۹۱۔ حاجی عاشور ۱۱ سنہ جلوس میں مقرر کیا گیا۔

۲ - ابوالفضل نے جو فہرست آئین کے صفحہ ۲۳۲ پر دی ہے اس میں اس نے تمام بخشیوں کو شامل کر لیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عہدۂ مذکور میں اس قسم کا کوئی امتیاز نہ تھا۔

عہد شاہ جہانی میں متعین ہوئے۔ باقی دو کے امتیازی نام برقرار رہے۔[1]

ممتاز میر بخشیوں کی فہرست

	نام	سنه جلوس	مدت
اکبر -	لشکر خاں شہباز خاں، کمبوہ آصف خاں، قزوینی شیخ فرید	میر بخشی کی حیثیت سے کسی کی مدت ملازمت کا تعین قطعی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔	
جہانگیر -	شیخ فرید (به سلسلۂ ملازمت ما سبق)	۱ تا ۲ سنه جلوس	ایک سال
	وزیر الملک	۲ تا ۷ سنه جلوس	۵ سال
	خواجه ابوالحسن	۸ تا ۱۶ سنه جلوس	۸ سال
	صادق خاں	۱۶ تا ۱۸ سنه جلوس	۲ سال
	ارادت خاں		
شاہ جہان -	ارادت خاں (چند روز سلسله جاری رہا)	۱۹ تا ۲۲ سنه جلوس	۳ سال

---

۱ - معتمد خاں، بخشی دوم طویل ترین زمانۂ خدمت کی بناء پر میر بخشی مقرر کیا گیا ' (لاهوری، ۱۰ سنه جلوس ' صفحه ۲۷۹) -

یہاں یه واضح کر دینا ضروری ہے که مذکورۂ بالا حکمرانوں کے دور حکومت میں بخشی تن نہیں ہوتا تھا - جیسا که مسٹر اروِن کا خیال ہے (ہندوستانی مغل حکمرانوں کی فوج صفحه ۳۹) - -مذکوره بالا توضیح سے وہ ابہام رفع ہو جائے گا جس میں مسٹر اروِن مبتلا تھے -

صادق خاں (دوسری بار۔ انتقال تک)	۱ تا ۶ سنہ جلوس	۵ سال
اسلام خاں	۶ تا ۸ سنہ جلوس	۲ سال
میر جملہ	۸ تا ۱۰ سنہ جلوس	۲ سال
معتمد خاں	۱۰ تا ۱۳ سنہ جلوس	۳ سال
صلابت خاں	۱۳ تا ۱۷ سنہ جلوس	۴ سال
اصالت خاں	۱۷ تا ۲۰ سنہ جلوس	۳ سال
جعفر خاں	۲۰ تا ۲۳ سنہ جلوس	۳ سال
خلیل اللہ خاں	۲۳ تا سنہ جلوس	

میر بخشی کے عہدے کی چند خصوصیات

ظاہر ہے کہ میر بخشی کو بلحاظ اختیارات درجہ و اثر وہی حیثیت حاصل تھی جو دیوان اعلیٰ کو حاصل تھی۔ دوسری مسلم سلطنتوں میں وزراء کے اختیارات تقسیم ہو جاتے تھے۔ اس طرح کہ وہ ایک دوسرے کے لئے احتساب کا کام کرتے تھے لیکن روزمرہ کا طریقۂ کار کچھ ایسا متعین تھا کہ ان میں سے کوئی کسی پر حاوی نہ ہو سکتا تھا۔

میر بخشی محکمہ فوج کا صدر اعلیٰ ہوتا تھا اور اس حیثیت میں وہی منصب داروں کا خاص نمائندہ یا وکیل ہوتا تھا، لیکن اس کی وجہ سے اسے فوج پر کسی قسم کا اثر و رسوخ حاصل نہیں رہتا تھا۔ وہ شاہی فوجوں کا نہ سپہ سالار اعظم ہوتا تھا نہ بلحاظ عہدہ اسے کسی مہم کی قیادت کا حق حاصل تھا۔ اس بات کا انحصار

قطعاً بادشاہ کی مرضی پر ہوتا تھا کہ وہ مہم کی نوعیت، ترکیب فوج اور منتخب کردہ سپہ سالاروں کے پیش نظر جو انتظامات مناسب سمجھے کرے۔ اکثر اوقات مہم پر جانے کے لیے علحدہ بخشی (جنھیں بخشی عسکر یا بخشی لشکر کہتے تھے) مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کا انتخاب نہ میر بخشی کرتا تھا نہ یہ ضروری تھا کہ انھیں میر بخشی کے محکمے سے لیا جائے۔ وہ صرف اس کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔

میدان کارزار میں فوج پر اس کا اثر اور بھی کم رہتا تھا کیونکہ خاص خاص مہمات میں خود بادشاہ یا عالی منصب امراء وہاں موجود رہتے تھے اور ہر مہم میں تمام سپہ سالاروں اور کمانداروں کے ساتھ بادشاہ خود براہ راست رابطہ رکھتا تھا۔ وہ خود تمام امور پر نیز فوجی نقل و حرکت پر نظر رکھتا اور مناسب ہدایات جاری کرتا تھا۔

میر بخشی عموماً ایک ایسا عہدہ دار سمجھا جاتا تھا جس کے ذمے فوجیوں کو تنخواہ بانٹنے کی خدمت ہو لیکن یہ خدمت اس کے روزمرہ کے مستقل فرائض میں شامل نہ تھی۔ اس کا تعلق مالی امور سے صرف اس وقت ہوتا تھا جبکہ فوج کسی مہم میں مصروف ہوتی تھی۔ دیوان اور اس کے نمائندے بذات خود فوج کے ساتھ مہم میں نہیں جاتے تھے وہ صرف میر بخشی کی معرفت اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ صرف میدان جنگ میں منظور شدہ رقوم اس کے قبضے میں رکھی جاتی تھیں اور وہی نقد تنخواہیں تقسیم کرتا اور حسب ضرورت فوج کو قرض

دیتا تھا - لیکن جب فوج میدان جنگ سے واپس آ جاتی تو میر بخشی دیوان کے دفتر میں حساب داخل کر دیتا تھا اور اس کی تنخواہ تقسیم کرنے کی ذمہ داری ختم ہو جاتی تھی -

اس عہدے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جس نوعیت کا کام اس سے متعلق تھا اس کی وجہ سے اس پر مامور شخص لازماً فوجی آدمی بن جاتا تھا - فوجی اہلیت اور سپاہیانہ زندگی ھی رفتہ رفتہ اس عہدے پر تقرر کی لازمی شرط بن گئی لیکن دفتری کام کی نوعیت اور دربار سے وابستہ فرائض کی اھمیت کے پیش نظر ، اس کا ذی علم اور شائستہ ھونا بھی ضروری تھا - غرض کہ دو مختلف النوع فرائض کی یکجائی کے باعث وہ خالص فوجی طرز بھی اختیار نہ کر سکتا تھا - اس زمانے میں جتنے اشخاص اس عہدے پر مامور رھے ، ان کی فہرست سے معلوم ھوتا ھے کہ ان میں سے اکثر دونوں قسم کی اھلیتیں رکھتے تھے اور ان کے انتخاب میں اس خاص بات کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا - اکبر کے زمانے میں آصف خاں قزوینی اور شیخ فرید صاحب السیف والقلم سمجھے جاتے تھے - فرید کو اپنی تخت نشینی کے بعد اس عہدے پر مستقل کرتے وقت جہانگیر نے خود کہا تھا "ترا صاحب‌السیف والقلم می دانم" - خواجہ ابوالحسن کو اس کی بد مزاجی کی وجہ سے لوگ بالعموم پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ یقیناً ذی علم تھا - چنانچہ اعتمادالدولہ کے بعد دیوان سلطنت مقرر کیا گیا - ارادت خاں ، اسلام خاں اور میر جملہ ، شاہ جہاں کے عہد میں دیوان اعلیٰ

مقرر کیے گئے - معتمد خاں اور اصالت خاں اپنی علمی قابلیت اور شائستگی کے لئے مشہور تھے -

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اکبر کے میر بخشیوں میں لشکر خاں اور شہباز خاں خالص فوجی تھے اور اس امر کے باوجود کہ دونوں کارکردگی اور وفا شعاری کے لیے مشہور تھے انہیں کئی مرتبہ اپنے درشت طرزِ عمل اور اکھڑ پن پر تنبیہ کی گئی - ان کے علاوہ صرف ایک صادق خاں تھا جسے جہانگیر نے بے وفائی کے شبہ پر عہدے سے بر طرف کر دیا تھا - باقی تمام اشخاص کو اپنے اپنے بادشاہ کا پورا اعتماد حاصل رہا - کوئی کسی جرم پر علٰحدہ نہیں کیا گیا ان میں سے کوئی صوبہ دار اور کوئی دیوان بنا دیا گیا اور کوئی عمر بھر اسی عہدے پر فائز رہا -

باب ہفتم

میر ساماں

خاکہ

مسٹر بار تھولڈ (Mr. Barthold) کی رائے میں مشرق کی مسلم سلطنتوں کے دو حصے ہوتے تھے - (۱) درگاہ - (۲) دیوان - لیکن اس کا اطلاق مغلیہ نظام حکومت پر نہیں کیا جا سکتا -

میر ساماں سرکاری کارخانہ جات اور ذخائر سامان کا نگران اعلیٰ - مرکزی حکومت کے ایک مستقل محکمے کا صدر -

نوعیت محکمہ - ایسا ہی ایک محکمہ فیروز تغلق کے زمانے میں - دونوں میں فرق - عہدۂ مذکور کے لیے دو اصطلاحات - میر ساماں اور خان ساماں کا استعمال - تالیف ھذا میں پہلی اصطلاح بر قرار رکھی گئی ہے -

محکمۂ مذکور کے عہدہ دار اور ان کے فرائض -

محکمۂ مذکور کا داخلی طریقۂ کار -

میر ساماں اور دیوان محکمہ کی حیثیتیں -

بادشاہ اور کارخانہ جات - محکمے سے بادشاہ کے تعلق کی تین صورتیں :

(۱) سال میں دو مرتبہ پیش کردہ منصوبے اور ان کے لیے مطلوبہ رقم کی منظوری -

(۲) عہدہ داران محکمہ تمام اہم معاملات اور بڑے بڑے منظور کردہ کاموں کی لاگت کے تخمینے بادشاہ کے سامنے دربار میں پیش کرتے تھے۔

(۳) محکمہ بادشاہ کے سامنے تیار مال کی نمائش کرتا اور متعلقہ دستکار کو اس کے حضور پیش کرتا۔

اس طریقے کے نتائج۔ کاریگروں سے براہ راست تعلق۔ ہر شخص کے کمالات کا اعتراف، انعام و اکرام اور حوصلہ افزائی۔ مختلف شعبوں پر بادشاہ کی ذاتی توجہ کی مثالیں۔

خیرات کے لئے منظور کردہ رقم نقد بھیجنے کے بجائے شاہ جہاں ملک میں تیار کیا ہوا مال حجاز بھیجتا تھا۔

شاہ جہاں کے ممتاز میر سامانوں کی فہرست اور ان کا منصب۔

مسٹر بارتھولڈ (Mr. Barthold) کا بیان ہے کہ ''مشرق ممالک کے پورے نظام سیاست کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان کے تمام انتظامی شعبے دو بڑے بڑے حصوں میں منقسم تھے ایک 'درگاہ' دوسرا 'دیوان' ''۔[1] لیکن اس بیان کا اطلاق ہندوستان کی تاریخ میں صرف سلطنت دہلی پر ہو سکتا ہے۔ اس میں میر حاجب، وکیل در اور باربک کے نام نظر آتے ہیں۔ ان عہدہ داروں کا تعلق دربار اور محل شاہی سے رہتا تھا اور ان کا درجہ دیوان وزارت اور دیوان عرض کے برابر تھا۔ لیکن مغلوں کا نظام بالکل مختلف تھا۔ اس کے قائم کرنے میں انہوں نے نہ سلاطین دہلی کی تقلید کی نہ سامانی و عباسی حکومتوں کی۔ ان کا تمام نظم و نسق دو حصوں میں منقسم تھا، ایک مرکزی، دوسرا صوبائی۔ مرکزی حصۂ نظم و نسق درگاہ اور دیوان دونوں پر مشتمل تھا لیکن فرائض اس بناء پر تقسیم نہیں کیے گئے تھے۔ دیوان اور میر بخشی کی طرح میر ساماں ایک مرکزی وزیر ہوتا تھا جس کے زیر انتظام مرکزی حکومت کا ایک محکمہ رہتا تھا۔

محکمۂ مذکور کارخانہ جات یا بیوتات کہلاتا تھا۔ وہ ان کارخانوں اور گوداموں پر مشتمل تھا جو سرکاری اغراض کے لیے مرکزی حکومت کے زیر نگرانی قائم تھے۔ یہ محکمہ نہ درگاہ کے تحت آتا ہے نہ خانگی امور کے۔ اس محکمے کا تعلق موتیوں، قیمتی پتھروں، تلواروں اور نیمچوں سے لے کر بندوقوں اور بھاری توپوں تک ہر چیز سے تھا۔ فوج کے لیے گھوڑے اور ہاتھی،

۱- ترکستان - صفحہ ۲۲۷

فوجی سامان کے لئے بار بردار جانور اور شاہی شکار کے لیے دوسرے جانوروں کا انتظام رکھنا بھی اسی کے ذمے تھا۔ فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں دیگر وزراء کی طرح اس محکمے کے صدر کا تعلق بھی بادشاہ سے بلا واسطہ رہتا تھا۔ بادشاہ کی منظور کردہ رقوم کے سلسلے میں اس کا تعلق دیوان سے رہتا اور وہ اپنے حسابات بھی بغرض تنقیح اسی کے پاس بھیجتا تھا۔ فوجی ساز و سامان، نیز شاہی دوروں اور شکار کے انتظامات کے سلسلے میں اس کا تعلق میر بخشی سے بھی رہتا تھا۔ ان میں سے ایک کا تعلق فوجی انتظام سے تھا اور دوسرے کے ذمے یہ کام تھا کہ فوج کی ضروریات کے مطابق سامان برابر مہیا کرتا رہے۔ ایک شاہی دوروں اور شکار کے انتظامات کرتا تھا۔ دوسرے کے ذمے فوجی سامان اور رسد بھجوانے کے کام کی دیکھ بھال تھی۔ اس طرح دونوں بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے۔

محکمۂ مذکور نہ صرف ہر قسم کا سامان خریدتا اور اس کا ذخیرہ جمع رکھتا تھا بلکہ ملک میں اسلحۂ جنگ اور سامان تعیش تیار کرنے والا سب سے بڑا ادارہ بھی یہی تھا۔ حالانکہ اس کی مالک و منتظم سرکار تھی مگر اس محکمے کو چلانے میں تجارتی اصولوں کی پابندی سختی کے ساتھ کی جاتی تھی۔

سلطنت دھلی کے دور میں صرف فیروز شاہ نے سرکاری کارخانوں کی جانب پوری توجہ کی۔ اس کا عملہ کافی بڑا تھا جس کے لیے ایک علحدہ محکمہ تھا۔ لیکن عفیف کے بیان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ محکمۂ مذکور صرف تیار سامان کا ذخیرہ جمع رکھتا تھا یا وہ ان

چیزوں کو تیار بھی کرتا تھا - جہاں جہاں اس کا ذکر ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف سامان کا ذخیرہ جمع رکھتا تھا اور اس کی اہمیت اسی لحاظ سے تھی کہ وہ بہت بڑی مقدار میں سامان کا ذخیرہ رکھتا تھا اور ہر قسم کی تازہ اور جدید ترین چیزیں بلا ناغہ وقت پر مہیا کرتا تھا۔[1]

میر سامان یا خان سامان

اس عہدے کے لئے میر سامان کی اصطلاح کا استعمال کسی حد تک گمراہ کن ہے۔ اکبر کے زمانے میں یہ لفظ قطعی استعمال نہیں ہوا۔ مسٹر بلاخ من (Mr. Blochmann) نے ایک مثال پیش کی ہے جس میں یہ لفظ خواجہ جلال الدین محمود حاکم خراسان کی سوانح عمری میں ایک جگہ استعمال کیا گیا ہے لیکن وہاں اس کا استعمال ہمایوں کے عطا کردہ خطاب کے طور پر ہوا ہے "جو ان حالات میں محض

---

۱ - عفیف - (۱) سلطان اکثر کہا کرتا کہ سلطنت مین دو چیزیں نہایت بیش قیمت ہوتی ہیں۔ ایک اراضی جاگیر پرگنہ جات اور ممالک محروسہ ہیں اور دوسری کارخانہ جات ہیں - جس طرح جاگیروں سے لاکھوں روپیہ وصول ہوتا ہے اسی طرح کارخانوں میں لاکھوں روپیہ کا سامان جمع رہتا ہے۔ چنانچہ میرے ایک کارخانے کا سامان مالیت میں شہر ملتان کی آمدنی سے کسی طرح کم نہیں ہے ، (صفحہ ۳۳۹)

(۲) 'سلطان کے پاس ۳۶ کارخانے تھے - وہ ان میں سامان جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کرتا تھا ، ہر کارخانے میں انواع و اقسام کا سامان اعلیٰ درجے کا جمع رہتا تھا - (صفحہ ۳۵۶)

(۳) 'مختلف کارخانے مختلف امرا کی نگرانی میں رہتے تھے لیکن سب کا نگران اعلیٰ خواجہ ابوالحسن تھا جو احکام شاہی وصول کرتا ارر پھر انھیں امیر متعلقہ کے پاس بھیج دیتا تھا۔ متعلقہ امیر ان احکام کی تعمیل فوراً کرتے - (صفحہ ۳۳۸)

(۴) 'جب بھی اعلیٰ درجے کا سامان ملتا وہ کارخانوں کے لیے خرید لیا جاتا 'ور اس کی قیمت اسی روز ادا کردی جاتی ، (صفحہ ۹۹)

ایک اعزاز تھا - اس سے زیادہ کچھ نہیں"۔ آئین میں نہ اس کے فرائض کا ذکر ہے نہ اختیارات کی تشریح - [1] اکبر نامے میں بھی اس کا ذکر دوسرے ہم رتبہ عہدہ داروں کی بہ نسبت بہت کم ملتا ہے -

جہانگیر کے عہد حکومت میں لفظ میر ساماں کا استعمال شروع سے آخر تک برابر ملتا ہے - صرف ایک مثال ایسی ہے کہ تزک میں اس لفظ کے بجائے لفظ خان ساماں، ۱۰ سنہ جلوس میں میر جملہ کے 'خدمت خان سامانی' [2] پر تقرر کے سلسلے میں، استعمال کیا گیا ہے - لیکن جب ۲۱ سنہ جلوس میں اس کی جگہ افضل خاں مقرر ہوا تو اس کے لیے لفظ میر ساماں استعمال کیا گیا - [3]

شاہ جہاں کے زمانۂ حکومت میں تمام ہمعصر مورخین عہدہ دار مذکور کے لیے لفظ میر ساماں استعمال کرتے ہیں خواہ اس کا ذکر تقررات کے سلسلے میں آیا ہو خواہ دربار یا دوروں کے سلسلے میں کیا گیا ہو -

لیکن جہاں تک ان ''دساتیر العمل'' کا تعلق ہے، جو زیادہ تر عالمگیر کے عہد میں بنائے یا نقل کیے گئے تھے ان میں اکثر لفظ

---

۱ - آئین - صفحہ ۴ - میر ساماں مع دیوان بیوتات، دیوان سلطنت کا ماتحت ہوتا ہے اور اس عہدے کے لیے لفظ خان ساماں کے بجائے میر ساماں استعمال ہوتا ہے -

۲ - تزک - صفحہ ۳۱۴

۳ - تزک - صفحہ ۳۱۲

خان ساماں ہی استعمال ہوا ہے ۔ میر ساماں صرف ایک دستور[1] کے مسودے میں استعمال ہوا ہے جو اس کے زمانۂ حکومت کے ابتدائی حصے میں تیار ہوا تھا ۔ دیگر تالیفات میں ، بشمول تاریخ شاکر خانی[2] جو محمد شاہ کے دور حکومت میں لکھی گئی تھی ، لفظ خان ساماں ہی استعمال کیا گیا ہے ۔

ان امور کے پیش نظر میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ اکبر کے عہد میں عہدہ دار مذکور کو وہ درجہ و مقام حاصل نہ تھا جو اسے اکبر کے دو جانشینوں کے عہد حکومت میں حاصل ہوا ۔ نیز اس کے عہدے سے متعلق جتنا کام بعد میں پیدا ہو گیا ، اکبر کے عہد حکومت میں اس کا کوئی وجود نہ تھا ۔ جہاں تک کارخانہ جات کا تعلق ہے اکبر کے زمانۂ حکومت میں دیوان بیوتات کا ذکر زیادہ نمایاں ہے ۔ وہ بعد میں رونما ہونے والے واقعات تھے جن کے باعث وہ تمام محکمے کا اعلیٰ ترین عہدہ دار بن گیا اور جن کی وجہ سے انتظامی ہیئت میں اس کا مقام متعین ہوا اور اس حیثیت میں اسے میر ساماں کہنے لگے ۔ جہانگیر کی حکومت کے حالات میں اکثر اس کے فرائض بیان کیے گئے ہیں ۔ ہر جگہ اسے میر ساماں کہا گیا ہے ، خان ساماں نہیں ۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت کے سرکاری ضوابط میں اسے پھر خان ساماں کہا گیا ہے ۔

---

۱ ۔ م ۔ ت ۔ ۶۵۹۹ ورق ۵۸

۲ ۔ م ۔ ت ۔ ۶۵۸۰

میں نے اپنی کتاب میں میر ساماں ہی استعمال کیا ہے کیونکہ یہ کتاب جس زمانے کے حالات پر مشتمل ہے اس کے بیشتر حصے کے حالات لکھنے والے ہمعصر مورخین نے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔

عہدہ داران محکمہ

محکمۂ مذکور کا سب سے بڑا انتظامی عہدہ دار میر ساماں ہوتا تھا جو محکمے پر عام نگرانی رکھتا تھا اور اس امر کا ذمہ دار تھا کہ وہ حسب دلخواہ کام کرتا رہے۔ محکمۂ مذکور کے دیگر عہدہ دار حسب ذیل تھے :—

دیوان بیوتات : یہ دوسرا عالی مرتبہ عہدہ دار تھا جو خاص طور پر مالیات کے محکمے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

مشرف کل و جز : صدر محاسب یہی ہوتا تھا۔ محکمے کے ہر شعبے میں اس کے ماتحت ایک ایک محاسب ہوتا تھا۔

داروغہ : ہر شعبے یا کارخانے میں ایک داروغہ ہوتا تھا جو براہ راست اپنے شعبے کے کاریگروں سے کام لیتا، ان میں روزانہ کا کام تقسیم کرتا اور کام ختم ہونے پر روزانہ جو سامان باقی بچ جاتا اسے اپنی تحویل میں لے لیتا تھا۔

تحویل دار : داروغے کی طرح ہر کارخانے میں ایک تحویلدار بھی ہوتا تھا۔ اس کی تحویل میں وہ نقد رقم اور سامان رہتا تھا جس کی ضرورت اس کے شعبے کے لیے ہوتی تھی۔

مستوفی : وہ کارخانہ جات کے حسابات کی تنقیح کرتا تھا۔ مصارف کی جانچ رسیدات کی روشنی میں کرتا، فرد حسابات تیار کرتا،

خود اس پر دستخط کرتا ، اسے دیوان محکمہ کے سامنے پیش کرتا اور آخر میں میر ساماں کی مہر اس پر ثبت کراتا تھا ۔

داروغـۂ کچہری : اس کے ذمے دفتر کے عملے کی عام نگرانی تھی ۔ یہ انتظام بھی اسی کے سپرد تھا کہ تمام کاغذات اور رجسٹر ایک عہدہ دار کے پاس سے دوسرے عہدہ دار کے پاس برابر پہنچتے رہیں ۔ اس بات پر نگرانی رکھنا بھی اسی کا فرض تھا کہ کوئی شخص دفتر کے ملازموں اور اہلکاروں کے ساتھ بد تمیزی کا سلوک نہ کرنے پائے ۔ وہ دفتر کے دروازوں کو افسر متعلقہ کی مہر کے ساتھ مقفل کرتا اور پھر ہر قفل پر اپنی مہر بھی لگاتا تھا ۔

ناظر : اس کا درجہ دیوان محکمہ کے بعد تھا ۔ یہ عہدہ ۳۰ سنہ جلوس اکبری میں قائم کیا گیا اور اس پر ایک بہت قابل شخص ، قاضی علی بغدادی کا تقرر ہوا ۔ وہ ابتدائی زمانۂ حکومت میں نائب صدر کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور مختلف النوع فرائض کے علاوہ ، کچھ عرصے تک ، شریک دیوان کے فرائض بھی انجام دے چکا تھا ۔ ابوالفضل عہدۂ مذکور کے قیام کی وجہ یہ بیان کرتا ھے کہ 'حالانکہ صادق خاں بہت ھوشیار میر ساماں تھا اور خواجہ غیاث الدین بیگ دیوان تھا ، پھر بھی ہر محکمے کی طرح آمدنی و مصارف چونکہ یہاں بھی بہت زیادہ تھے ، اس لیے جتنی زیادہ مدد ملتی کام کے لیے اتنا ھی اچھا تھا ۔'[۱] اس سے معلوم ھوتا ھے کہ اس عہدے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ دیوان کو اس سے

---

۱ - اکبر نامہ ۔ جلد سوم ، صفحہ ۵۹۷ - ترجمہ ۔ صفحہ ۸۷۷

مدد ملے ۔[۱] دستور کے مطابق ، ناظر کا فرض تھا کہ وہ دیوان محکمہ کے ہر کام کو دوبارہ دیکھے اور اس پر اپنی مہر لگائے ۔ اس حیثیت میں وہ ایک ایسا عہدہ دار تھا جو بہتر کارکردگی اور قطعیت کی ضمانت کے لیے ہر کام پر نظر ثانی کیا کرتا تھا ۔ محکمے میں عملاً اس کا تعلق انتظامی امور کی بہ نسبت مالی امور سے زیادہ تھا ۔ درجے اور منصب میں وہ یقیناً دیوان سے کم تھا اور کسی جگہ وہ اس کے برابر نظر نہیں آتا ۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہانگیر اور شاہ جہاں دونوں کے عہد حکومت میں داروغوں اور تحویل داروں کا ذکر اکثر جگہ ملتا ھے ۔ انھیں جب طلب کیا جاتا تو وہ بادشاہ کے حضور میں اپنے کارخانوں کا تیار کیا ھوا مال پیش کرتے تھے ۔ لیکن ناظر محکمہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا ۔ حالانکہ اس کا تعلق روزمرہ کے سرکاری کام سے رھتا تھا ۔ نہ وہ اپنے فرائض کی نوعیت کے لحاظ سے داروغہ و تحویلدار کی طرح ممتاز تھا ، نہ میر ساماں اور دیوان کی طرح نمایاں حیثیت رکھتا تھا ۔[۲]

محکمے کا اندرونی طریق کار

ہر عہدہ دار کے فرائض کا خلاصہ یہ ھے : میر ساماں صدر محکمہ کی حیثیت سے عاملانہ فرائض انجام دیتا تھا اور ہر شعبے کے اندرونی کام پر عام نگرانی رکھتا تھا ۔ اسے داروغوں ، مشرفوں اور تحویل داروں کے تقرر و تعطل سے متعلق ابتدائی کارروائی کرنے کے

---

۱ - م ۔ ت ۔ ۶۵۹۹ - ورق ۳۷ ب

۲ - مثالیں آئندہ صفحات میں ملیں گی جہاں بادشاہ اور کارخانہ جات کا ذکر ھے - (صفحہ ۳۶۳)

اختیارات حاصل تھے - وہ اپنے ماتحتوں میں سے کسی بھی ماتحت کے خلاف حسب ضرورت تادیبی کارروائی کرنے کا حق رکھتا تھا۔ وہ محکمے کے تمام امور سر انجام دیتا اور ایسی تمام فرمائشوں کی تکمیل کی جانب توجہ کرتا تھا جو صوبوں سے کارخانہ جات کے نام موصول ہوتی تھیں - وہ تمام اہم امور اور بڑے بڑے تجارتی معاملات بادشاہ کے علم میں لاتا لیکن باقی امور خود انجام دیتا تھا -

دیوان وہ امور سر انجام دیتا تھا جن کا تعلق مالیات سے ہوتا اور اس حیثیت میں اسے ناظر ، مستوفی اور مشرف سے واسطہ رہتا تھا۔ باقی دوسرے امور میں بھی وہ کارخانہ جات کی ضروریات پوری کرتا تھا مگر پہلے انھیں میر ساماں کے علم میں لاتا اور حسب قواعد اس سے مشورہ کر کے کام کرتا تھا - مالی امور سے متعلقہ کاغذات کی طرح میر ساماں ان کاغذات پر جو دیوان و مستوفی کی معرفت اس تک پہنچتے ، صرف اپنی مہر ثبت کر دیتا تھا اور تفصیلات کو نہیں دیکھتا تھا - اسی طرح دیگر امور میں دیوان ، میر ساماں کے فیصلوں پر اعتماد کرتا تھا - اس محکمے میں بھی وہی دوہرا طریق کار ، مشترکہ ذمہ داری کا وہی احساس اور اختیارات میں اسی طرح توازن برقرار رکھا گیا جیسا مغلیہ نظم و نسق کے ہر شعبے میں نمایاں تھا - حالانکہ محکمۂ مذکور کے ہر دو اعلیٰ عہدہ داروں کے اختیارات واضح طور پر متعین تھے - لیکن دونوں کے درمیان کوئی ایسی آہنی دیواریں بھی کھڑی نہیں کر دی گئیں تھیں جو دونوں کے انتظامات کو ایک دوسرے سے قطعی جدا رکھیں۔ بلکہ محکمے کے مفاد کی غرض سے دونوں ایک دوسرے

سے صلاح و مشورہ کر کے کام کرتے تھے اور اس حد تک دونوں کے انتظامات مخلوط تھے۔

ناظر کے ذاتی فرائض و اختیارات مصرحہ نہ تھے۔ وہ دیوان کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ اس کی موجودگی کا فائدہ صرف اس قدر تھا کہ مرکزی محکمۂ تنقیح کو حسابات بھیجے جانے سے پہلے حسابات پر نظر ثانی اور ان کی جانچ پرتال کا کام آسان ہو جاتا تھا۔

مستوفی ہر شعبے کے تحویلداروں اور مشرفوں سے ضروری کاغذات، بالخصوص بہی، روزنامچہ اور روز کے آمد و خرچ کا خلاصہ طلب کیا کرتا تھا۔ حسابات کی جانچ پرتال مد وار کرتا اور پھر ان پر دیوان کے دستخط کراتا تھا۔ دیوان کو جس بات کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی اس کی وضاحت وہ خود اپنے قلم سے کرتا تھا۔

حسابات کی منظوری کے بعد وہ حصول رقم کے لیے فردیں تیار کرتا اور ان پر دیوان کے دستخط لے کر داروغۂ کچہری کے حوالے کر دیتا تاکہ رقم وصول کی جائے۔

اس بات پر نظر رکھنا دیوان کا فرض تھا کہ اس سلسلے میں اس کے محکمے کے کسی فرد کو کسی قسم کی دشواری نہ پیش آئے۔ تمام ایسے حسابات اور لین دین کے لیے جو اس کی معرفت ہوتا تھا وہی ذمہ دار تھا۔[1]

ہر تحویلدار کے سپرد جو محکمہ ہوتا تھا، اس کی آمدنی اور خرچ کا ایک گوشوارہ بھی مستوفی تیار کرتا تھا اور ہر کارخانے

۱۔ م۔ت۔ ۶۵۹۹، ورق ۵۸۔ م۔ت ۶۵۲۶، ورق ۳۳ الف۔

کے حسابات اور معاملات کی عام صورت حال سے متعلق رپورٹ بھی وھی تیار کرتا تھا ۔[1]

تحویلدار اور داروغہ کے فرائض صرف ان نمونوں سے اخذ کیے جا سکتے ھیں جو ''دستور'' میں دیے ھوئے ھیں اور جن میں روزانہ ھر شعبے میں انجام پانے والے کام کے ساتھ رقوم درج ھوتی تھیں جو اس کام کے سلسلے میں ادا کی جاتی تھیں ۔

تحویلدار اپنے شعبے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ضروری رقم اپنے پاس رکھتا تھا ۔ وہ اس سامان کا ذخیرہ بھی رکھتا تھا جو اس مخصوص شعبے میں ھونے والے کام کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا تھا ۔ داروغہ اس سے روپیہ یا سامان لے کر ان کاریگروں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا جو اس کی ماتحتی میں کام کرتے تھے ۔ اس قسم کے لین دین کا اندراج روزانہ کر لیا جاتا تھا اور دن ختم ھونے پر داروغہ ھر کاریگر کا کام جو وہ اس دن کرتا درج کر لیتا تھا ۔ مثلاً اگر کوئی شخص کوئی زیور یا کوئی کپڑا تیار کر رھا ھوتا تو دن ختم ھونے پر جتنا کام ھو چکا ھوتا داروغہ اس کا اندراج کر لیتا اور پھر اسے باقی بچے ھوئے سامان کے ساتھ تحویلدار کے حوالے کر دیتا ۔ اس طرح کام روزانہ ھوتا رھتا اور

---

۱ - م - ت - ۶۰۹۸ ، اوراق ۵۳ ب ، ۵۴ اور ۵۶ - ۱۰۴ - ان میں فرد حسابات کے نمونے ھیں اور حسب قواعد ھر کارخانے کی تفصیلات درج کرنے کا طریقہ مذکور ھے ۔ ان کاغذات کا بالتفصیل مطالعہ کرنے کے بعد اور پھر ان کا مقابلہ مذکورہ عہدہ داران کے فرائض سے متعلق متفرق تاریخی واقعات سے کرکے مذکورہ بالا ضابطۂ کار مرتب کیا گیا ھے ۔

داروغہ و تحویلدار روزانہ یہ اندراجات کرتے رہتے کہ کاریگروں کو کیا کیا اور کتنا کتنا سامان دیا گیا اور انہوں نے اس میں سے اس روز کتنا کتنا استعمال کیا ۔ جب کوئی چیز بن کر تیار ہو جاتی تو اس کی لاگت کا اندازہ ، اس میں استعمال کیے ہوئے سامان کی قیمت میں متعلقہ کاریگر کی محنت کا معاوضہ شامل کر کے کیا جاتا ۔ اس کے بعد ایک آخری رپورٹ تیار کی جاتی جس میں لکھا جاتا کہ فلاں فلاں چیز اتنی لاگت پر فلاں فلاں کاریگر نے فلاں فلاں داروغہ کی نگرانی میں تیار کی ۔

یہی طریقۂ کار ہر شعبے میں اختیار کیا جاتا تھا خواہ وہ باورچی خانہ ہوتا جہاں اجناس خوردنی کی صورت میں سامان بہم پہنچایا جاتا یا محکمۂ تعمیرات ہوتا جہاں اینٹوں کی تعداد ، پتھروں کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی اور کسی مخصوص رقبے میں استعمال ہونے والے دیگر سامان کی مقدار کا روزانہ اندراج کیا جاتا تھا ۔

غرضکہ داروغہ اور تحویلدار کو براہ راست کاریگروں سے واسطہ رہتا تھا ۔ ایک کے پاس نقد رقم اور استعمال ہونے والے ضروری سامان کا ذخیرہ موجود رہتا اور دوسرا ان چیزوں کو کاریگروں کے درمیان تقسیم کرتا اور ان کے کام پر نگراتی رکھتا تھا ۔ اسی شعبے کا مشرف روز کے حالات درج کیا کرتا تھا ۔ یہ حالات ، روزمرہ کی ادا شدہ رقوم ، دیے ہوئے سامان اور مکمل کیے ہوئے کام کے اندراجات کی صورت میں قلم بند ہوتے تھے ۔ حسابات مستوفی کے پاس بھیجے جاتے تھے اور ان کی مشترکہ ذمہ داری تحویلدار ، داروغہ اور مشرف پر عائد ہوتی تھی ۔

داروغۂ کچہری ، عہدہ داران مذکور اور اعلیٰ تر درجہ رکھنے والے دوسرے عہدہ داروں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا تھا اور ہر مرحلے پر ضروری کاغذات متعلقہ اشخاص کو ارسال کرتے رہنے کا ذمہ دار تھا ۔

کاریگروں کو کام کی نوعیت کے لحاظ سے ماہوار تنخواہ یا روزانہ اجرت دی جاتی تھی ۔ با ہنر اشخاص کو عموماً ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی اور اچھے دستکاروں کے ساتھ بہت مہربانی کا سلوک کیا جاتا تھا ۔ بادشاہ ان سب سے ذاتی طور پر واقف ہوتا تھا اور جب وہ اپنے پیشے میں کوئی غیر معمولی کاریگری یا ہنر کا نمونہ پیش کرتے تو انھیں بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا یا بادشاہ خود انھیں طلب کرتا ۔

میر سامان اور دیوان بیوتات کی حیثیت

میر ساماں اور دیوان بیوتات ، دونوں مشترکہ طور پر کارخانہ جات اور محکمے کے انتظام کے ذمہ دار ہوتے تھے ۔ لیکن مشترکہ ذمہ داری کے باوجود محکمے کے داخلی انتظامات اور ضابطۂ کار کی تفصیلات سے پتا چلتا ہے کہ دیوان محکمہ کے مقابلے میں میر ساماں کو کسی قدر زیادہ بلند حیثیت حاصل تھی ۔ تاہم دیوان کو اس کا ماتحت نہیں کہا جا سکتا ۔

دونوں کو حق حاصل تھا کہ دربار میں حاضر ہو کر اپنے اپنے فرائض سے متعلق امور بادشاہ کے حضور میں پیش کریں لیکن میر سامان کو تفوق حاصل تھا اور اسے یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ اپنے محکمے کے متعلق جو بات ضروری سمجھے اسے بادشاہ

کے سامنے پیش کرے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دیوان صرف ضروری کاغذات بادشاہ کے حضور میں پیش کرسکتا تھا۔[1]

اسی طرح شاہی فرمانوں پر مہرثبت کرنے کے معاملے میں بھی میر سامان کا رتبہ نسبةً بلند تھا۔ وہ اپنی مہر دوسری تہ پر دیوان (وزیر) اور میر بخشی کی مہروں کے ساتھ لگاتا تھا لیکن دیوان بیوتات کی مہر تیسری تہ پر لگتی تھی۔[2]

فرائض کی تقسیم اور محکمے کے کام کی تفصیل سے بھی یہی فرق مراتب ظاہر ہوتا ہے۔ تمام اہم کاغذات پر میر سامان کے تصدیقی دستخط ضروری تھے۔ جو جائداد زیر اختیار محکمہ ہوتی اس سے متعلق تمام سرکاری مقدمات کی پیروی کی ذمہ داری پوری طرح اسی پر عائد ہوتی تھی۔ جائداد کی قرقی کے سلسلے میں دیوان اس کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا[3]۔

---

۱ - لاہوری - جلد اول - صفحہ ۲۴۵

۲ - بلاخ من - صفحہ ۲۶۳

۳- دارالحکومت کی تمام سرکاری جائداد میر ساماں اور اس کے محکمے کے زیر انتظام رہتی تھی۔ تمام باغوں، دکانوں، کرائے پر دیے ہوئے مکانوں اور نزول کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔ اسی طرح جو جائداد فرمان شاہی کے تحت ضبط کی جاتی اس کے انتظام کی ذمہ داری بھی وہی سنبھالتا تھا۔ صاحب تاریخ شاکر خانی نے خود اپنا معاملہ قلم بند کیا ہے۔ اس کے والد کے انتقال پر اس کی خاندانی جائداد ضبط کرلی گئی تھی اور پھر بعد میں واپس کردی گئی۔ میر ساماں ہی نے دونوں مواقع پر حکم کی تعمیل کی تھی۔ (ورق ۔ ۔ ۔ ۱ الف و ب)

مذکورہ حیثیت میں وہی ان احکام کی تعمیل بھی کرتا تھا جو ایسے مکانات کے متعلق ہوتے تھے جو بخشش یا انعام کے طور پر دیے جاتے تھے۔

جہاں تک ان کے منصب کے پیش نظر ان کے رتبے کا تعلق ہے، اکبر کے عہد حکومت کے حالات اس پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں میر سامان کا رتبہ اس کے محکمے کے دیوان سے قطعاً بلند تھا اور اس کا منصب بھی دیوان کے منصب سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ سرکاری مناصب میں مذکورہ فرق کے باوجود دونوں وزارت عظمیٰ پر براہ راست فائز ہوتے اور میر سامان کے مقابلے میں دیوان گھاٹے میں نہ رہتا تھا۔

بادشاہ اور کارخانہ جات

''دستور'' کے مطابق بادشاہ کا تعلق مرکزی حکومت کے مذکورہ شعبے سے تین مختلف صورتوں میں قائم رہتا تھا اور اس طرح شعبۂ مذکور کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس سے بادشاہ بے تعلق رہتا ہو۔

مالی منظوریاں اور منصوبے

محکمۂ مذکور اپنے مالی گوشوارے اور ضروریات سال میں دو مرتبہ حکومت کو ارسال کیا کرتا تھا۔ بالآخر یہ چیزیں بادشاہ کے سامنے پیش کی جاتی تھیں اور منظوری بصورت فرمان جاری کی جاتی تھی جس پر شاہی مہر ثبت ہوتی تھی[1]۔

ایسے فرمان جو صرف مالی منظوریوں کے لیے جاری کیے جاتے برات کہلاتے تھے۔ یہ فرمان، عمومی نوعیت کے دیگر فرمانوں سے مختلف ہوتے تھے۔

---

۱ - آئین۔ صفحہ ۱۹۵

ان گوشواروں میں تمام لین دین اور ایسے دوسرے مالی امور درج کیے جاتے تھے جن کا تعلق محکمۂ مذکور سے ہوتا تھا - مثلاً ہر قسم کی خرید و فروخت ، ہر وہ مال جس کا ذخیرہ رکھا جاتا ، وہ مصارف جو مستقل عملے پر خرچ کیے جاتے ، ایسے عارضی ملازموں اور کاریگروں کا ذکر جو روزانہ اجرت پر ملازم رکھے جاتے۔ ان میں وہ بقایا رقوم بھی درج ہوتی تھیں جو تحویلداروں کے پاس رہتی تھیں - نیز محکمۂ مذکور کے ہر شعبے کے وہ مطالبات بھی درج ہوتے تھے جو شعبۂ مذکور دیوان بیوتات کی معرفت بھیجتا تھا[1] -

---

۱ - م - اُ - ۱۶۴ ، ورق ۲۰ اور ۲۱ ب ، فقرات ۱، ۵ اور ۶ - مذکورہ گوشواروں کی تیاری کس طرح کی جاتی تھی - ہر کارخانے یا اصطبل کا محاسب ہر سال دو براتیں لکھتا ہے - ایک چھ ماہ یعنی فروردیں سے شہر یور تک (فروری تا جولائی) اور دوسری مہر تا اسفندارمذ (اگست سے جنوری تک) کے لیے ہوتی تھی - [آئین - بلاخ من - صفحہ ۲۶۲ - اس میں جو انگریزی مہینوں کے نام دیے ہیں وہ غلط ہیں - وہ اصل نسخے میں دیے ہوئے ایرانی مہینوں سے مطابقت نہیں رکھتے -] وہ غلہ اور گھاس وغیرہ سے متعلق نقد رقم اور ان چیزوں کے ذخیروں کی بابت نیز عملے کی تنخواہیں اس گوشوارے میں درج کرتا اور پھر اس پر اپنے دستخط کرتا ہے - دیوان بیوتات ان گوشواروں کا معائنہ کرتا ہے - جو نقد رقمیں ان میں درج ہوتی ہیں ان کی کمی بیشی کے متعلق [اگر کوئی ہو] تحقیقات کرنے کے بعد انہیں منظور کرتا ہے اور پھر اس کے حاشیے پر لکھتا ہے - [از تحویل فلاں برات نویسند] ''ایک برات تیار کی جائے جس میں فلاں فلاں کے پاس جمع کی جانے والی رقم درج کی جائے -'' [آئین - بلاخ من صفحہ ۲۶۲ - ترجمہ میں لفظ ''مشرف'' زائد ہے لیکن وہ غلط ہے کیونکہ رقم ''مشرف'' کے پاس جمع نہیں کی جاتی تھی بلکہ تحویلدار کے پاس جمع کی جاتی تھی اور لفظ ''فلاں'' کسی مخصوص تحویلدار کے لیے ہوتا تھا نہ کہ مشرف کے لیے ، جس کا تعلق صرف حسابات سے تھا - آئین - صفحات ۱۹۴ و ۱۹۵ - بلاخ من - صفحہ ۲۶۲ - بعض مقامات پر مجھے ترجمے سے اتفاق نہیں ہے -

اهم امور کا پیش ہونا

بادشاہ کا فرض رقوم منظور کرنے اور ہر چھ ماہ میں ایک بار مالی گوشوارے کا معائنہ کرلینے تک محدود نہ تھا لیکن یہ امور اس کے روز مرہ کے کام کا جزو تھے - میر سامان اور دیوان دوسرے محکموں کے صدر کی طرح روزانہ دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے

بقیہ حاشیہ ماقبل

بعض تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ضروری تشریحات کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے] مشرف کارخانہ‌جات حکم کی تعمیل کرتا ہے - ایک رسید بھی لکھتا، اس پر دستخط کرتا اور مہر لگاتا ہے - نقد ادائیوں کے چیک پر ایک چوتھائی رقم وضع کرلی جاتی ہے اور اس کے لیے ایک علحدہ سند دی جاتی ہے - بعد ازاں دیوان بیوتات (دفتر کے رجسٹروں میں) اس کے اندراج کا حکم دیتا ہے - بعد ازاں برات اور رسید پر مشرف محکمہ دستخط کرتا اور مہر لگاتا ہے (اس طرح وہ برات جو متعلقہ کارخانے میں تیار کی جاتی ہے، دیوان بیوتات کی منظوری کے بعد محکمے سے باہر نکلتی ہے) اب وہ محاسب عسکری کے پاس جاتی ہے (کیونکہ محکمے کے بعض ملازمین صاحب منصب ہوتے ہیں اور اس فہرست پر اپنی تنخواہ وصول کرتے ہیں) بعد ازاں وہ مستوفی، ناظر، دیوان بیوتات کے پاس (دوبارہ اس لیے کہ شاید مستوفی کی جانچ پرتال کے بعد اس میں پھر کسی تبدیلی کی ضرورت ہو) نیز دیوان کل، خانساماں (یا میر ساماں)، مشرف دیوان (اعلیٰ) اور وکیل کے پاس بھیجی جاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اس پر دستخط کرتا اور اپنی مہر لگاتا ہے - ہر صورت میں اس کے ساتھ تخمینہ بھیجا جاتا ہے تا کہ غلطی کا امکان نہ رہے - بادشاہ کے سامنے پیش ہوجانے پر، مشرف رسید تیار کرتا ہے اور پھر وہ بھی حسب طریقۂ بالا مختلف دفتروں میں درج کی جاتی ہے - اس کی پشت پر ادا کرنے کا طریقہ بھی لکھ دیا جاتا ہے - یعنی ایک چوتھائی سونے (اشرفیوں) کی شکل میں - نصف چاندی (روپیوں) کی شکل میں، ایک حصہ تانبے (دام) کی شکل میں سکوں کی مقررہ مالیت کے مطابق - معاملے سے متعلق گوشوارہ حساب ہر برات کے ذیل میں تحریر کر دیا جاتا ہے - (محکمے کا تمام لین دین، رقوم کا جمع کرنا اور ہر قسم کی کارگاہوں یا اصطبلوں کے ملازمین کی تنخواہ میں ادا کرنا، سب کچھ براتوں کے ذریعے کیا جاتا ہے)

اور اپنے اپنے فرائض سے متعلقہ اہم امور کی نمائندگی کرتے تھے[۱]۔ انھیں مواقع پر بادشاہ کارخانہ جات کو کوئی چیز بنانے کی فرمائش کرتا، دیگر محکموں کی فرمائشوں کا ملاحظہ کرتا، دوسروں کی بڑی بڑی فرمائشیں اس کے علم میں لائی جاتیں اور وہ محکمہ کی مقرر کردہ قیمتوں کی منظوری عطا فرماتا۔[۲]

بعض چیزوں اور جانوروں کی قیمتیں جو مقرر کی گئیں اور جن کی اطلاع بادشاہ کو دی گئی۔

تزک ۔ ۲ سنہ جلوس ۔ صفحہ ٦٦ ۔

بھوج ھاوا کے بیٹے رتن کے پیش کردہ ھاتھی کی قیمت ۱۰۰۰۰ روپے متعین ھوئی اور اس کا نام رتن گنج رکھا گیا۔

---

۱ ۔ دستور میں اس امر کی قطعی صراحت موجود تھی کہ اہم امور بادشاہ کے سامنے پیش کیے جائیں ۔
(م ۔ ت ۔ ورق ۳۳ ۔ فقرہ ۱)

۲ ۔ قیمتوں کا تعین میر ساماں کے فرائض کا اہم جزو تھا ۔ ماہرین کا مشورہ ضروری تھا اور وہ حاصل کیا جاتا اور بعض اوقات خود بادشاہ اس کا انتظام کرتا لیکن سرکاری طور پر میر ساماں ھی اس کا ذمہ دار تھا (م ۔ ا ۔ ۱٦٤۱ ، ورق ۲۰ ب) اس فریضے کی اہمیت کا اندازہ ان قیمتوں سے ھوسکتا ھے جو اس قسم کے ساماں کی آئین میں درج ھیں (صفحہ ۱۰۱)

آئین ۔ صفحہ ۱۰۱ ۔ صنعت پارچہ ، محکمۂ خیاطی اور شاھی توشہ خانے کے لیے ۔

آئین ۔ صفحات ۱۰۳ ۔ ۱۱۱ ۔ ھر قیمت کے شالوں کے لیے جو سرکاری طور پر تیار کی جاتی تھیں ۔

آئین ۔ صفحات ۱۱۹ ۔ ۱۲٤ ۔ ھر قیمت کے اسلحہ کے لیے جو سرکاری طور پر تیار کیے جاتے تھے ۔

آئین ۔ صفحات ۱٦۰ ۔ ۱۷۰ ۔ سامان متعلقۂ تعمیر مکانات ۔

تزک - ۱۰ سنہ جلوس -

راجہ سورج سنگھ کے پیش کردہ ھاتھی کی قیمت کا تعین ۲۰۰۰۰ روپیہ کیا گیا اور اس کا نام فوج سنگھار رکھا گیا -

تزک - ۱۵ سنہ جلوس - صفحہ ۳۲۶ -

سال میں ۳۸ ھاتھی موصول ھوئے جن کی قیمت کا تعین دو لاکھ اکتالیس ھزار روپے کیا گیا -

تزک - ۳ سنہ جلوس - صفحہ ۷۰ -

وکیل آصف خاں قزوینی کی جانب سے ایک لعل موصول ھوا جس کی قیمت ۷۵ ھزار روپے متعین کی گئی - جہانگیر نے اس سے اختلاف کیا اور اس کی قیمت ۶۰ ھزار متعین کی -

تزک - ۱۳ سنہ جلوس - صفحہ ۲۴۴ -

کوکڑہ (بہار) کی کان کے سے ایک عدد الماس ملا تھا - جسے سرکاری الماس تراشوں نے تراشا تھا - اس کی قیمت ۳ ھزار روپے متعین ھوئی اور ماھرین کی رائے یہ ھوئی کہ اگر وہ الماس ذرا اور سفید ھوتا تو اس کی قیمت ۲۰ ھزار روپے ھوتی -

تزک - ۱۱ سنہ جلوس - صفحہ ۱۰۵ -

خان جہاں کا پیش کردہ ایک خنجر جس کی مالیت پچاس ھزار روپے متعین ھوئی -

تزک - ۱۲ سنہ جلوس - صفحہ ۱۹۳ -

ایک الماس جسے ایک فرنگی فروخت کرنے کے لیے لایا تھا۔ اس نے اس کے لیے دو لاکھ روپے طلب کیے۔ دربار کے جوہریوں نے اس کی قیمت کا تخمینہ اسی ہزار روپے کیا۔ اس لیے وہ فروخت نہیں ہوا۔ مہابت خاں نے اسے برھان پور میں ایک لاکھ روپے میں خریدا اور بادشاہ کی نذر کر دیا۔

لاھوری - ۱۹ سنہ جلوس - صفحہ ۶۰۷ -

شاہ جہاں کے خریدے ہوئے ۶ گھوڑے، جن کی مالیت کا اندازہ ۲۰ ہزار روپے کیا گیا۔ ان میں سے ایک گھوڑے کی قیمت کا تخمینہ ۱۰ ہزار روپے کیا گیا۔

لاھوری - ۱۹ سنہ جلوس - صفحہ ۴۸۰ -

شائستہ خاں کا نذر کردہ ایک ھیرا، وزنی ۱۱۶ رتی، قیمتی ایک لاکھ روپیہ سرکاری کارگاہ میں تراش کر پالش کیا گیا۔ جس کے بعد اس کا وزن ۱۰۰ رتی رہ گیا۔

تیار مال کی نمائش

جب دارالحکومت یا صوبائی کارخانوں میں تیار کیا ہوا یا باھر سے خریدا ہوا قیمتی سامان، بموجب دستور بادشاہ کے حضور دربار میں بغرض نمائش پیش ہوتا، تو بادشاہ کی مداخلت اور زیادہ ہو جاتی اور وہ معمول سے زیادہ توجہ کے ساتھ ان چیزوں کا معائنہ کرتا۔ ایسے اسلحۂ جنگ اور ہر ایسا سامان تعیش یا دیگر مفید سامان جس کے متعلق یہ توقع ہوتی کہ وہ اپنی اھمیت یا کمال صناعی کی بنا پر بادشاہ کی دلچسپی کا موجب ہوگا، اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ اس طریقۂ کار سے نہ صرف ملک کی صنعت اور کمال صناعی کے نمونے بادشاہ کے علم میں آجاتے بلکہ وہ

متعلقہ دست کار سے بھی واقف ہو جاتا تھا کیونکہ اسے بھی حضور شاہی میں پیش کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح ہر کامیابی پر تعریف و تحسین کا سہرا صرف محکمۂ متعلقہ اور اس کے اعلیٰ عہدہ داروں ھی کے سر نہیں بندھ جاتا تھا بلکہ دستکار بھی اس کے مستحق قرار پاتے اور انھیں بعض اوقات جدید طرز اختراع کرنے، ھنر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنے اور غیر معمولی صناعی پر اتنا انعام و کرام دیا جاتا کہ وہ مالا مال ہو جاتے تھے۔

اس طرح محکمے پر بادشاہ کی نگرانی و نگراں کاری کا وہ سلسلہ ختم ہوتا جو اس کی مالیات سے لیکر اس کے اندرونی کاروبار اور تیار کئے ہوئے سامان تک پھیلا ہوا تھا۔

بادشاہ کی ذاتی توجہ

جہانگیر کے عہد حکومت میں مختلف قسم کی چیزوں کی قدردانی اور دستکاروں کو انعام و اکرام دئے جانے کی یوں تو متعدد مثالیں موجود ھیں، لیکن ممتاز ترین مثال ایک خنجر کی ھے جس کا قبضہ ابلق دندان ماھی کا بنا ھوا تھا۔ اس قسم کا ایک خنجر شاہ عباس نے جہانگیر کے پاس بھیجا تھا۔ اسے دیکھ کر جہانگیر کو ایک دھن سوار ھو گئی چنانچہ تمام ملک میں اسی قسم اور اسی رنگ کے دندان ماھی کی تلاش کی گئی ھے۔ اس سلسلے میں جہانگیر لکھتا ھے:

”میں نے متعدد ھوشیار اشخاص مقرر کیے تاکہ وہ ایران اور توران جائیں۔ وھاں ان کی تلاش کریں اور جہاں سے، جس شخص کے پاس سے، جس طرح اور جس قیمت پر ملیں لے

کر آئیں"۔ اتفاق سے ایک عدد نہایت خوبصورت اور نازک شہر آگرے ہی میں مل گیا جسے بہت معمولی قیمت پر خرید لیا گیا اور سرکاری کارخانوں کے دستکار کو قبضے تیار کرنے کا کام سونپا گیا۔ جہانگیر نے اپنے دستکاروں، ان کی کاریگری اور اس موقع پر انہیں جو انعام دیا گیا سب کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔

"میں نے استاد پورن اور استاد کلیان کو جو 'خاتم بندی' میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اس طرز کے قبضہ ہائے خنجر تیار کرنے کا حکم دیا جسے اس وقت میں نے پسند کیا تھا اور جو بعد میں جہانگیری طرز کے قبضے کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی وقت خنجر کا پھل، اس کا نیام اور اس کے تسمے بنانے کا کام ایسے ہوشیار کاریگروں کے سپرد کیا گیا جن میں سے ہر ایک یگانۂ روزگار تھا۔ حقیقت میں یہ تمام کام میری مرضی کے مطابق اچھی طرح انجام پائے۔ ایک دستہ ایسا تیار ہوا جسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس میں ساتوں رنگ نظر آتے تھے اور بعض پھول تو ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی ہوشیار نقاش نے انہیں سیاہ خطوط میں اپنے بدایع نگار قلم سے بنایا ہو۔ غرض کہ وہ بے انتہا نفیس ہے اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ وہ ایک لحظہ بھی مجھ سے الگ رہے۔ اپنے خزانے کی تمام گرانبہا اشیاء میں اس دستے کو سب سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں۔۔۔۔ ان استادوں کو جنھوں نے اپنے ہنر کا بہترین نمونہ پیش کیا

تھا اور اس کی تیاری میں انتہائی محنت کی تھی ، انعام و اکرام دیا گیا ۔ استاد پورن کو ایک ھاتھی، خلعت فاخرہ اور کلائی میں پہننے کے لئے ایک طلائی کڑا دیا گیا اور کلیان کو خطاب ''عجائب دست'' ، ترقئی منصب ، خلعت فاخرہ اور ایک مرصع پہنچی دی گئی۔ اسی طرح ہر شخص کو اپنے اپنے حالات اور ھنر کے مطابق انعام و اکرام کا حصہ ملا''۔[۱]

جس طرح جہانگیر کو قیمتی جواھرات کا بے انتہا شوق تھا جس کا ذکر اس کے دربار میں آنے والے ہر یورپین سیاح نے کیا ھے اسی طرح وہ مصوری کا ذوق بھی رکھتا تھا۔ اپنے صناعوں کے تیار کردہ سامان کو جانچنے کی جو دستگاہ اسے حاصل تھی اسے وہ اپنے ھی الفاظ میں یوں بیان کرتا ھے۔ ''مصور ابوالحسن نے جسے خطاب ''نادر الزمان'' دے کر نوازا گیا ھے، میری تخت نشینی کی تصویر دیباچۂ ''جہانگیر نامہ'' کے لئے بنائی اور اسے میرے پاس لایا ، چونکہ وہ انتہائی تحسین و آفرین کے قابل ھے اس پر بے انتہا نوازشیں ھوئیں۔ اس کا کام معیاری تھا اور اس کی تصویر موجودہ زمانے کے شاہ کاروں میں ھے ۔

''۔۔۔۔۔۔ اگر اس زمانے میں عبدالحی اور بہزاد جیسے اساتذۂ فن زندہ ھوتے تو اس کے کام کی پوری پوری داد دیتے ۔۔۔۔۔ میں نے ابتدا سے آج تک ھمیشہ اس کی تربیت

---

۱ - تزک ، ۱۴ سنہ جلوس، صفحہ ۲۷۶ - روجرز، جلد دوم ، صفحات ۹۸ و ۹۹ ۔

کی حتیٰ کہ اس کے فن نے یہ درجہ حاصل کر لیا۔ اب وہ واقعی 'نادرالزمان' بن گیا ہے ---- میرے متعلق یہ ہے کہ مصوری کے شوق اور تصاویر کو جانچنے کی مشق میں اب اتنی ترقی ہو گئی ہے کہ جب میرے سامنے کوئی کام لایا جاتا ہے خواہ وہ گذشتہ فن کاروں کا ہو خواہ موجودہ کا میں ان کا نام دریافت کیے بغیر فوراً یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ کام فلاں فلاں شخص کا ہے اور اگر کوئی تصویر ایسی ہو جس میں متعدد اشخاص کے چہرے بنے ہوں اور ہر چہرہ کسی دوسرے مصور کا بنایا ہوا ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ کون سا چہرہ کس مصور نے بنایا ہے۔ اگر کسی چہرے میں چشم و ابرو کسی دوسرے شخص کی بنائی ہوئی ہوں تو میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ اصل چہرہ کس نے تیار کیا تھا اور اس میں چشم و ابرو کس نے بنائی ہیں''۔[۱]

آخر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس عہد کی تاریخ میں جا بجا بڑی مقدار میں ایسا مواد موجود ہے جس کی مدد سے باسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ مذکورہ تینوں شہنشاہوں

---

۱ - تزک ، صفحہ ۲۳۵ - روجرز ، جلد دوم ، صفحات ۲۰ و ۲۱ -

روجرز - صفحات ۱۱۶ و ۱۱۷ - بشن داس مصور کو شاہی سفیر خان عالم کے ساتھ ایران بھیجا گیا تا کہ بادشاہ اور دیگر عمائد سلطنت کی تصاویر تیار کرے - اس کے کام کا ذکر صفحہ ۱۱۷ پر کیا گیا ہے اور اس نے جو تصویریں بادشاہ کی بنائیں ان کی بہت تعریف کی گئی - شبیہہ تیار کرنے میں بشن داس یگانۂ روزگار کہا گیا ہے - اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا گیا -

کے دور میں کس صنعت نے رفتہ رفتہ کتنی ترقی کی۔ اکبر نے اپنے کارخانہ جات کی جانب کتنی توجہ کی، کس طرح اس نے مختلف ممالک سے دستکاروں کو بلوا کر اپنے ہاں ملازم رکھا اور کس طرح اس نے مقامی اشخاص کو ہر فن میں تربیت دلوائی، یہ سب باتیں ہر صنعت کے تحت آئین میں مذکور ہیں اور ان کا ذکر فادر مانسریٹ نے بھی کیا ہے۔[1]

بقیہ حاشیہ ما قبل

رو - صفحات ۱۹۶ - ۲۰۱ - نقاشی اور مصوری کے متعلق جہانگیر کے ذوق کا ذکر کرتا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی نذر کردہ ایک تصویر کی چھ نقلیں اسی روز اسے (رو کو) دکھا دی گئیں۔ یہ نقلیں درباری مصوروں نے تیار کی تھیں اور اس کے لیے یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ ان میں اس کی نذر کردہ تصویر کون سی ہے۔

ھا کنز - صفحات - ۱۱۱ - ۱۱۲ - لکھتا ہے کہ جہانگیر کو جواہرات کا حد سے زیادہ شوق تھا۔

۱ - مانسریٹ - صفحہ ۳۶ - کثیرالتعداد دستکاروں، آہن گروں اور زرگروں کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے (صفحہ ۲۰۱) کہ کارخانہ جات سے اکبر کو انتہائی دلچسپی تھی یہاں تک کہ وہ بذات خود ان کا معائنہ کرتا بلکہ کبھی کبھی خود اپنے ہاتھ سے کام بھی کیا کرتا تھا۔

مانسریٹ - صفحہ ۲۰۷ - تجارت میں اکبر کا حصہ لینا۔

مانسریٹ - صفحات ۱۹۵ - ۲۶۰ - بہ لحاظ صناعی و دستکاری، یورپ اور ہندوستان میں لاھور کا جواب نہیں۔

پلسائرٹ - صفحات ۱۹ اور ۲۶ - ۲۸ - بیان کرتا ہے کہ جہانگیر کے دور حکومت میں انواع و اقسام کی چیزوں کی کتنی مانگ تھی۔ ایسی قالینوں کا ذکر کرتا ہے، جن پر ریشمی اور طلائی کام کیا جاتا تھا۔ چین کے ریشم کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔

مثلاً صنعت شال سازی کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے۔ "پہلے بعض اوقات کشمیر سے شالیں لائی جاتی تھیں۔ اب اعلیٰ درجے اور ادنیٰ درجے کے لوگ سب شالیں استعمال کرتے ہیں۔ کشمیر کی اس صنعت کو فروغ حاصل ہوا اور اسے نئی زندگی ملی۔ صرف لاہور میں ایک ہزار سے زیادہ کارخانے موجود ہیں"۔ [قیمتیں ۱۰۰ اشرفیوں (ایک ہزار پچاس روپے) سے لے کر چھ روپے فی شال تک تھیں]

جہانگیر اور شاہ جہاں سرپرستی فرماتے رہے۔ آخرالذکر بادشاہ کی حکومت کا وقائع نگار لکھتا ہے۔ "کشمیر اور لاہور کی صنعت قالین سازی یہاں تک ترقی کر چکی ہے کہ اب وہاں اونی قالینیں ۱۰۰ روپے گز کے حساب سے تیار ہوتی ہیں اور جن کے سامنے وہ اونی قالینیں جو شاہ ایران کے کارخانوں میں تیار کی جاتی ہیں بوریا معلوم ہوتی ہیں۔ آج کل تمام شاہی عمارتوں کی ڈیوڑھیوں میں یہی اونی قالینیں استعمال کی جاتی ہیں"۔[1]

عہد حکومت شاہ جہانی کا ایک واقعہ خیر خیرات سے متعلق ہے جس سے محض اتفاقیہ طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ملکی صنعت پر شاہ جہاں کی کتنی توجہ تھی اور وہ کس طرح اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اپنی تخت نشینی سے قبل اور دوسری بار اپنی عزیز بیٹی بیگم صاحب کی علالت کے دوران میں، اس نے منت مانی

۱۔ لاہوری، جلد اول، صفحہ ۴۴۸۔

تھی کہ وہ لاکھ روپے مکہ معظمہ بھیجے گا۔ جب وہ تخت نشین ہوا اور اسی طرح جب اس کی بیٹی کو صحت نصیب ہوئی، اس نے منت پوری کی۔ لیکن اکبر اور جہانگیر کی طرح اس نے رقم نہیں بھیجی۔ بلکہ یہ حکم دیا کہ اس قیمت کا مال احمد آباد میں خرید کر حجاز میں فروخت کیا جائے۔ اس طرح جو رقم مع منافع وصول ہو وہ وہاں بطور خیرات حسب ہدایات تقسیم کی جائے۔[۱]

غرضکہ مرکزی حکومت کے نظام کارخانہ جات کا فائدہ نہ صرف یہ تھا کہ حکومت کو جن اشیاء کی ضرورت ہوتی وہ ان کارخانوں میں سستے داموں تیار ہو جاتی تھیں بلکہ اس سے ملک کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور انہیں فروغ بھی حاصل ہوتا تھا۔ وہ اعلیٰ کام جو سرکاری کارگاہوں میں کیا جاتا اور وہ چیزیں جو وہاں تیار ہوتی تھیں وہ یقیناً مقامی دستکاروں کے لیے نمونے کا کام دیتی

بقیہ حاشیہ ما قبل

صالح - (صفحہ ۵۱۵) اس کی قیمت ۹۰ روپیہ گز بتاتا ہے۔

۱ - دونوں مواقع پر رقم متعدد اقساط میں بھیجی گئی - لیکن احمد آباد اور سورت سے مال خریدنے کے احکام ہر موقع پر دیے گئے - (۱) ۴ سنہ جلوس لاہوری، صفحہ ۴۰۷ - (۲) ۱۰ سنہ جلوس، جلد دوم، صفحہ ۲۸۱ - (۳) ۱۶ سنہ جلوس، جلد دوم، صفحہ ۳۱۰ - (۴) ۱۸ سنہ جلوس، صالح صفحہ ۴۰۶ - (۵) ۲۱ سنہ جلوس، صفحہ ۳۳۱ - (۶) ۲۴ سنہ جلوس، صفحہ ۴۴۳ -

آخری دو حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ تمام گذشتہ مواقع پر، ان چیزوں کی فروخت سے ۵۰ فی صد منافع حاصل ہوا تھا۔

ہونگی اور ان نمونوں سے انھیں بہتر قسم کی نئی نئی طرزیں معلوم ہو جاتی ہوں گی۔

شاہ جہان کے عہد حکومت کے میر سامانوں کی مندرجۂ ذیل فہرست سے اس اہمیت کا پتا چلتا ہے جو میر سامان کا عہدہ اس وقت تک حاصل کر چکا تھا۔

نام	منصب	
علامی افضل خان	۴ ہزار ذات	۲ ہزار سوار
میر جملہ	۴ ہزار ذات	۲۰۰۰ سوار
عاقل خان	۲ ہزار ذات	۵۰۰ سوار
سعداللہ خان	۳ ہزار ذات	۵۰۰ سوار
عاقل خان (دوسری مرتبہ)	۲۵۰۰ ذات	۸۰۰ سوار
ملا علاء الملک بعد میں فاضل خان	۱۵۰۰ ذات	۵۰۰ سوار
ترقی کرکے اس کا منصب	۳۰۰۰ ذات	۸۰۰ سوار تک پہنچا۔

باب ہشتم

صدر

خاکہ

ابتدائیہ : مملکت اسلامی میں صدر کی حیثیت ۔ الماوردی ، ابن خلدون ، نظام الملک (سیاست نامہ)۔

مخطوطات : آداب سلطنت ، ذخیرۃ الملوک ، سلوک الملوک ۔

مملکت اور بادشاہ کے لیے صدر کا وجود ناگزیر ہے ۔ نمائندہ علما ۔ شریعت اسلامی میں سب سے بڑی سند ۔

فرائض صدر : اکبر کے ابتدائی دور حکومت میں صدر کو ممتاز حیثیت حاصل تھی ۔ صدور کی بے ضابطگیوں کی وجہ سے اکبر کی حکمت عملی اور اس کے رویے میں تبدیلی ۔ ان پر نگرانی اور ان کے اختیارات میں تخفیف ۔

ضوابط : اراضی اور وظائف محکمہ کے مستحق اشخاص ۔ عہدۂ صدر پر تقرر کی ضروری شرائط ۔ ضوابط کا تجزیہ ۔ رفاہی اغراض کے لیے اراضی عطا کرنے کے طریقے میں اصلاحات ۔ اکبر کے دور حکومت میں ان اصلاحات پر کس طرح عملدرآمد ہوا ۔

محکمۂ صدر : کام کس طرح ہوتا تھا ۔ اراضی عطا کرنے کا کیا طریقہ تھا ۔ دیوان سلطنت کے ساتھ تعلقات ۔ اصلاحات اور ان کے بعد ۔ اکبر کے دور حکومت میں عطیات کی اہم خصوصیات

کیا تھیں - صدر کی حیثیت اور علماء - ان کی کارکردگی - بد دیانتی کی صرف ایک مثال -

جہانگیر: اس کا طرز عمل - صدر کی ترقی - غریبوں کو اکثر اراضی عطا کرنا لیکن صدر کو دوبارہ اختیارات نہ دینا - اس کے اختیارات کے متعلق متضاد جملوں کا تجزیہ -

شاہ جہاں: اکبر سے زیادہ فیاض اور جہانگیر سے زیادہ قاعدہ پسند - بحیثیت مجموعی اراضی عطا کرنے میں بہت محتاط - دستاویزوں میں بہت کم ذکر - نقد رقم خیرات کرنے کی مثالیں تعداد میں نسبتہً زیادہ اور تقسیم میں زیادہ باقاعدگی - بے ضابطگی کی ایک مثال - صدر کی معزولی - تحقیقات اور عطیات کے فرمانوں کی تجدید - حکم تحقیقات کا تجزیہ - اس سے ماخوذ نتائج اور انتظامی نقطۂ نظر سے بیانات کی توضیح - مذکورہ مثال سے شاہ جہاں کے عہد حکومت کے عطیات کی کیا کیا خصوصیات معلوم ہوتی ہیں - عطیات کی زیادہ سے زیادہ تعداد -

مستثنیات: دیگر قسم کی خیراتیں - محتاج خانے - کھانا تقسیم کرنا، داد و دھش بصورت نقد - مثالیں -

مذکورہ خیراتی و رفاھی امور کی اھم خصوصیات اور انکا محدود فائدہ -
عہد مذکور کے ممتاز صدور کی فہرست -

مسلم فقہا کی رائے میں کسی مملکت کے وجود اور بادشاہی کے قیام کی ضرورت اس لیے ہے کہ رعایا اور شریعت اسلامیہ کی حفاظت ہو سکے - ایک مسلم بادشاہ سے صرف یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ خود حقیقی معنٰی میں مسلمان ہو بلکہ یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ اس کی رعایا میں تمام دوسرے مسلمان بھی صحیح معنٰی میں مسلمان بنیں اور اسلام و شریعت اسلامیہ کی عظمت برقرار رہے -[۱]

شریعت اسلامیہ کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی قانون مملکت میں رائج کیا جائے اور تمام امور نیز سلطنت کی تنظیم اسی کی بنیاد پر کی جائے- بادشاہ کے وجود کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ مذکورہ قوانین کو نافذ کرے اور اس کے جملہ احکام اسی کے مطابق ہونے چاہئیں - وہ بادشاہ جو اس معیار پر پورا اترتا ہے اور جس کے افعال و اعمال اس نصب العین کے مطابق ہوتے ہیں، ''حاکم عادل'' کہلاتا ہے اور صرف اسی درجے پر فائز ہو کر وہ اپنی مسلم رعایا کی فرمانبرداری کا مستحق بن سکتا ہے -[۲]

---

۱ - الماوردی - فرانسیسی ترجمہ ، صفحہ ۹۰ -

ابن خلدون - ترجمہ صفحہ ۹۰ - حصہ دوم - تحفظ و عدل سب کے لیے -

آداب سلطنت - فارسی متن ، صفحات ۱۱-۱۲ - بادشاہ پر لازم ہے کہ وہ اپنی دولت کو حصار مذہب کے اندر محفوظ رکھے اور خدا کی اس نعمت کی حفاظت شکرے کے ذریعے کرے - پہلی بات احکام خداوندی کی بجا آوری سے اور دوسری بات اپنی رعایا کے لیے آرام و خوشحالی کے اسباب مہیا کرنے سے حاصل ہوتی ہے -

۲ - آداب سلطنت - صفحہ ۱۶ ، شاہی حکم کی بنیاد فرمان خداوندی پر قائم ہونی چاہیے -

شریعت اسلامیہ کے تحفظ کے دو پہلو ہیں ، احکام شریعت کی تبلیغ اور ملک میں ان احکام کو قانون کی حیثیت سے نافذ کرنا۔ ایک کا مطلب ایسے اشخاص کے ایک طبقے کو برقرار رکھنا ہے جو احکام شرعی کے مطالعے ، ان کی تعلیم اور نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف رہیں اور دوسرے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں علماء میں سے ایک ایسے شخص کو جو علم و فضل اور تقوے میں ممتاز حیثیت رکھتا ہو بادشاہ کا مشیر مقرر کیا جائے تا کہ اس کے مشورے سے بادشاہ اپنے فرائض ملکی انجام دے سکے۔ اول الذکر طبقے کے افراد ''علما'' کہلاتے ہیں اور ان میں سے جو عالم منتخب کیا جاتا ہے اسے ''شیخ الاسلام'' کہتے ہیں۔

سلطنت دھلی کے دور میں اس لفظ کا استعمال زیادہ احتیاط اور قطعیت کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ عہدۂ مذکور کا ذکر مختلف ناموں مثلاً ''شیخ الاسلام'' قاضی القضاۃ اور صدر کے تحت کیا گیا ہے۔

مولف سلوک الملوک ، مملکت میں عہدۂ مذکور کے مقام کی بحث کرتے ہوئے لفظ 'شیخ الاسلام' استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ علمائے اسلام میں سے جو شخص اپنے علم و فضل اور تقوے کی بناء پر منتخب کیا جاتا وہ اس نام سے یاد کیا جاتا تھا اور وہ اپنے

بقیہ حاشیہ ما قبل

ذخیرۃ الملوک۔ صفحہ ۸۹، اس کے متعلق کہ بادشاہ حاکم عادل ہوتا ہے۔ م۔ا ۲۵٦ (نظام الملک) ، ورق ۵۳ ، سلطان عادل کی فرمانبرداری کے بارے میں۔ سیاست نامہ ، صفحہ ۵۴ ، اس کے متعلق کہ شریعت اسلامیہ کو برقرار رکھنا اور اپنے احکام اسی پر مبنی کرنا ، نیز طلبائے شریعت اسلامیہ کی کفالت اور ان کا احترام برقرار رکھنا ، بادشاہ کے فرائض ہیں۔

کمالات علمی اور عہدۂ جلیلہ کے پیش نظر مملکت کا ہادی برحق، پیشوائے دین یا شیخ الاسلام سمجھا جاتا تھا۔ خود علمائے دین اس کے لیے یہی لفظ استعمال کرتے تھے۔

بادشاہ وقتاً فوقتاً علما کی ایک جماعت کو بھی طلب[1] کیا کرتے تھے جن سے وہ اہم امور کے متعلق مشورہ کرتے تھے۔ صلاح و مشورہ کے لیے اس طرح جو علماء طلب کیے جاتے تھے وہ صدور کہلاتے تھے اور جو عالم مستقل ملازمت میں رہتا تھا صدر کہلاتا تھا۔ اس طرح صدر شیخ الاسلام کا مترادف بن جاتا ہے اور اصطلاحاً اسے ان علماء کا نمائندہ یا سردار کہا جا سکتا ہے جو مملکت میں ہوتے تھے اور بادشاہ کی مجلس میں مشورے کے لیے طلب کیے جاتے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے لفظ صدرالصدور جسے مغلوں نے استعمال کیا بہت موزوں تھا۔

صدر کی حیثیت

فقہائے اسلام کی رائے کے مطابق صدر بادشاہ اور رعایا کے درمیان ایک واسطہ، احکام شرعی کا علمبردار اور علما کا نقیب ہوتا ہے۔ وہ مملکت اور بادشاہ دونوں کے لیے ناگزیر ہے۔

بادشاہ پر لازم ہے کہ اس کا پورا پورا احترام کرے اور قانون و مذہب سے متعلقہ ہر امر میں اس سے مشورہ کرتا رہے۔

---

۱ - سیاست نامہ - صفحہ ۴۵، بادشاہ پر لازم ہے کہ وہ ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ علما کو طلب کرے، ان سے مذہب اور عدل کے اصولوں کے متعلق گفتگو کرے اور شاہان عادل کے حالات سنے۔

ایسے امور کے متعلق وہ جو مشورے دے اسے بادشاہ بے چون و چرا تسلیم کرلے -

مملکت کے تمام دیوانی اور فوجی عہدے داروں پر لازم ہے کہ وہ اس کے تمام ایسے احکام بجا لائیں جو وہ بحیثیت صدر جاری کرے - اگر کوئی شخص حتیٰ کہ کوئی امیر یا رکن سلطنت ذرا بھی مخالفت کرے تو بادشاہ کو چاہیے کہ اسے سزا دے تاکہ صدر کی حیثیت برقرار رہے اور رعایا کی نظر میں اس کا احترام زیادہ ہو جائے -

صدر کا وظیفہ اس طرح مقرر کیا جانا چاہیے کہ اسے دیوان، وزیر، یا مملکت کے کسی دوسرے عہدہ دار کو درخواست دینے کی ضرورت نہ پڑے -

فرائض صدر

صدر کو چاہیے کہ وہ علمائے مملکت پر کڑی نظر رکھے - اس امر کی بابت تحقیقات کرے کہ وہ معلم اور مدرس کے فرائض کس طرح انجام دیتے ہیں اور کس حد تک اس کے اہل ہیں - نیز مملکت میں جملہ علوم کی اشاعت پر پوری پوری نگرانی رکھے - غرض کہ اس معاملے میں ایک طرح احتساب پر عمل پیرا رہتے ہوئے اسے اساتذہ و طلبہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا چاہیے اور ایسے مضامین کی تعلیم کی حوصلہ افزائی نہ کرنی چاہیے جو مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں خلل اندازی کا باعث ہوں، بلکہ ضروری ہو تو ایسے مضامین کی تعلیم ممنوع قرار دے دینی چاہیے -

اس پر لازم ہے کہ وہ دیانت دار اور قابل اساتذہ کی، نیز ذہین اور ہونہار طلباء کی ہمت افزائی کرے اور انہیں مناسب انعام دے۔

اسی طبقۂ اساتذہ و طلبہ میں سے قاضی اور مفتی مقرر ہونے چاہییں۔ انہیں میں سے مستحق افراد کے لیے بادشاہ سے وظائف اور اراضی عطا کرنے کی سفارش کرنی چاہیے۔

''اگر بادشاہ ایسا شیخ الاسلام مقرر کرے اور وہ بھی اپنے فرائض اس طور پر انجام دے کہ اسلام کا وقار اور شریعت کا احترام بڑھ جائے اور علم شریعت کو فروغ حاصل ہوسکے تو کہا جاسکتا ہے کہ بادشاہ نے تحفظ شریعت کا فرض ادا کردیا''۔[1]

مملکت میں اس کی حیثیت سے اس کی سرگرمیوں کے حدود اور فرائض کی نوعیت و وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ فرائض تین تھے:-

۱- ممتاز ترین عالم دین اور مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے وہ رعایا کی تعلیم اور ان کے خیالات و اخلاق کا محاسب ہوتا تھا۔ یہی وہ حیثیت تھی جس کے باعث اس کے اختیارات کا دائرہ بے حد وسیع تھا اور اس کا ہاتھ مملکت میں ہر شخص تک پہنچ سکتا تھا۔ اس حیثیت میں وہ علمائے مملکت کا نمائندہ ہوتا تھا اور بادشاہ کے علم میں ہر ایسی

۱- سلوک الملوک، صفحات ۲۱-۲۳

بات لا سکتا تھا جسے وہ اپنے مذہب کے لئے نقصان دہ یا مضرت رساں سمجھتا۔ اس سلسلے میں جو مشورہ وہ بادشاہ کو دیتا اس کو عملی جامہ پہنانے میں بادشاہ کی مرضی کو بہت کم دخل ہوتا تھا۔

۲۔ چونکہ ملکی قانون کی بنیاد اسلامی قانون پر قائم تھی، وہ رفتہ رفتہ محکمۂ قضا کا صدر بن گیا اور اس حیثیت میں وہی مملکت کے قاضیوں اور مفتیوں کا تقرر کرتا اور دیکھتا کہ یہ لوگ اپنے فرائض بوجہ احسن ادا کر رہے ہیں۔ اس حیثیت میں وہ تمام علماء و فضلا اور شرع اسلامی کے طلبہ سے ربط و ضبط رکھتا تھا تا کہ محکمے کے لئے موزوں اشخاص برابر ملتے رہیں۔ اس بات نے اس کے اختیارات میں اضافہ کیا اور اسے مملکت کے نظم و نسق میں ایک مخصوص حیثیت کا مالک بنا دیا۔

۳۔ شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے وہ بادشاہ اور رعایا کے درمیان ربط و ضبط کے سلسلے کی ایک خاص کڑی کی حیثیت رکھتا تھا اور اس حیثیت میں وہ ایسے علما و طلبہ کو، جو خدمت دین کے لیے وقف ہوتے، مناسب وظائف دیے جانے کی سفارش کرتا تھا، تا کہ وہ حصول معاش کی فکر سے آزاد ہو جائیں۔ اسی طرح وہ سرکاری امداد کے مستحق دیگر اشخاص کی سفارش بھی بادشاہ سے کرتا تھا۔ اس وجہ سے دیوان مملکت کے ساتھ اسے سابقہ

پڑتا رهتا تها۔ اس طرح اس کا حلقۂ اثر اور بهی زیاده وسیع هو گیا تها۔

اکبر کے ابتدائی صدور

اکبر کی حکومت کے ابتدائی دور میں صدور کی حیثیت بے انتها اهم تهی- لیکن جهاں تک اس زمانے کی تاریخ اور نظم و نسق کا تعلق هے ان کی حیثیت صرف اس بات تک محدود معلوم هوتی هے که وه علماء اور دوسرے حاجتمندوں کو وظائف اور جاگیریں عطا کرنے کا اختیار رکهتے تهے۔

سلطنت دهلی کے دور میں اس بات کا کوئی ثبوت نهیں ملتا که صدر مملکت کو اس قسم کا اختیار حاصل تها۔ لیکن اکبر کے زمانۂ حکومت میں قطعی طور پر اسے یه اختیار حاصل تها۔ اس زمانے کے پهلے صدر، شیخ گدائی کے متعلق بدایوانی لکهتا هے که وه قدیم خاندانوں کی اراضی ضبط کر کے ان لوگوں کو بطور انعام دے دیا کرتا تها جو اس کی خوشامد کرتے اور اس کی خدمت میں حاضر رهتے تهے۔ اس کے برعکس قابل قدر اشخاص اور شریف خاندان هر طرح کی ذلت و خواری برداشت کرتے تهے[1]

اس کے جانشین خواجه محمد صالح هروی کو بهی یهی اختیار حاصل رها۔ حالانکه بدایونی کی رائے کے بموجب

---

۱ - بدایونی، جلد دوم، صفحه ۲۹ اور لوگ یه اشعار پڑھ کر اپنے دل کو سمجها لیا کرتے تهے -

گر فرو تر نشست خاقانی — نے اورا عیب نے ترا ادب است
می نه بینی که سورۂ اخلاص — زیر تبّت یدا ابی لهب است

عہد مذکور میں دیوان زیادہ با اثر تھا۔ [1] شیخ عبدالنبی کے تقرر کے سلسلے میں بھی اسی اختیار اور اسی فرض کی اہمیت جتائی گئی ہے۔ شیخ مذکور صدرالصدور مقرر کیے گئے، تاکہ وہ مظفر خاں (دیوان) کے مشورے سے "مدد معاش" منظور کریں۔ شیخ مذکور ایک جید عالم اور ممتاز فاضل تھے۔ نیز ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو علم و تقویٰ کے لیے مشہور تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیش رو کی طرح کمزور نہ تھے۔ انھوں نے بہت جلد اپنے اختیار سے پورا پورا کام لیا، اپنے عہدے بر مستقل ہوئے اور دیوان کی مداخلت سے جلد نجات حاصل کرلی۔ انھوں نے اپنے اختیارات کا آزادانہ استعمال کیا اور عریض و وسیع اراضی عطا کیں۔ بدایونی کہتا ہے کہ جو اراضی شیخ مذکور کے زمانے میں عطا کی گئیں اگر ان کا مقابلہ ہندوستان کے تمام سابق مسلمان حکمرانوں کی عطا کردہ اراضی سے کیا جائے تو اس کی عطا کردہ اراضی کا رقبہ یقیناً زیادہ نکلے گا۔ [2] اگرچہ یہ بیان مبالغہ آمیز ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس زمانے میں صدر کے کیا اختیارات تھے۔

شیخ مذکور اکبر کے عہد حکومت کا وہ آخری صدر تھا، جس نے اپنے اختیارات پوری طرح استعمال کیے اور جس کا کما حقہ،

---

۱ - بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۵۲

۲ - ابوالفضل اور بدایونی، دونوں کی رائے میں اس کا تقرر مظفر کی وجہ سے ہوا اور اس کے لیے وہ مظفر پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ بایزید کی رائے ہے کہ عبدالنبی کا تقرر اس کی فضیلت علمی کی وجہ سے ہوا (ورق ۱۳۰)

احترام ہوا۔ اس کے پیش رو صدور کی بے ضابطگیوں اور محکمہ مذکور کی انتظامی خرابیوں کی وجہ سے جب تفصیلی تحقیقات کی نوبت آئی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف صدر کے اختیارات کم کر دیے گئے بلکہ پورے طبقۂ علما پر اکبر کا اعتماد باقی نہ رہا۔

صدر کے اختیارات اور رفاہی اغراض کے لیے اراضی دینے کے ضوابط آئین کے باب سیورغال میں مذکور ہیں۔ ابوالفضل کہتا ہے:
"اعلیٰ حضرت بہ خیال پرورش عامہ مختلف طبقوں کے افراد کو وظائف مرحمت فرماتے ہیں..............وہ اس فعل کو عبادت الٰہی سمجھتے ہیں"۔[1]

اراضی اور وظائف پانے کا استحقاق

چار طبقوں کے لوگ اس قسم کی اراضی اور وظائف پانے کے مستحق متصور ہوتے تھے۔

۱۔ 'ایسے طالبان علم و حکمت جو مشاغل دنیوی سے دست کش ہو چکے ہوں اور طلب علم میں ہمہ تن مصروف ہوں'۔

۲۔ 'وہ اشخاص جو ریاضت شاقہ اور نفس کشی اختیار کر کے تارک الدنیا بن چکے ہوں'۔

۳۔ 'وہ جو غریب، معذور اور محتاج ہوں'۔

۴۔ 'ایسے شرفا و معززین جو علم سے بے بہرہ ہونے کے باعث کسب معاش سے محروم ہوں'[2]

۱۔ آئین۔ صفحہ ۱۹۸۔

۲۔ بلاخ من۔ صفحہ ۲۶۸

گزارے کے لیے جو نقد رقم دی جاتی تھی اسے ''وظیفہ'' کہتے تھے اور 'اراضی' کو ''ملک'' یا مدد ''معاش''۔

اوصاف صدر

''چونکہ (وظیفہ یا ملک) عطا کرنے سے پہلے اشخاص متعلقہ کے حالات کی تفتیش اور ان کی عرض داشتوں پر دیانت دارانہ غور و خوض ضروری ہے اس لیے اس عہدے پر کسی ایسے تجربہ کار اور نیک نیت آدمی کا تقرر کیا جاتا ہے جس کا مشرب صلح کل ہو اور جو سب سے یکساں مہربانی اور شیریں کلامی کا سلوک کر سکے۔ یہ عہدہ دار صدر کہلاتا ہے''۔[۱]

ضوابط مذکور کا تجزیہ

مذکورۂ بالا اقتباس کی عبارت قابل غور ہے :—

۱۔ اس کے بموجب فضیلت علمی اور تقوے کا ہونا ضروری نہ تھا جیسا کہ اسلامی قانون چاہتا ہے۔ صدر کا محض تجربہ کار اور دیانت دار ہونا ضروری تھا یعنی اس کے لیے صرف ایسا عہدہ دار ہونا چاہیے تھا جو حسن و خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکے۔

۲۔ اس کے بموجب عطا و بخشش کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ اب وہ علمائے اسلام اور مسلمانوں ہی تک محدود نہ رہی تھی بلکہ ہر مسلک و مشرب کے لوگ جو مذکورۂ بالا ضوابط کے تحت آ سکتے ہوں اس سے مستفید ہو سکتے تھے۔ لہٰذا صدر کے لیے ضروری تھا کہ وہ سب کے ساتھ مہربانی اور رواداری کا سلوک کرے۔

---

۲ - آئین ، صفحہ ۱۹۸ - سطور ۱۰۸ - بلاخ من ، صفحہ ۲۶۸ -

۳- اس کے بموجب صدر کو خود کوئی عطیہ منظور کرنے کا اختیار باقی نہ رہا۔ اس کا کام صرف یہ رہ گیا کہ وہ درخواست کنندگان کے حالات کے متعلق تحقیقات کرے۔ ابو الفضل کے الفاظ سے یہ صورت حال اور بھی واضح ہو جاتی ہے: "اعلیٰ حضرت کی ہدایت کے بموجب دربار کے ممتاز عہدہ داروں کا فرض ہے کہ وہ مستحقین کے معاملات اس کے سامنے پیش کریں۔ ان میں سے اکثر اشخاص کو مطلوبہ امداد عطا کی جاتی ہے"۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مستحقین کی عرضیاں خواہ صدر پیش کرتا خواہ دیگر عہدہ دار پیش کرتے لیکن فیصلہ خود بادشاہ کیا کرتا تھا۔

تحقیقات اور اصلاحات

مختلف قسم کی مسلسل بے ضابطگیوں اور اکبر کی حکمت عملی کی تدریجی نشو و نما کے ساتھ یہ طریقہ وجود میں آیا تھا۔ سب سے پہلے ان جاگیروں کے متعلق تحقیقات کی گئی جو شیخ عبد النبی کے تقرر سے پہلے لوگوں کے قبضے میں تھیں اور ان جاگیروں کو جو افغان چودھریوں کے قبضے میں تھیں خالصہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ صرف وہ جاگیریں باقی رہ گئیں جن کی تصدیق نئے صدر نے کر دی۔ جب تک شیخ عبد النبی کو بادشاہ کا اعتماد حاصل رہا وہ جاگیر عطا کرتا رہا بلکہ ایسے مسائل بھی جو بلند منصب امراء بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے تھے، اسی کے پاس بھیج دیے جاتے تھے۔ مولانا محمد امیر، ایک ممتاز عالم، جو شیراز سے آئے تھے، اکبر کے حضور میں پیش ہوئے۔ بادشاہ نے "آس اعلیٰ رائے کی بنا پر جس کا اظہار موصوف کے متعارفین نے کیا ان کی عزت افزائی کی

اور انھیں شہزادہ مراد کے ساتھ مرجع اہل سعادت ، شیخ عبدالنبی کے مکان پر بھیج دیا‘‘ -[۱] بدایونی اپنے دو تین ذاتی معاملات کا ذکر کرتا ہے جو بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے تھے اور جن کے متعلق اس سے کہا گیا تھا وہ شیخ سے رجوع کرے -[۲]

لیکن جب وہ اعتماد ختم ہو گیا تو اس کے اختیارات آہستہ آہستہ کم کر دیے گئے - سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا کہ وہ تمام اشخاص جنھیں پہلے پانچ سو بیگھے یا اس سے زیادہ اراضی عطا کی گئی تھی ازسر نو اس کی منظوری براہ راست بادشاہ سے حاصل کریں - کچھ عرصے بعد وہ تمام اشخاص جن کے پاس ایک سو بیگھے سے زیادہ اراضی تھی ، اپنی اراضی کے $\frac{3}{5}$ حصے سے محروم کر دیے گئے -[۳]

آخر میں میر فتح اللہ شیرازی کے عہد صدارت میں ، صدر کو قطعی طور پر صرف ۰ بیگھے تک اراضی دینے کا اختیار رہ گیا اور اس سے زیادہ اراضی عطا کرنے کے لیے سب سے پہلے بادشاہ کی منظوری حاصل کرنا لازمی قرار پایا - کچھ عرصے بعد ، میر صدر جہاں کے زمانۂ صدارت میں ایک سو بیگھے سے کم اراضی

---

۱ - بیورج ، صفحہ ۳۲۹ ، ۲۲ سنہ جلوس -

۲ - بدایونی ، جلد دوم ، صفحہ ۲۰۷ - رانا کے خلاف مہم سے اس کی واپسی (صفحہ ۲۳۷) - اجازت حج کی منسوخی (صفحہ ۲۵۱) -

۳ - آئین - صفحہ ۱۹۸ - اول الذکر موقع پر ایران و توران کی خواتین کو مستثنیٰ کر دیا گیا - لیکن چند روز بعد انھیں بھی حکم دیا گیا کہ ایک سو بیگھے سے زیادہ اراضی کے لیے از سر نو منظوری حاصل کر لیں -

کے عطیات کی بھی جانچ پڑتال کی گئی اور صدر کو حکم دیا گیا کہ وہ ابوالفضل کے مشورے سے ان میں ضروری تخفیف کردے۔[1]

اراضی عطا کرنے کے متعلق دیگر اصلاحات حسب ذیل کی گئیں :-

(الف) وہ لوگ جنھیں اراضی عطا ہوئی ہوں اور جو آپس میں ان کا تبادلہ چاہتے ہوں اپنی اراضی کے ایک چوتھائی حصے سے دست بردار ہو کر از سر نو منظوری حاصل کریں۔

(ب) ''اگر کسی شخص کے پاس 'سیور غال' کسی دوسرے شخص کی شرکت میں ہو اور فرمان میں یہ واضح نہ کیا گیا ہو کہ اس میں کس شخص کا کتنا حصہ ہے ، تو صدر کو چاہیے کہ شرکاء میں سے کسی کے انتقال کر جانے پر ، فوراً کسی مزید تحقیقات کے بغیر اس 'سیور غال' کو تقسیم کردے اور انتقال کر جانے والے شریک کا حصہ بحق سرکار ضبط کر لے اور اسے اس وقت تک کے لیے سرکاری زمین قرار دے دے جب تک اس کے ورثاء اصالتاً بادشاہ سے اس کے متعلق اپیل نہ کریں''۔

(ج) تمام 'سیور غال' ایسی ہونی چاہییں جن کا نصف حصہ زیر کاشت اور باقی نصف حصہ قابل کاشت ہو اور اگر پورے

---

۱ - آئین ـ صفحہ ۱۹۹ - بدایونی کہتا ہے کہ شیخ بذات خود کبھی کسی کو سو بیگھے سے زیادہ زمین نہیں دیتا تھا (صفحہ ۲۰۵) - ایک مرتبہ بدایونی کی شکایت پر اس نے کہا کہ اس کے زمانے میں اس کے (بدایونی کے) پاس سب سے زیادہ یعنی ایک ہزار بیگھے زمین ہے - (صفحہ ۲۰۷) -

قطعۂ ارض میں کاشت کی جاتی ہو تو کل رقبے کا ایک چوتھائی واپس لے لیا جائے۔

اس سلسلے میں اکبر نے جو کارروائیاں کیں وہ سب کی سب ان لوگوں کو نقصان پہنچانے والی نہ تھیں جنھیں سیور غال یا مدد معاش کے طور پر زمینیں عطا کی گئی تھیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ لوگوں کو زمینیں ایک جگہ پاس پاس نہیں دی گئی ہیں اور ان کمزور اشخاص کو جن کی زمینیں خالصہ یا منصب داروں کی جاگیروں کے قریب واقع ہیں، ناہنجار ستاتے ہیں تو اس نے حکم دیا کہ انھیں تمام زمینیں ایک ہی جگہ، جہاں وہ پسند کریں، عطا کی جائیں اور اس کے لیے بعض مواضع مخصوص کر دیے گئے۔ اس طرح کمزوروں کی حفاظت کا سامان کیا گیا۔[۱]

اسی طرح جب نئے انتظامات مکمل اور باقاعدہ ہو گئے تو ان لوگوں نے جن کے پاس سرکار کی عطا کردہ زمینیں تھیں، اس تمام چھان بین کے بعد یہ محسوس کر کے کہ اب کسی قسم کی گڑ بڑ نہ ہوگی، زمینوں کی حالت بہتر بنائی اور ان میں باغ لگائے۔ اس پر اگر حکام نے زیادہ محصول طلب کرنے کی کوشش کی تو انھیں جائز منافع میں مداخلت کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔[۲]

۱ - آئین۔ صفحہ ۱۹۹، اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۲۴۰ - اسی قسم کے ایک واقعے کا حوالہ دیا گیا ھے جو سکندر لودھی کے زمانے میں پیش آیا تھا۔

۲ - صفحۂ گزشتہ پر حاشیے کی عبارت دیکھیے۔ ایسا صرف باغات کے لیے ھوگا زمینوں کے لیے نہیں۔ جہانگیر فخریہ طور پر بیان کرتا ھے کہ ایسا محصول اس کے خاندان کے کسی بادشاہ نے نہیں لگایا تزک، صفحہ ۲۵۲ -

چھان بین کے دوران میں ، اول سے آخر تک ، اکبر نے محکمے کی اصلاح کرنے میں نہ صرف گہری دلچسپی لی بلکہ کئی معاملات کی تحقیقات بھی خود ہی کی ۔ ابوالفضل نے ان کی کئی مثالیں بیان کی ھیں ، جن کا ذکر بدایونی نہیں کرتا ۔ لیکن ایک موقع پر وہ بھی کہتا ھے کہ ۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) میں بادشاہ نے اپنی قلمرو کے مختلف حصوں سے ممتاز و معروف مشائخ کو طلب فرمایا ۔ ھر ایک کو علحدہ علحدہ باریابی کا موقع دیا اور بعض سے بہت خوش ھوا ۔ لیکن انھوں نے خود ھی اپنا کام خراب کر لیا ۔ ان میں سے بعض نے خوشامد کی اور بعض نے زیادہ زمین کی طمع ظاھر کی جس کی وجہ سے اسے نفرت ھو گئی ۔ رفتہ رفتہ اسی کے باعث اس کے دل میں ان کی جانب سے بے اعتمادی پیدا ھو گئی اور وہ ان کی پوری جماعت کی طرف سے بد ظن ھو گیا ۔[۱]

لیکن جہاں نظم و نسق کے ھر شعبے میں اصلاح کی خواھش و کوشش کے لیے نیز دیانت دار اور اچھا کام کرنے والے افسروں کی تلاش پر اکبر کی تعریف کی جائے گی ، وھاں یہ بھی کہنا پڑے گا کہ پورے طبقۂ علما کو مذموم نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ ان علما کی زندگی ایک عام انحطاط اور زوال کے دور سے گزری تھی اور وہ بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے ، جو سلطنتوں کے زوال اور

---

۱ - بدایونی ، صفحہ ۲۸۵ ، نیز صفحہ ۲۷۸ ، مختلف مقامات کے علماء بلائے گئے اور ان سے گفتگو کی گئی - اکبر نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۲۳۴ - بہ نفس نفیس تحقیقات کرنا اور ۲۲ سنہ جلوس میں دورۂ پنجاب کے وقت بھی -

قوموں کے انحطاط کے زمانے میں بالعموم تمام افراد پر پڑا کرتے ھیں - پورا معاشرہ انھیں اثرات کا شکار تھا اور زندگی نیز حکومت کے ھر شعبے میں اسی قسم کے آثار انحطاط نظر آتے تھے - اگرچہ یہ امر قابل افسوس ھے کہ طبقۂ علما کی حالت دوسرے عام اشخاص کے مقابلے میں بہتر نہ ثابت ھوئی ، تاھم اس میں واقعی پر خلوص ، ذی علم اور متوکل علماء کا بالکل فقدان بھی نہ تھا - جن علماء کا حال قلمبند کیا گیا ھے وہ در اصل ایسے ھی گروہ سے تعلق رکھتے ھوں گے جن کی فطرت میں برائی ھوتی ھے اور جنھوں نے دربار شاھی تک پہنچنے اور حضور شاھی میں باریاب ھونے کے لیے اثرات و سفارشات کی مدد لی ھوگی - ظاھر ھے کہ علماء کی پوری جماعت محض انھیں پر مشتمل نہ تھی - بدایونی نے جہاں صدق دل سے ایسے تمام اشخاص کی مذمت کی ھے جو خود اس کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے ، وھیں وہ ایسے اشخاص کی مثالیں بھی پیش کرتا ھے ، جن کی قناعت پسندی کا شہرہ بادشاہ اور عوام کے کانوں تک پہنچا تھا - شیخ اللہ دیا خیر آبادی نے بادشاہ کا عطیہ کبھی قبول نہیں کیا - ان کے صاحبزادے شیخ ابوالفتح نے بھی اسی طرح وقار قائم رکھا - ایک صاحب کو جن کا نام مٹھی افغان کاسی تھا ، جب اکبر نے اپنے دربار میں طلب کیا تو موصوف نے حکم کی تعمیل کی لیکن فتحپور پہنچ کر یہ کہلا بھیجا کہ میں فرمان شاھی کے بموجب حاضر تو ھو گیا ھوں مگر یہ بات بھی اعلیٰ حضرت کے گوش گزار کر دینا ضروری سمجھتا ھوں کہ میری ملاقات کبھی کسی حکمران کے حق میں مبارک ثابت

نہیں ہوتی (مبارک نیامد)۔ لہذا اکبر نے انہیں مزید زحمت نہیں دی اور انہیں فوراً واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح جب شیخ ابوالفتح کو (جن کا ذکر اوپر ہوا) دربار میں طلب کیا گیا اور ان سے ایک سوال کیا گیا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ میں بہرا ہوں اور کچھ سن نہیں سکتا۔ اس طرح انہوں نے پیچھا چھڑایا اور انہیں رخصت کر دیا گیا۔[1]

محکمۂ صدر

مرکزی حکومت کے دوسرے محکموں کی طرح صدر کا محکمہ بہت بڑا نہیں معلوم ہوتا۔ آئین میں صرف ایک جگہ اتنا مذکور ہے کہ اہم فرائض کی بجا آوری کے لیے صدر کی مدد ایک ممتاز اہلکار بتکچی کرتا تھا۔ وہ مالی امور سر انجام دیتا تھا اور دیوان سعادت کہلاتا تھا۔ ایک دوسری جگہ، فرمانوں کی مسودہ نگاری کے سلسلے میں ابوالفضل نے 'دفتر دیوان سعادت' کا ذکر کیا ہے جس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید دوسرے دیوانوں کی طرح اس کا بھی باقاعدہ عملہ ہوتا تھا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مجموعی طور پر اس کی حیثیت دوسرے دیوانوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔[2]

وہ جملہ امور صدر کے احکام کے بموجب انجام دیتا تھا اور مدد معاش کے متعلق ہر حکم یا صداقت نامے پر، جو دفتر سے جاری کیا گیا ہو، صدر کی مہر ضروری تھی۔[3]

---

۱ - بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۲۸۶ - ان واقعات کا مطالعہ بھی کیا جائے جو ہفت اقلیم میں "لاہور" کے تحت مذکور ہیں۔

۲ - آئین - صفحات ۱۹۵ اور ۱۹۸

۳ - م - ت ۶۵۹۸

سیور غال کی اراضی عطا کرنے کا وہی طریقہ تھا جس پر منصب داروں کی تنخواہوں کے لیے جاگیریں عطا کرنے کے سلسلے میں عمل کیا جاتا تھا۔ جو اشخاص ان عطیوں کے مستحق سمجھے جاتے ان کا معاملہ بادشاہ کے سامنے صدر یا اہل دربار میں سے کوئی دوسرا شخص پیش کرتا تھا۔ صدر، مذکورہ نوعیت کے تمام معاملات نیز اپنے فرائض کے متعلق جملہ امور دیگر محکموں کے سربراہوں کی طرح دربار میں پیش کیا کرتا تھا۔ وہ تخت کے داہنی طرف کھڑا ہوتا تھا۔ شاہجہاں کے زمانے میں اسے یہ موقع بھی دیا جاتا تھا کہ وہ ایسے درخواست گزاروں کو غسل خانے میں پیش کرے جنھیں قلت وقت کے باعث دربار میں پیش نہ کر سکا ہو یا جن کی وہ بطور خاص بادشاہ سے سفارش کرنا چاہتا ہو۔ [1]

اس طرح جب بادشاہ معاملات کا فیصلہ کر چکتا تو ان کے متعلق مزید کارروائی معمول کے مطابق کی جاتی تھی۔ پہلے ان کا اندراج ''واقعہ نویس'' کے روز نامچے میں ہوتا تھا جو مرحلۂ اول سے گزرنے پر 'یادداشت' کہلاتے تھے۔ دوسرے مرحلے سے گزر جانے پر 'تعلیقہ' اور تیسرے سے گزر جانے پر 'سرخط' کہلاتے تھے۔ 'سر خط' دیوان کل کے دفتر میں فرمان کے مسودے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ مسودے کو مستوفی بہ نظر غائر دیکھتا اور اس پر دستخط کر کے اپنی

۱۔ ان کا ذکر م۔ت ۶۵۹۹ کے باب ۲ میں دیکھیے۔ تمام معاملات بادشاہ کے سامنے پیش ہونے چاہییں اور اس کے احکام کے بموجب کارروائی ہونا چاہیے۔ احکام پر عمل درآمد صدر کی مہر کے بعد کیا جائے۔

مہر لگاتا تھا۔ پھر وہ مسودہ دیوان سعادت کے دفتر کو بھیج دیا جاتا تھا۔ دیوان سعادت اس کا خلاصہ درج کرتا اور اس کے بعد اس پر صدر کے دستخط لیتا تھا۔ اس کے دستخط اور مہر کے بعد وہ دیوان کل کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ [1]

جو بھتے اور وظیفے اس محکمے کی معرفت بصورت نقد دیے جاتے تھے وہ بیگمات اور احدیوں کی تنخواہوں کی طرح دیے جاتے تھے۔ ان کے لیے پروانچے جاری کیے جاتے تھے تاکہ وصولی میں تاخیر اور تکلیف نہ ہو۔

صدر اور دیوان

صدر جتنے معاملات، بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا اور ان پر جو حکم بادشاہ دیتا، ان کی نقلیں، واقعہ نویس کے روز نامچے میں درج ہو جانے اور 'یادداشت' کی شکل اختیار کرلینے کے بعد دیوان کے دفتر کو ارسال کردی جاتی تھیں۔ [2]

جب 'یادداشت' ایک 'فرمان' کی صورت اختیار کر لیتی اور اس پر صدر کے دستخط ہو جاتے اور مہر لگا دی جاتی تو وہ دیوان کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔

اسی طرح دیوان وہ 'پروانچے' بھی وصول کرتا تھا، جو محکمۂ صدر کی معرفت ادا ہونے والی تنخواہوں کی بابت جاری کیے جاتے تھے۔

---

۲ - آئین۔ صفحات ۱۹۲ - ۱۹۵ - بلاخ من، صفحات ۲۵۸ -۲۶۳،
اسی طریقۂ کار کی تفصیل کے لئے باب ۳ دیکھیے۔

۱ - م ۔ ا ۔ نمبر ۱۶۴۱ اوراق ۳۶ - ۸۶ ب

اُن اشخاص کی فہرست بھی دیوان کے دفتر کو بھیجی جاتی تھی جن کے پاس معافی کی زمینیں ہوتی تھیں۔ اس فہرست کے ساتھ صدر کا محکمہ ایسی اطلاعات کا ایک نقشہ بھی تیار کرکے بھیجا کرتا تھا جن کا اس طرح بہم پہنچانا بموجب قواعد ضروری تھا۔[۱]

صوبوں کے صدروں کے پاس سے آئے ہوئے نقشوں کی طرز پر ایک نقشہ تیار کرکے صدرالصدور کے پاس بھیجا جاتا تھا جس میں دکھایا جاتا تھا کہ جن لوگوں کو 'مددمعاش' عطا ہوئی ہے ان کے پاس ہر پرگنے میں کتنی زمین ہے۔

پرگنے کی کل اراضی جو مذکورہ غرض سے عطا کی گئی	۵۵۰۰ بیگھے
سال میں بحق سرکا واپس لی گئی	۱۰۰ بیگھے
باقی	۵۴۰۰ بیگھے

۱۔ اس سلسلے میں کیقباد پارسی کو صوبۂ احمد آباد میں اراضی عطا کرنے سے متعلق ان دو فرمانوں کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا جنھیں جے۔ جے مودی نے اپنی تالیف "The Parsees at the court of Akbar" میں شائع کیا ہے اس سے آئین میں مذکور ایسی متعدد باتوں کی تصدیق ہوتی ہے جو مذکورہ نوعیت کے عطیات کے متعلق ہیں۔ مثلاً اراضی عطا کرنے کے سلسلے میں جس طریقۂ کار پر عملدرآمد ہوتا تھا، فرمانوں کا مسودہ اور وہ احکام جو مرکزی محکمہ صوبائی افسران کے نام جاری کرتا تھا۔ مذکورہ بالا معاملے میں پہلے عطیۂ متعلقہ دیگر عطیات کی طرح ایک تہائی کردیا گیا۔ لیکن اپیل کرنے پر ۴۸ سنہ جلوس اکبری میں ۳۰۰ بیگھے اراضی کا قدیم عطیہ بحال کردیا گیا۔ (فرمان، صفحات ۳۸ اور ۱۱۹ پر دیے گئے ہیں)

اکبر کے عہد حکومت میں عطا کی گئی ۲۱۰۰ بیگھے
جہانگیر کے عہد حکومت میں دی گئی ۲۱۰۰ بیگھے
شاہجہاں کے عہد حکومت میں دی گئی ۱۲۰۰ بیگھے

اصلاحات اور ان کے بعد

اکبر کی اصلاحات کے سلسلے میں سب سے پہلے وہ زمینیں واپس لی گئیں جن پر غیر مستحق اشخاص کا ناجائز قبضہ تھا۔ جن اشخاص کے قبضے میں پانچ سو بیگھے زمین یا اس سے زیادہ تھی سب سے پہلے ان کے متعلق تحقیقات کی گئی اور آخر میں سو بیگھے سے بھی کم زمین رکھنے والوں کے متعلق اس تحقیقات کی نوبت پہنچی۔ اس طرح تحقیقات کے بعد زمینیں واپس لے لینے کے متعلق ابوالفضل کچھ نہیں کہتا لیکن بدایونی نہایت زور و شور سے اس کا اعلان کرتا اور اپنے طور پر اسے مذموم قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اس نے تعداد کا کہیں ذکر نہیں کیا لیکن جس طرح وہ اس کے متعلق رائے زنی کرتا ہے اس سے خود بخود تعداد کا اندازہ ہو جاتا ہے اور صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اکبر کے دور حکومت میں کتنی زمین واپس لے لی گئی۔ وہ کہتا ہے کہ ۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) میں جبکہ بنگال و بہار کی سیاسی شورش قلمرو کے دوسرے حصوں تک بھی پھیل گئی تو علماء نے کہا کہ "بادشاہ ہماری مدد معاش کی زمینوں میں خلل انداز ہوا تھا اب خدا اس کے ملک میں خلل انداز ہوا ہے"۔[1]

۱۔ بدایونی۔ صفحہ ۳۴۳

اسی طرح عہدہ صدارت پر میر فتح اللہ کے تقرر کے متعلق وہ یوں رائے زنی کرتا ہے کہ اس صدارت کا درجہ 'سیاهه نویسی' سے کچھ زیادہ نہ تھا اور میر کو اس لیے اس پر فائز نہیں کیا گیا کہ وہ غریبوں کو زمینیں دے بلکہ اس لیے کیا گیا ہے کہ جو زمینیں ان کے پاس ہوں وہ بھی ان سے چھین لے۔ ۹۹۴ھ (۱۵۸۰ء) میں میر فتح اللہ کی غیر حاضری میں جسے دکن بھیج دیا گیا تھا، کمالائی شیرازی کو قائم مقام صدر بنایا گیا۔ اس کے متعلق بدایونی کا خیال ہے کہ یہ انتظام رہی سہی اراضی معافی بھی چھین لینے کے لیے کیا گیا ہے۔

دوسرا مقصد یہ تھا کہ محکمۂ مذکور اور آئندہ ''مدد معاش،، کی منظوریوں میں باقاعدگی پیدا ہو جائے۔ زمینیں عطا کرنے کے متعلق مسلسل تحقیقاتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر کے اختیارات بہت کم ہو گئے۔ شیخ عبدالنبی جتنی اراضی چاہتے دے سکتے تھے۔ لیکن میر فتح اللہ اعلیٰ حیثیت رکھنے اور مورد الطاف شاہی ہونے کے باوجود پانچ بیگھے زمین منظور کرنے کا اختیار بھی نہ رکھتا تھا[1]۔ اگرچہ یہ بیان مبالغے سے خالی نہیں ہے لیکن زیادہ خلاف حقیقت بھی نہیں ہے کیونکہ ابوالفضل کہتا ہے کہ میر فتح اللہ کے جانشین میر صدر جہاں کے زمانۂ صدارت میں صدر کو صرف ۱۵ بیگھے اراضی تک دینے کا اختیار تھا۔ اس سلسلے میں اکبر

---

۱ - بدایونی - صفحہ ۳۴۳

کا یہ آخری حکم تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کے اختتام تک یہی حکم نافذ رہا۔

اگرچہ زمینیں بڑے پیمانے پر واپس لے لی گئیں اور صدر کے اختیارات بھی کم کر دیے گئے لیکن یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ نئے عطیات قطعی موقوف ہو گئے۔ ۱۴ سنہ جلوس میں قاضی نور اللہ کا تقرر اس غرض سے ہوا کہ وہ صوبۂ آگرہ کی سیور غال اراضی کی حالت کے متعلق تحقیقات کرے اور ضرورت مندوں کو نئے عطیات دے[1]۔

صوبوں میں علحدہ علحدہ صدر کا تقرر

اس سلسلے میں اور صدر کے اختیارات کم کرنے کی غرض سے، دوسری اصلاح یہ کی گئی کہ تمام صوبوں میں الگ الگ صدر مقرر کیے گئے۔ فہرست تقررات سے پتا چلتا ہے کہ ان شرائط کا لحاظ نہیں رکھا گیا جو عہدۂ مذکور کے لیے ازروئے شرع ضروری تھیں۔ ابوالفضل کے الفاظ میں "وہ سب تجربہ کار اور نیک نیت اشخاص تھے"۔[2] ایس، ایم، ایڈورڈیز[3] (S. M. Edwardes) آنجہانی کہتا ہے کہ ۱۵۸۱ء

۱۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۱۳ے

۲۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۳۷۲، ۲۶ سنہ جلوس۔ دہلی، مالوہ اور گجرات۔ حکیم ابوالفتح؛ آگرہ، کالپی، اور کالنجر۔ شیخ ابوالفیض، فیضی؛ حاجی پور سے سارو تک۔ حکیم ہمام؛ بہار۔ حکیم علی؛ پنجاب۔ قاضی علی بدخشی؛ بنگال۔ حکیم عین الملک۔

۳۔ ایڈورڈیز اور گیرٹ کی 'مغلیہ حکومت ہند' (Mughal Rule in India) صفحہ ۱۷۴۔

میں اکبر نے صدر کا عہدہ بالکل ختم کر دیا اور اس کی جگہ چھ صوبائی صدر مقرر کیے۔ یہ بیان غلط ہے اور مولفین اس کے لیے کوئی سند نہیں پیش کرتے۔ صدر الصدور کا عہدہ اکبر کے دور حکومت میں شروع سے آخر تک برقرار رہا جیسا کہ ان کے ناموں کی منسلکہ فہرست سے ظاہر ہوتا ہے۔ صوبائی صدور کا تقرر اسی طرح محکمے کی تنظیم کے لیے عمل میں آیا تھا جس طرح صوبائی دیوان اور بخشی مقرر کیے گئے تھے۔ یہ انتظام، نظم و نسق کے ایک جزو کی حیثیت سے اکبر کے طویل زمانۂ حکومت میں شروع سے آخر تک برقرار رہا۔

کام میں باقاعدگی

معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا مقصد حاصل ہو گیا اور محکمے کے کام میں باقاعدگی پیدا ہو گئی۔ شیخ عبدالنبی کے زوال کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے دور حکومت کے باقی ماندہ ۲۷ سال میں (۱۵۷۸ء سے ۱۶۰۵ء تک) بادشاہ برابر بہ نفس نفیس نگرانی کرتا رہا۔ اس طویل مدت میں صرف ایک مثال بے قاعدگی کی ملتی ہے جس میں حاجی ابراھیم سرھندی، صدر صوبہ گجرات پر، ۲۸ سنہ جلوس میں بد دیانتی اور رشوت ستانی کا الزام لگایا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا، جرم صحیح ثابت ہوا اور اسے قید کی سزا دی گئی۔[1]

اگرچہ بدایونی اپنی کتاب کے اختتام تک زمینوں کی متواتر واپسی کی مذمت کرتا ہے، لیکن وہ بھی اس ایک

۱۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۴۰۸۔ بدایونی جلد دوم، صفحات ۲۷۷، ۲۷۸ اس کے بیان میں زیادہ قطعیت ہے۔

واقعے کے علاوہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ، بے قاعدگی کی کوئی مثال نہیں پیش کرتا۔

جہانگیر

میراں صدر جہاں ، اکبر کے آخری صدر کو جہانگیر بچپن سے جانتا تھا۔ زمانہ شاہزادگی میں ، جب کہ وہ شیخ عبدالنبی کے مکان پر حدیث شریف کا درس لینے جایا کرتا تھا ، میراں ، شیخ مذکور کی نائب کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھ جہانگیر کے تعلقات دوستانہ تھے اور ایک مرتبہ اس نے کہا تھا: ''اپنی تخت نشینی کے بعد میں آپ کا تمام حق ادا کر دونگا یا جو منصب آپ اس وقت طلب کریں گے میں آپ کو دونگا''۔ جہانگیر نے اپنا وعدہ پورا کیا اور صدر کو منصب کے انتخاب کا اختیار دیا۔ اس نے منصب چہار ہزاری طلب کیا جو اسے عطا کیا گیا۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ صدر سے بادشاہ کی دوستی اور اس پر شاہی لطف و عنایت کی وجہ سے صدارت کے وقار میں بے انتہا اضافہ ہو گیا تھا۔ ان تعلقات کے علاوہ ، ذاتی طور پر بھی جہانگیر ، مذہب ، علمائے دین اور اہل اللہ کی طرف بالعموم زیادہ راغب تھا۔ اس طرح وہ صدر کے ساتھ نہ صرف خاص مہربانی کا سلوک کرتا تھا بلکہ اس نے یہ حکم دے رکھا

---

۱ - ماثر الامرا ، جلد سوم ، صفحہ ۳۰۔ اس وقت اس کا منصب دو ہزاری تھا۔

تھا کہ وہ روزانہ مستحقین کو اس کے سامنے پیش کیا کرے۔[1]

اسی طرح اکبر کی رضاعی بہن ، حاجی کوکہ کے ذمے یہ فرض تھا کہ وہ زنانخانے میں مستحق خواتیں کو عطائے زمین و زر نقد کے لیے پیش کیا کرے۔[2]

جہانگیر کے دور حکومت میں غریبوں کو مختلف النوع داد و دھش کے علاوہ جو زمین دی گئی وہ مقدار اور مالیت میں اس سے کہیں زیادہ تھی جس کی اکبر کے عہد میں زیادہ سے زیادہ توقع کی جا سکتی تھی۔ جہانگیر نے اس کا ذکر اپنی تزک میں کئی جگہ کیا ھے۔ لیکن ان عطیوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ھے کہ وہ بادشاہ نے بذات خود دیے تھے۔

"میں نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ھے کہ مستحق اشخاص اور درویشوں کو ہر شب میرے سامنے پیش کیا جائے تاکہ میں ان کے حالات کے متعلق تحقیقات کر کے انھیں زمین ، زر نقد، اور پوشاک عطا کروں ، چنانچہ ان میں ایک شخص پیش کیا گیا ـــــ"۔[3]

۱۔ تزک ، صفحہ ۵ ۔

۲۔ تزک ، صفحہ ۲۱ ۔ وہ سعادت یار کوکہ کی بہن تھی۔ ماثر الامرا ، جلد اول ، صفحہ ۱۳۳ ۔ اس کے بعد یہ کام نور جہاں کی دایہ کے ذمے کیا گیا۔ صدر اس کی مہر دیکھ کر مستحق خواتین کے معاملات کے متعلق ضروری کاروائی کیا کرتا تھا۔

۳۔ تزک ، صفحہ ۱۲۴ ۔

۹ سنہ جلوس کے حالات کے خاتمے کے قریب پھر یہی بیان دھرایا گیا ہے جہاں وہ لکھتا ہے کہ اس قاعدے کے بموجب ''امسال میں نے غربا و مساکین کو خود اپنے ہاتھ سے اور اپنی موجودگی میں ۵۵ ہزار روپے نقد، ایک لاکھ نوے ہزار بیگھے زمین، چودہ گاؤں چھبیس ہل اور گیارہ ہزار خروار چاول عطا کیے''۔[1]

اسی طرح جب وہ ۱۲ سنہ جلوس میں گجرات گیا تو اس نے اہل کھمبایت کی حالت کا جائزہ لیا۔ غربا کو زمینیں یا نقد امداد دی گئی اور دیگر اشخاص کو خلعتیں اور گھوڑے عطا ہوئے۔ بندرگاہ کے قریباً ہر شخص کو کچھ نہ کچھ انعام ضرور دیا گیا۔[2] احمد آباد میں خواتین کے حالات معلوم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ احمد آباد سے روانہ ہوتے وقت جہانگیر کہتا ہے۔ ''ان دنوں احمد آباد شاہی پرچموں سے آراستہ تھا اور میں دن رات حاجتمندوں کی حالت ملاحظہ کرنے اور انہیں زر نقد اور اراضی بطور انعام دینے میں مصروف رہا ـــــ میری کوشش صرف یہ تھی کہ چونکہ میں، بحیثیت بادشاہ، ملک کے اس حصے میں کئی سال بعد گیا تھا ایک شخص بھی محروم نہ رہنے پائے۔۔۔۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اس سلسلے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور اس فرض کی بجا آوری میں اپنے آرام کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اگرچہ احمد آباد

---

۱ - تزک، صفحات ۱۳۶، ۱۳۷ -

۲ - تزک، صفحہ ۲۰۷ -

کی سیر سے میں خوش نہیں ہوا تا ہم مجھے یہ اطمینان ضرور حاصل ہو گیا ـــــ کہ میرے آنے سے کثیر التعداد غریب اشخاص کو فائدہ پہنچ گیا،، ۔[۱]

۱۴ سنہ جلوس کے حالات میں مذکور ہے کہ کابل میں مدد معاش کے طور پر ۳۴۷۸۰ بیگھے اراضی ، پورے دو گاؤں ، کشمیر کے غلے کے ۳۲۰ خروار اور سات قلبے عطا کیے گئے ۔[۲]

۱۵ سنہ جلوس میں حکم دیا گیا کہ حاجتمندوں کو کشمیر میں پیش کیا جائے ۔[۳] ۱۶ سنہ جلوس میں ۸۵۰۰۰ بیگھے اراضی ، ۳۳۲۵ خروار غلہ ، چار گاؤں ، دو قلبے اور ایک باغ نقد داد و دهش کے علاوہ دیا گیا ۔[۴] ۱۷ سنہ جلوس میں بادشاہ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ شدید موسم سرما کی وجہ سے اہل کشمیر سخت مصیبت میں مبتلا ہیں ۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک موضع جس کی سالانہ مالگزاری ۳۰۰۰ روپیہ تھی اس غرض سے مخصوص کر دیا جائے کہ اس کی آمدنی سے محتاجوں کو سردیوں کے کپڑے دیے جائیں اور مساجد میں وضو کے لیے گرم پانی کا انتظام کیا جائے ۔

---

۱ - تزک ، صفحہ ۲۱۸ ۔ روجزر صفحہ ۳۴۰ ۔

۲ - تزک ، صفحہ ۲۶۸ ۔

۳ - تزک ، صفحہ ۳۰۳ ۔

۴ - تزک ، صفحہ ۳۴۵ ۔

مذکورہ بالا واقعے کے بعد تزک میں اراضی عطا کرنے کا کہیں ذکر نہیں ہے اور جیسا کہ پہلے کسی دوسری جگہ یہ بیان ہو چکا ہے، اس کے بعد جہانگیر کی پریشانیوں کا زمانہ شروع ہو گیا جن کا سبب اس کی صحت کی خرابی اور سیاسی حالات تھے - یہ پریشانیاں اس کے انتقال تک باقی رہیں -

عطائے اراضی وغیرہ سے متعلق صدر کے اختیارات کا پھر بحال نہ ہونا

ان تمام عطیات اراضی وغیرہ کے سلسلے میں یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ عطیے صدر نے دیے- جو اعداد اوپر مذکور ہوئے وہ اسی سال سے متعلق ہیں جس کے تحت آن کا ذکر کیا گیا ہے - جہانگیر کا عام قاعدہ یہی تھا کہ وہ ہر بار اعداد اسی طرح سال کے آخر میں بتایا کرتا تھا - تمام پیش کشوں، انعامات اور شکار وغیرہ کے متعلق بھی وہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہے - لہٰذا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ (۱) یا تو صدر نے کوئی عطیہ دیا ہی نہیں - ہر معاملہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا تھا، اس پر اس کی منظوری حاصل کر لی جاتی تھی - اس طرح ہر معاملے کا اندراج واقعہ نویس کے روز نامچے میں ہو جاتا تھا اور اسی کے اندراجات پر میزان کا انحصار ہوتا تھا یا یہ کہ (۲) مذکورہ اعداد میں ان عطیوں کی تعداد شامل نہیں ہے جو صدر بطور خود اپنے محکمے میں منظور کرتا تھا اور (۳) یہ کہ ایسی صورت میں وہ عطیے بہت معمولی مالیت کے ہوتے ہونگے ورنہ جہانگیر ان کا ذکر ضرور

کرتا - لیکن ماثر الامراء کے ایک فقرے سے اس نتیجے کے خلاف نتیجہ نکلتا ہے - صدر کے اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے مولف لکھتا ہے کہ آصف خاں (وکیل) نے اراضی مدد معاش عطا کرنے میں اس کی (صدر کی) شکایت بادشاہ سے ان الفاظ میں کی ''حضرت عرش آشیانی (اکبر) نے جتنی اراضی پچاس سال میں (غریبوں کو) عطا فرمائی تھی اتنی میراں صدر جہاں نے پانچ برس میں دے دی ہے'' - [1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ صدر کو نہ صرف اراضی عطا کرنے کا اختیار تھا بلکہ وہ اس اختیار کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ استعمال بھی کرتا تھا اور یہ خیال ان تاثرات کے بالکل برعکس ہے جو تزک کا مطالعہ کرنے سے پیدا ہوتے ہیں - اس معاملے کے متعلق کسی دوسرے ذریعۂ معلومات اور مستند مواد کی غیر موجودگی کے باعث یہ عقدہ اسی طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ ماثر کے بیانات میں دی ہوئی تاریخوں سے اُن واقعات کی تاریخوں کا مقابلہ کیا جائے جو تزک میں مذکور ہیں - مذکورۂ بالا شکایت کا تعلق جہانگیر کے عہد حکومت کے ابتدائی ۵ سال[2] سے ہے اور بادشاہ کی ذات سے متعلق جتنے حوالے ہیں وہ سب ان واقعات سے تعلق رکھتے ہیں جو ۸ سنہ جلوس اور ۱۷ سنہ جلوس کے درمیان پیش آئے - اس طرح یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہے کہ اگرچہ جہانگیر نے یکم سنہ جلوس میں یہ حکم دیا تھا کہ مستحق امداد اشخاص کو ہر شب اس کے

---

۱ - ماثر الامراء ، جلد سوم ، صفحہ ۳۵۰ -

۲ - آصف خاں قزوینی دکن بھیجا گیا تھا جہاں ۷ سنہ جلوس میں اس کا انتقال ہوگیا -

سامنے پیش کیا جائے لیکن صدر کو بھی اپنی مرضی سے عطیے دینے کا اختیار تھا اور وہ اپنے اس اختیار کو نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ شکایت کے بعد بادشاہ نے یہ معاملہ خود اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ آہستہ صدر کے اختیار میں اگر کمی نہ آگئی تو وہ تعطل میں ضرور پڑ گیا۔ علاوہ بریں، صدر بہت ضعیف بھی ہوگیا تھا اور اگرچہ وہ دربار میں حاضر ضرور ہوتا رہا لیکن اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اب بھی اپنے فرائض منصبی اسی تن دہی سے انجام دے سکے گا جس سے وہ حکومت کے ابتدائی دنوں میں انجام دیا کرتا تھا۔ اتفاق سے اس خیال کی تائید اس بیان سے بھی ہوتی ہے، جو تزک میں ان اشخاص سے متعلق ملتا ہے جو حاجتمندوں کو پیش کرنے کے لیے مقرر کیے جاتے تھے یا جو بطور خود ایسے افراد کو پیش کیا کرتے تھے، ان میں صدر کا ذکر نہیں ہے۔[1]

لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ :-

۱- جہانگیر کے دور حکومت میں صدر کو اپنی مرضی سے اراضی عطا کرنے کا اختیار تھا اور حکومت کے ابتدائی حصے میں مذکورہ اختیار کے حدود اکبر کے مقررہ کردہ حدود سے کہیں زیادہ وسیع تھے۔

۱۔ الفاظ جو استعمال کیے گئے ہیں یہ ہیں۔ "معتمد اشخاص"۔ "وہ اشخاص جو میرے "مزاج دان" ہوں پیش کریں"۔ عطیات (اراضی) اور خیر خیرات کے سلسلے میں ناموں کا تذکرہ۔

تزک۔ صفحات ۴۹، ۵۱، ۱۲۱، ۲۱۹، ۲۲۹، ۲۷۲، ۳۰۳

۲- یہ اختیار زیادہ عرصے تک باقی نہ رہا۔ ۵ سنہ جلوس کے بعد غالباً اور ۷ سنہ جلوس کے بعد یقیناً ایسے تمام عطیات بادشاہ نے خود ہی منظور کیے۔

۳- ۸ سنہ جلوس اور ۱۷ سنہ جلوس کے درمیان تزک میں میں عطیات کی جو تعداد بتائی گئی ہے اس میں معمولی یا متوسط درجے کے عطیات شامل نہیں ہیں بلکہ وہ تعداد ایسے اعلیٰ ترین عطیات کی ہے جو جہانگیر نے خود دیے تھے۔

۴- ۱۷ سنہ جلوس اور ۲۱ سنہ جلوس کے درمیان مذکورہ نوعیت کے عطیات کا ذکر کہیں درج نہیں ہے اور سیاسی حالات نیز جہانگیر کی پریشانیوں کے پیش نظر اس بات کا امکان بھی نظر نہیں آتا کہ زمانۂ مذکور میں اس قسم کے عطیات دیے گئے ہوں۔

شاہ جہان

شاہ جہان نے حاجتمندوں اور اپنے فرقے کے علماء کی بابت وہی حکمت عملی برقرار رکھی جس پر جہانگیر عمل پیرا تھا۔ لیکن وہ اپنے باپ سے زیادہ قاعدہ پرست اور اکبر سے زیادہ فیاض واقع ہوا تھا۔ بحیثیت مجموعی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف قسم کی خیراتوں اور داد و دہش کا باہمی فرق ملحوظ رکھتا تھا۔ اراضی عطا کرنے میں وہ بہت احتیاط سے کام لیتا تھا اور دوسری طرف وہ خیراتی کاموں کے لیے بڑی بڑی رقمیں معین کر دیتا تھا تاکہ وہ ہر سال اس کے معین کیے ہوئے مواقع پر اور اسی کے بتائے ہوئے طریقے سے خرچ کی جائیں۔ ایسی خیراتوں کا مکمل ریکارڈ ہر سال کے متعلق موجود ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کے احکام کی پابندی سختی کے ساتھ کی جاتی تھی اور

طریقۂ کار بھی بہت باقاعدہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا انحصار محکمۂ متعلقہ کی کارکردگی ہی پر ہو سکتا ہے۔

لیکن جہاں تک عطائے اراضی کا تعلق ہے اس کا تذکرہ صرف ایک جگہ ملتا ہے اور یکم سنہ جلوس کے حالات میں ہے۔ ''موسوی خان صدر نے، بموجب احکام شاہی، حاجتمند مستحق اشخاص کی ایک جماعت کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا، سب کو فائدہ پہنچا۔ یومیہ بھتوں اور اراضی مدد معاش کے علاوہ تیس ہزار روپیہ نقد دیا گیا''۔[۱] ''سال کے دوران میں جتنے عطیات دیے گئے ان کا مجموعہ یہ ہے: ۴ لاکھ بیگھے اراضی، ۱۲۰ سالم گاؤں، علاوہ بریں ایک کثیر رقم جو بصورت نقد تقسیم کی گئی''۔[۲]

شاہ جہان کے دور حکومت میں ایسے عطیات کے متعلق بس اتنا ہی ذکر ملتا ہے اور چونکہ ان کا تعلق حکومت کے پہلے سال سے ہے، جس میں بالعموم ہمیشہ خوب انعامات دیے جاتے تھے اور خیرات بھی بہت کی جاتی تھی اس لیے جتنا بتایا گیا ہے اسے زیادہ سے زیادہ سمجھنا چاہیے اور ایسے عطیات کو جو ہر سال بہ تواتر دیے جاتے ہوں گے انہیں اتنا کم حقیقت سمجھنا چاہیے کہ وہ اس قابل ہی نہ ہوں گے کہ ان کا ذکر اس زمانے کے تاریخی وقائع میں کیا جائے۔ انفرادی نوعیت کے دو اور عطیات کا ذکر بھی ملتا ہے مگر ان کی صورت اور ہے اور ان کا ذکر آئندہ صفحات میں ایک علحدہ فصل کے تحت کیا گیا

۱۔ اور ۲۔ لاہوری، جلد اول، صفحہ ۲۰۰ اور صفحہ ۲۵۱۔ مختلف مقامات پر مندرج رقوم کی میزان ۵۰۰۰۰ روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ کابل بھیجا گیا تاکہ ان لوگوں کی مدد کی جائے جو والی توران کے حملے کی وجہ سے تکالیف میں مبتلا تھے۔ (صفحہ ۲۱۶)

ہے۔ لیکن جو واقعات مذکور ہیں ان سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس دور میں آخر وقت تک عطیات ضرور منظور ہوتے رہے لیکن حزم و احتیاط اور دور اندیشی کے ساتھ۔ نیز یہ کہ ان کی تعداد کبھی اتنی زیادہ نہیں ہوئی کہ ان کا ذکر و قائع تاریخی میں کیا جائے۔

بے قاعدگی کی ایک مثال

۶ سنہ جلوس میں موسوی خاں صدر کی علٰحدگی اور اس کے جانشین، سید جلال کی شکایت سے جو اس نے محکمے کے خراب انتظام سے متعلق کی تھی، بعض واقعات کا انکشاف ہوتا ہے جن کا تعلق اس کی صدارت سے تھا۔ سید جلال، جو ایک بہت بلند پایہ عالم تھا اور جو ایک مشہور و معروف خاندان سادات سے تعلق رکھتا تھا، موسوی خاں کی جگہ صدر مقرر کیا گیا کیونکہ ''وہ (موسوی خاں) اس اعلیٰ عہدے کے فرائض کما حقہ انجام نہیں دے سکتا تھا''۔ کچھ عرصے بعد نئے صدر نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ:—

۱۔ موسوی خاں نے اراضی مدد معاش اور وظائف غیر مستحق اشخاص کو دیے ہیں اور ان کی اطلاع بادشاہ کو نہیں دی۔

۲۔ بعض اشخاص جعلی فرمانوں (فرامین لباسی) کی بنا پر زمینوں پر قابض ہیں اور وظائف وصول کرتے ہیں۔

اس اطلاع کی بناء پر یہ حکم جاری کیا گیا کہ:—

(الف) قلمرو کی تمام اراضئ مدد معاش کی ایک فصل کا لگان، روک لیا جائے اور دوسری جگہ جمع کیا جائے خواہ یہ اراضی

خالصے میں ہوں یا اُمرا اور منصب داروں کی جاگیروں میں واقع ہوں۔

(ب) یہ عطیہ داروں کو اس وقت دی جائیں جب ان کی اسناد کی تصدیق ہو جائے اور ان کے حقوق ثابت ہو جائیں۔

(ج) ایسے عطیہ دار جنھیں بادشاہ اصالۃً جانتا ہو اس حکم سے مستثنی رکھے جائیں۔

(د) دارالحکومت اور اس کے نواح میں رہنے والے عطیہ دار صدر الصدور کے پاس جائیں اور صوبائی عطیہ دار اپنی اپنی سندوں کی تصدیق صدر صوبہ سے کرائیں۔ صدر صوبہ، حاکم صوبہ سے مشورہ کے بعد کارروائی کرے۔

چونکہ حکم مذکور میں اس بات کی خاصی گنجائش تھی کہ متعلقہ عہدہ دار جن کے ذمے فرمانوں اور عطیہ داروں کے حقوق کی جانچ پرتال کا کام تھا، جس شخص کے متعلق جو چاہیں لکھ دیں اس لیے عطیہ داروں میں بہت خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ اس پر ایک دوسرا حکم جاری کیا گیا تا کہ ان کا خوف رفع ہو جائے اور مذکورہ عہدہ دار کا اختیار تمیزی محدود ہو جائے۔[1] اس حکم کے بموجب ہدایت کی گئی کہ:—

۱- روکا ہؤا لگان عطیہ داروں کو دے دیا جائے، تحقیقات کی جائے اور اگر دوسری فصل آنے تک تصدیق حاصل نہ ہو سکے تو دوسری فصل کا لگان روک لیا جائے۔

۱- پہلا حکم بھی، جس کے بموجب دعاوی کی تحقیق منظور تھی، منسوخ کر دیا گیا، کیونکہ شاہ جہان کی عزیز ترین بیٹی انھیں ایام میں بری طرح جل گئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسے وقت اس طبقے کے معاملات میں مداخلت کی جائے۔

۲- دارالحکومت اور اس کے نواح میں رہنے والے عطیہ دار صدرالصدور کے تصدیق نامے حاصل کریں اور صوبوں میں، صوبائی صدر، پہلے یہ معلوم کریں کہ کون کون سے عطیہ دار انتقال کر چکے ہیں یا فرار ہو گئے ہیں، کتنے عطیہ داروں نے اپنے عطیے دوسروں کے نام منتقل کر دیے ہیں اور کتنے ہنوز قابض ہیں۔ اس کے بعد وہ متعلقہ صوبے کے حاکم سے مشورہ کر کے، اکبر، جہانگیر اور موجودہ حکومت کے مجریہ فرمان رکھنے والوں کو از سر نو صداقت نامے دے دیں۔

۳- اگر عطیہ دار فوجی سپاہی یا صناع ہوں تو ان کی زمینیں واپس لے لی جائیں۔ باقی اشخاص کی زمینوں میں اگر متعلقہ شرائط پوری ہوتی ہوں، کوئی مداخلت نہ کی جائے۔

۴- اگر اصل عطیہ دار مر چکے ہوں اور فرمان میں لفظ "مع فرزندان" ہو، تو متعلقہ اراضی جائز ورثاء کے قبضے میں رہنے دی جائے لیکن اگر فرمان میں یہ الفاظ درج نہ ہوں تو لازم ہے کہ زمین بحق سرکار ضبط کر لی جائے اور اگر قابض مستحق متصور ہوں تو ان کے متعلق ایک علٰحدہ رپورٹ مرتب کر کے دربار میں پیش کی جائے۔[1]

اس معاملے کی وجہ سے نیز بادشاہ اور نئے صدر کی مجوزہ کارروائی کے باعث، جسے نہ اپنے محکمے کے ماتحت افسروں کا کوئی خاص لحاظ تھا نہ اس کے گزشتہ نظم و نسق سے کوئی واسطہ، غالباً چھان بین اور جانچ پرتال نہایت مکمل ہوئی ہوگی۔

۱- لاھوری، جلد دوم، ۱۷ سنہ جلوس، صفحات ۳۶۵-۳۶۶
مرآۃ، م، ورق ۸۱-

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ (۱) صدر بہ اختیار خود عطیات منظور کرنے کا مجاز نہ تھا لیکن وہ منظور کیا کرتا تھا۔ رپورٹ اسی وجہ سے کی گئی تھی ('بے آنکہ احوال آنہا بہ عرض ....رساند') یعنی یہ کہ وہ بادشاہ کو متعلقہ اشخاص کی حالت سے مطلع کیے بغیر ہی انھیں عطیات دے دیا کرتا تھا اور (۲) بعض معاملات ایسے بھی تھے جن میں فرمان کو جعلی سمجھا گیا تھا۔ اصل الفاظ یہ ہیں۔ 'بہ فرامین لباسی اراضی مدد معاش و وظائف متصرف اند'۔

ان معاملات کو محکمۂ مذکور کی بے ضابطگیوں کی بہت بڑی مثالیں سمجھنا چاہیے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے معاملات ممکن کس طرح ہو سکتے تھے۔ جہاں تک ضوابط کا تعلق ہے اس قسم کے عطیات کا فرمان حاصل کرنے کے لیے بھی قریب قریب اسی ضابطۂ کار پر عمل کرنا ضروری تھا جس پر کسی منصب دار کو جاگیر عطا کیے جانے کے سلسلے میں عمل کیا جاتا تھا۔ یہ ضابطۂ کار بہت طولانی تھا اور متعلقہ کاغذات متعدد ہاتھوں سے گزرتے تھے۔ ان حالات میں کوئی ایسا معاملہ جس کی ابتدا صدر کے محکمے سے ہوئی ہو، آخری مرحلے پر پہنچ ہی نہ سکتا تھا جب تک کہ وہ تمام مقررہ مراحل سے نہ گزر جائے۔ چنانچہ اس امر کی قطعاً گنجائش نہ تھی کہ کوئی جدید عطیہ صدر کے اختیارات کے باہر یا ان سے زیادہ منظور ہو سکے۔ ان امور کے پیش نظر، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موسوی خاں کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے غیر مستحق اشخاص ('غیر مستحقاں') کو عطیات دیے جیسا کہ

اصل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس نے اپنے دائرۂ اختیار کے اندر رہ کر وہ عطیات منظور کیے تھے - چونکہ ان عطیات کی منظوری کے سلسلے میں اشخاص متعلقہ کے حالات سے بادشاہ کو باخبر نہیں کیا گیا تھا اس لیے شکایت پیدا ہوئی اور ان کی منسوخی کا موقع ہاتھ آگیا -

دوسرا الزام اور بھی زیادہ سنگین اور ناقابل فہم ہے ------ نافذ العمل ضوابط کی موجودگی میں جعلی فرمان بنا لینا کس طرح ممکن تھا ، وہ بھی شاہ جہاں کے دور حکومت میں ، جو معاملات پر نہایت کڑی نظر رکھتا تھا اور وہ بھی اسلام خاں جیسے وزیر کے عہد وزارت میں ---؟ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس زمانے میں 'عرض مکرر ، اور داروغۂ غسل خانہ کے عہدوں پر سعد اللہ خاں فائز تھا اور یہ دونوں عہدے شاہی فرمانوں کے تعلق کے باعث بہت بڑی ذمہ داری کے عہدے تھے - لیکن چونکہ الفاظ قطعی ہیں لہٰذا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکالنا ہوگا خواہ وہ خلاف ہو یا موافق - میرا خیال یہ ہے کہ جہاں تک نئے عطیات کی منظوری کا تعلق ہے اس میں کسی بے قاعدگی کی گنجائش نہ تھی ، ایسی منظوریاں ضرور انہیں حالات میں دی گئی ہونگی جن میں صدر کو خود اپنی مرضی سے کام کرنے کا اختیار تھا - میری رائے میں ایسی بے قاعدگی آن اراضی کے متعلق ممکن تھی جو بالکل صدر کے اختیار میں تھیں کیونکہ وقتاً فوقتاً پورے پورے گاؤں ایسے عطیات کے لیے مخصوص کر دیے جاتے تھے - ثانیاً ایسی بے ضابطہ کارروائیاں اصل عطیہ دار کی موت کے موقعے ہی پر ممکن ہوتی ہوں گی

جب اس کے ورثاء ناجائز طور سے جاگیر پر متصرف رکھے جاتے ہوں گے۔ مذکورہ دونوں صورتوں میں صدر ایسی ترکیبیں اختیار کرسکتا تھا کہ زمین اس کے منظور نظر اشخاص کے تصرف میں آجائے اور کوئی لازماً گرفت بھی نہ کر سکے۔

اس نتیجے کی تائید ان احکام سے بھی ہوتی ہے جو اس سلسلے میں جاری کیے جاتے تھے۔ اگر عطیات کے سلسلے میں جعلی فرمان بنائے گئے ہوتے تو حکومت نے بہت سخت کارروائی کی ہوتی کیونکہ ایسی باتیں شاذو نادر وقوع پذیر ہوتی ہیں اور حکومتیں ایسے مواقع پر سخت انسدادی کارروائی کرتی ہیں تا کہ آئندہ کوئی ایسا نہ کر سکے۔ لیکن ایسی کارروائی کا کہیں ذکر بھی نہیں ملتا۔ جو کارروائیاں کی گئیں ان سے پتا چلتا ہے کہ بے ضابطگیاں سنگین نوعیت کی نہ تھیں علاوہ ازیں اس حکم میں قطعی طور پر مذکور ہے کہ تحقیقات کا دائرہ صرف اُن معاملات تک محدود رہنا چاہیے جو عطیہ داروں کی موت سے متعلق ہوں۔ اس قسم کے تمام معاملات میں جدید فرمان کی ضرورت نہ تھی۔ صرف ایک صداقت نامہ کافی تھا جو ظاہر ہے صدر الصدور کا عطا کردہ ہوتا ہوگا۔

بہر حال وقائع نگار کے الفاظ کی یہ وضاحت جو یہاں کی گئی ہے، سلطنت کے عام نظم و نسق کے پیش نظر کی گئی ہے۔ اس سے اُس الزام کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی جو صدر پر لگایا گیا ہے۔ الزام یقیناً بہت سنگین تھا لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے معاملات ظاہر ہو کر رہے اور ان کے ظاہر ہونے سے پیشتر ہی صدر عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ لہٰذا بادشاہ کے شکوک یا

وہ اطلاعات جو اسے خفیہ طور پر ملی تھیں اور جن کی بناء پر اسے برطرف کیا گیا ، بے بنیاد نہ تھیں -

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ صدر اس طرح کی بے ضابطگیاں وظائف منظور کرنے کے سلسلے میں زیادہ کر سکتا تھا جن کے لیے محض پروانچوں کی ضرورت ہوتی تھی اور جن کے متعلق دیگر عہدہ دار صرف ان کاغذات پر بھروسا کر سکتے تھے جو محکمۂ متعلقہ سے موصول ہوتے تھے -

بے ضابطگیوں کی اس مثال سے جو خاص خاص نتائج برآمد ہوتے ہیں اُن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :—

۱ - شاہ جہاں کے زمانۂ حکومت میں صدر کو بھی بعض عطیات منظور کرنے کے اختیارات حاصل تھے -

۲ - اس کے عہد میں شروع سے آخر تک عطیات دیے گئے -

۳ - یہ عطیات بڑے بڑے نہ تھے -

۴ - یہ عطیے صرف عطیہ داروں کی زندگی تک کے لیے ہوتے تھے -

۵ - فوجی سپاہی اور صناع عام طور پر ان عطیات کے مستحق نہ تھے -

۶ - مذکورہ واقعے سے صدر کی بے ضابطگیاں ظاہر ہوئیں - بادشاہ نے فوراً ان کی جانب توجہ کی اور تمام اراضی سیورغال نیز تینوں بادشاہوں کے دور حکومت کے فرمانوں کی جانچ پرتال کی گئی - اس طرح اکبر کے ابتدائی عہد حکومت میں

جو تحقیقات کی گئی تھی، اس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس محکمے کی بے ضابطگیاں دور کی گئیں۔

۷- اس تحقیقات کا مقصد یہ نہ تھا کہ اکبر کی طرح اراضی واپس لے لی جائیں بلکہ یہ تھا کہ محکمے کی بے ضابطگیاں دور کر دی جائیں اور عطیات صرف اُن لوگوں کے پاس رہنے دیے جائیں ہو واقعی جائز طور پر اُن کے مستحق ہوں۔

عطیات کی زیادہ سے زیادہ مقدار

اس بات کے ثبوت کے لیے کوئی فیصلہ کن تحریری شہادت نہیں ملتی کہ عطیات کی زیادہ سے زیادہ مقدار کیا ہوتی تھی لیکن جو واقعات تاریخی کتب میں جا بجا ملتے ہیں اُن سب کو یکجا کرنے پر اس کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے سے قبل جبکہ اکبر نے اس محکمے کی جانب توجہ کی تھی، عطیات کی مقدار اس مقدار کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی تھی جو بعد میں معین ہو گئی۔ بدایونی کے بیان کے مطابق، مشہورومعروف ولی اللہ حضرت محمد غوث کے ایک جانشین کو ایک کروڑ [1] کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ مگر بعد میں تو ہزار ہزار کے عطیات بھی بہت کم نظر آتے ہیں۔ شیخ عبدالنبی کا اعتبار اٹھ جانے پر اکبر نے جو حکم عطیات پر نظر ثانی کرنے کا دیا تھا، وہ ۵۰۰

۱- بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۳۴- میرے خیال میں اس سے مراد بیگھے ہیں روپے نہیں کیونکہ مولف بالعموم ایسے فقرات میں لفظ بیگھ حذف کر دیتا ہے۔

بیگھے اور اس سے زیادہ اراضی کے متعلق تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عطیات زیادہ سے زیادہ ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ بیگھے کے درمیان ہوتے تھے۔ عبدالنبی کے اس دندان شکن جواب سے بھی، جو اس نے بدایونی کو دیا تھا، کہ اس نے اسے سب سے زیادہ مدد معاش، یعنی ۱۰۰۰ اراضی دے دی ہے، یہی واضح ہوتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر بدایونی اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے کہ ۱۰۰۰ اور ۵۰۰ کے اکثر عطیات بعد تخفیف ۱۰۰ کے کر دیے گئے ہیں [1] اور عبدالنبی خود عام طور پر صرف ۱۰۰ بیگھے تک اراضی مدرسین حدیث وغیرہ کے لیے منظور کرتا ہے۔ [2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے باقی ماندہ دور حکومت میں بالعموم ۱۰۰ سے ۵۰۰ بیگھے تک اراضی دی جاتی تھی اور اس کے جانشین بھی اسی پر عمل پیرا رہے۔ جہانگیر خاص طور پر ایک عطیے کا ذکر کرتا ہے جو ۱۰۰۰ بیگھے اراضی کا تھا۔ یہ عطیہ مولانا محمد امین کو دیا گیا تھا، جو عہد جہانگیر کے ایک مشہور بزرگ شیخ محمود کمال کے مریدوں میں تھے۔ اکبر ملاقات کے لیے خود ان بزرگ کی قیام گاہ پر گیا تھا اور جہانگیر بھی لاہور میں ان کی صحبت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اسی طرح ایک دوسرے غیر معمولی عطیے کا ذکر بھی ملتا ہے جو پانچ دیہات پر مشتمل تھا۔ یہ عطیہ کابل کے نزدیک رہنے والے شمس خاں نامی ایک درویش کو دیا گیا تھا

---

۱ - بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۲۷۴

۲ - بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۲۰۴

جس کی قیام گاہ پر جہانگیر خود بغرض ملاقات گیا تھا۔ شاہ جہاں کے دور حکومت میں ھامون نامی ایک فقیر کو ایک گاؤں[1] اس کے وطن ھی میں عطا کیا گیا کیونکہ اس کے مرہم سے بیگم صاحب (دختر شاہ جہاں و ممتاز محل) کے وہ زخم اچھے ہوئے تھے جو اس کے جسم پر بری طرح جل جانے کے بعد پڑگئے تھے۔ یہ واقعہ شاہ جہاں کی حکومت کے بہت ھی غیر معمولی واقعات میں سے تھا۔ محمد اسلم نامی ایک مشہورومعروف قاضی کا ذکر بھی ملتا ھے جس کے تصرف میں ایک جاگیر کابل میں تھی جس کی آمدنی دو ہزار روپے تھی۔[2] یہ دونوں واقعات نادرالوقوع تھے اسی لیے ان کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ھے۔

غرضکہ معلوم یہ ھوتا ھے کہ سو سے پانسو بیگھے تک اراضی عام طور سے دی جاتی تھی۔ ہزار بیگھے عام حالات میں بہت غیر معمولی یا سب سے زیادہ عطیہ ھوتا تھا اور ہزار بیگھے سے اوپر کا عطیہ شاذو نادر تھا۔

ایک بیگھے کی مالیت کیا ھوتی تھی۔ اس کے متعلق یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ جو مالگزاری ایک بیگھے سے ملتی تھی وہ مختلف صوبوں میں مختلف تھی۔ لیکن وہ ایک روپے سے کہیں کم نہ تھی۔[3] گاؤں کے متعلق ایسا معلوم

۱۔ لاھوری، جلد دوم، صفحہ ۳۰۹

۲۔ صالح، صفحہ ۴۴۴

۳۔ بلاخ من، صفہ ۲۷۰

ہوتا ہے کہ بعض جگہ اس کی آمدنی ۳۰۰۰ روپے تک ہو جاتی تھی۔[1] لیکن اُن پانچ گاؤں سے جو جہانگیر نے کابل کے نزدیک دیے تھے اتنی آمدنی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مستثنیات منتشر طور پر بعض ایسے عطیات کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں اراضی مدد معاش عطا کرنے کے عام قواعد کی پابندی سختی کے ساتھ نہیں کی گئی تھی۔ لیکن چونکہ وہ اکبر کے مقرر کردہ چاروں اقسام کے عطیات میں سے کسی کے تحت بھی نہیں آتے اس لیے ان کا شمار مستثنیات میں ہونا چاہیے۔

جہانگیر نے اپنے پہلے سنہ جلوس میں ایسے عطیات دریائے چناب اور بیہات ندی کے درمیان پنجاب کے اُن زمینداروں کو دیے تھے جنھوں نے اُسے اُس کے بیٹے خسرو کی بغاوت فرو کرنے میں مدد دی تھی۔[2] ۵ سنہ جلوس میں جب ایک بیوہ عورت نے، مقرب خاں حاکم گجرات کے خلاف یہ شکایت کی کہ اس نے اپنے ایک ملازم کو جو اس کی بیٹی کا قاتل ہے، پناہ دے رکھی ہے تو جہانگیر نے حاکم مذکور کی اُس جاگیر کا نصف حصہ، اس بیوہ کو بطور مددمعاش عطا کردیا، جو حاکم مذکور کو اپنی تنخواہ کے عوض کھمبات میں ملی ہوئی تھی۔[3] شاہ جہاں نے ۱۶

۱- تزک، صفحہ ۳۴۵

۲- تزک، صفحہ ۳۲

۳- ترک، صفحہ ۸۳

سنہ جلوس میں اپنے ایک جنرل، اللہ وردی خاں کو معزول کر کے اسے گزر اوقات کے لیے اراضی مدد معاش دی جس کی آمدنی ۳۲ لاکھ دام (۸۰۰ روپے سالانہ) تھی[1] اور ھامون فقیر کو ایک گاؤں دیا جس کا ذکر اوپر ھو چکا ھے۔

ان عطیات کے لیے جو فرمان جاری ھوئے تھے انھیں دیکھنے سے پتا چلتا ھے کہ باغات لگانے کے لیے بھی زمین دی جاتی تھی اور حکم یہ ھوتا تھا کہ عوام الناس کو ان باغات میں جانے سے روکا نہ جائے اور بالآخر آن کا استعمال غریبوں کو فائدہ اور مسافرون کو آرام پہنچانے کے لیے کیا جائے۔[2]

دوسری خیراتیں

صدر کے فرائض میں ایک اھم فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ غریبوں اور بیکسوں کے حال کا نگراں رھے اور اس رقم سے جو اس کی تحویل میں اسی غرض کے لیے رھتی تھی، ان کی ضروریات پوری کرتا رھے۔ اس کی صورت زیادہ تر یہ ھوتی تھی کہ خاص خاص مواقع پر یا زمانۂ قحط کے دوران میں غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا اور خاص طور پر موسم سرما میں پہننے کے لیے کپڑے بھی دیے جاتے تھے۔ اکبر کے عہد حکومت میں محکمۂ مذکور کا یہ شعبہ بھی منظم نظر آتا ھے۔ ابوالفضل

۱۔ لاھوری، جلد دوم، صفحات ۳۰۹، ۳۰۹

۲۔ م۔ت ۶۵۸۰، ورق ۱۴۷، ب۔ (ایسے عطیے سے متعلقہ حکم کا چربہ ضمیمے میں دیکھیے)

آئین کے "خیرات" میں لکھتا ہے۔ "بادشاہ سلامت محتاجوں کو روپیہ، پیسہ اور دیگر ضروری چیزیں مرحمت فرماتے ہیں ــــــ اکثر اشخاص کو یومیہ، ماہانہ یا سالانہ وظائف ملتے ہیں جو انھیں بلا زحمت انتظار مل جاتے ہیں ــــ روزانہ گداگروں کو جو داد و دھش کی جاتی ہے اس کے بیان کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہےــــــ"۔[1] "ایک خزانچی ہر وقت دربار میں حاضر رہتا ہے، اور جس گدا کو بادشاہ سلامت دیکھتے ہیں، اس کی ضرورت یقیناً پوری فوماتے ہیں"۔[2]

زر نقد

اکبر خواہ دربار میں ہوتا خواہ محل میں، خواہ دورے پر، خواہ سیروتفریح کے لیے باہر جاتا، بہرحال اپنے ساتھ، کسی شخص کی تحویل میں، نقد رقم ضرور رکھتا تاکہ جس وقت چاہے رقم فوراً اسے مل جائے۔ اس کا نامزد کردہ ایک درباری اپنے پاس کچھ سونا چاندی دربار میں اور ایک کروڑ دام (۲۰۰۰ روپے) محل میں رکھتا اور جب بادشاہ سلامت باہر تشریف لے جاتے تو وہ درباری ایک تھیلے میں کثیر رقم رکھ کر ہمیشہ ساتھ لے جاتا تھا۔[3]

بدایونی کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے اگرچہ جو کچھ اس نے لکھا ہے محض مذاق اڑانے کی نیت سے لکھا ہے۔

۱۔ آئین، صفحہ ۱۹۷۔ بلاخ من، ۲۲۶

۲۔ آئین۔ صفحہ ۱۹۷۔ بلاخ من ۔ ۲۲۶

۳۔ آئین، صفحہ ۱۱۔ بلاخ من، صفحات ۱۴—۱۵

''شام کے وقت باقاعدہ دربار منعقد ہوا جس میں ہندو مسلمان اور ہر طرح کے لوگ جمع ہوئے۔ ان میں مرد، عورت، صحت مند اور بیمار سب ہی جمع تھے اور ہجوم خوفناک معلوم ہوتا تھا''۔[1] دو مواقع پر اکبر کی فیاضی سے اسے بھی فائدہ پہنچا یعنی نقد روپیہ ملا۔ ''جب میں نے آگے بڑھ کر پابوسی کے لیے ہاتھ پھیلائے، تو بادشاہ سلامت نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور جب میں دیوان خانے سے باہر چلا گیا تو انھوں نے مجھے پھر واپس بلایا اور دونوں مٹھیاں بھر کر اشرفیاں عنایت کیں جو تعداد میں چھپن (۵۶) تھیں اور پھر مجھے جانے کی اجازت دی''۔[2] رانا کی مہم سے واپس آکر جب وہ اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اسے پھر ۹۶ اشرفیاں اسی طرح دی گئیں۔[3]

معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے دربار کے باہر بھی روپیہ پیسہ خیرات کرنے کے انتظامات کر رکھے تھے۔ ''ایک جمعہ کو پولو کھیلنے کے میدان میں تقریباً ایک لاکھ زن و مرد جمع ہوئے۔ سلطان خواجہ صدر اور قلیج خاں روپیہ تقسیم کر رہے تھے، لیکن وہاں بڑی افراتفری رہی۔ اس گڑبڑ میں تقریباً اسی عورتیں اور بچے کچل کر زخمی ہو گئے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ آئندہ ایسے مواقع پر کم تعداد میں آدمیوں کو اندر آنے دیا جائے'' اور

۱۔ بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۳۲۶

۲۔ بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۲۲۸۔ 'بدایونی، رانا کے خلاف مہم پر روانگی کے وقت'

۳۔ بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۲۶۹

بدایونی کہتا ہے کہ چند روز کے بعد یہ دستور بالکل ختم کر دیا گیا۔[۱]

معلوم ہوتا ہے کہ اس دستور کو پھر نہ جہانگیر کے عہد حکومت میں زندہ کیا گیا نہ شاہ جہاں کے زمانے میں۔ ۲۳ سنہ جلوس میں اکبر نے تقسیم خیرات کا انضباط اس طرح کیا کہ مستقل محتاج خانے اور سرائیں تعمیر کرا دی گئیں "تاکہ وہاں غریب اور محتاج آرام سے رہ سکیں"۔ غریب مسافروں کے لیے بھی انتظامات کیے گئے اور بقول ابوالفضل "نہایت قلیل عرصے میں ان احکام کی تعمیل بہ طریق احسن کی گئی اور گزر بسر کے ذرائع سے محروم مسافر پردیس میں اپنے وطن کی سی آسائشوں کا لطف حاصل کرنے لگے"۔[۲]

بدایونی لکھتا ہے۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے علحدہ علحدہ انتظامات تھے۔ ایک عمارت کا نام دھرم پورہ رکھا گیا اور دوسری کا خیر پورہ۔ جب ہندو جوگی بہت بڑی تعداد میں اس جگہ جمع ہو گئے تو ایک تیسری عمارت محض ان کے لیے بنوائی گئی اور اس کا نام جوگی پورہ رکھا گیا۔ اکبر ان سے ملنے کے لیے خفیہ طور پر رات کے وقت جایا کرتا تھا۔[۳]

---

۱ - بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۳۲۴ - اس بیان کے مطابق یہ واقعہ ۹۹۳ کا ہے مگر ابوالفضل اسے ۹۸۶ کا بتاتا ہے۔

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۲۶۲ - بیورج، صفحہ ۳۸۱

۳ - بدایونی، جلد دوم، صفحہ ۳۲۴

غریبوں کو اس طرح کھانا کھلانے، مسافروں کے لیے انتظامات کرنے، نیز سراؤں میں ان کے لیے کھانا بھی بہم پہنچانے کا یہ دستور جہانگیر کے زمانے میں بھی بر قرار رکھا گیا۔ چنانچہ پہلے ۱ سنہ جلوس میں حکم دیا گیا کہ ایسی عمارات میں غریبوں اور مسافروں کو کھانا بہم پہنچانے کے انتظامات کیے جائیں۔[1] اکبر اور جہانگیر کے زمانۂ حکومت میں اس حکم کے اجراء تک معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا انتظام صرف دارالحکومت اور اس کے گرد و نواح تک محدود تھا۔ لہٰذا ۲ سنہ جلوس میں جہانگیر نے حکم دیا کہ ایسے مکانات تمام بڑے شہروں مثلاً احمد آباد، الہ آباد، لاہور، دھلی اور آگرے میں تعمیر کیے جائیں وہ کہتا ہے کہ ویسے چھ مکانات تو پہلے ھی سے موجود تھے۔ اب چوبیس نئے مکانات کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔[2]

قحط کے زمانے میں قلمرو کے مختلف حصوں میں کھانا تقسیم کرانے کی متعدد مثالیں، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ملتی ھیں۔ اپنے پہلے سنہ جلوس میں جہانگیر نے اس غرض کے لیے ۳۰۰۰ روپے کشمیر بھیجے۔[3] شاہ جہاں نے ۴ سنہ جلوس میں برھانپور اور احمد آباد میں یہی انتظامات کیے۔ کھانے کے علاوہ پانچ ہزار روپے ہر دو شنبہ کو تقسیم کیے جاتے تھے

---

۱ - تزک، صفحہ ۳۵ - روجز، صفحہ ۷۵

۲ - تزک، صفحہ ۹۹ - روجز، صفحہ ۲۰۴

۳ - تزک، صفحہ ۳۶، روجز، صفحہ ۷۷

اور پچاس ہزار روپے احمد آباد بھیجے گئے۔[1] اسی طرح ۱۹ سنہ جلوس میں، دس مختلف مقامات پر کھانا تقسیم کرنے کے لیے دو سو روپے روز کے حساب سے اور دس ہزار روپے دیگر قسم کی امداد کے لیے منظور کیے گئے اور یہ رقم صدر کی تحویل میں رکھی گئی۔ دوسرے سال بھی انھیں اغراض کے لیے تیس ہزار روپے منظور کیے گئے۔[2] تینوں شہنشاہ دوسرے مواقع پر بھی خیرات کیا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر مواقع اس قسم کے تھے: بادشاہ اور اس کے بچوں کے یوم پیدائش، ہندو مسلم تیوہار، دورے کے دوران میں کسی شہر میں بادشاہ کا داخلہ اور دوروں سے دارالحکومت میں واپسی۔ ان کے علاوہ بادشاہ یا اس کے بچوں کی علالت اور صحت یابی کے مواقع پر بھی غریبوں کو بہت فائدہ پہنچ جایا کرتا تھا۔[3]

ان مواقع کے علاوہ، جن پر اکبر اور جہانگیر بالعموم خیرات تقسیم کیا کرتے تھے، شاہ جہاں نے بہتر ہزار روپے اور مخصوص کیے تاکہ یہ رقم ہر سال پانچ ایسے مواقع پر تقسیم کی جایا کرے جن کا تعلق بحیثیت مسلمان اس کے مذہبی عقائد

---

۱ - لاہوری، صفحہ ۳۶۳، مراۃ - م - ورق ۷۶ ب

۲ - لاہوری، جلد دوم، صفحات ۳۷۲، ۳۸۹، اور ۶۳۲ - یہ انتظام ایک سال تک جاری رہا۔

۳ - ان میں سب سے زیادہ نمایاں مثال ۱۷ و ۱۸ سنہ جلوس میں شاہ جہاں کی عزیز بیٹی، بیگم صاحب کی علالت اور صحت یابی کے مواقع کی ہے۔ لاہوری، جلد دوم، صفحات ۳۵۴، ۳۹۴، ۳۹۵ اور ۴۰۰

سے تھا ۔[1] ان مواقع پر خیرات کی تقسیم کا سلسلہ اس کی حکومت میں آخر تک جاری رہا اور مقررہ رقم اسی جگہ تقسیم کر دی جاتی تھی جہاں تاریخ متعلقہ پر بادشاہ اتفاقاً موجود ہوتا ۔ اس طرح تقسیم رقم سے جو فائدہ لوگوں کو پہنچتا تھا وہ دارالحکومت تک محدود نہ رہا ۔

ان خیراتوں کی ایک قابل توجہ خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بناء بادشاہ کے اس تصور پر قائم تھی کہ اس طرح خیرات کرنا رعایا کی خدمت میں داخل ہے اور جہاں تک غریبوں کا تعلق ہے مسلمانوں نے مذہب و مسلک کے اختلافات کی بناء پر ان کے ساتھ امتیازی سلوک کبھی نہیں کیا ۔ حکومت رعایا کے ذرائع معاش کا انتظام کرنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھتی تھی ۔ اس طرح مجبوروں اور معذوروں کی معاش کے مصارف خود حکومت برداشت کرتی تھی اور محکمۂ صدر اس کا انتظام کرتا تھا ۔ یہی وہ غرض تھی جس کے حصول کے لیے اکبر نے محکمے کو برائیوں سے پاک کرنے

---

۱ - ۱۲ ربیع الاول ، یوم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ ہزار روپے

۲۷ رجب	...	۱۰ ہزار روپے
۱۵ شعبان	...	۱۰ ہزار روپے
۱٦ رمضان	...	۳۰ ہزار روپے
۱۰ محرم	...	۱۰ ہزار روپے

میزان ۷۲ ہزار روپے

اور ۵۰ ہزار روپے ملکہ ممتاز محل کے سالانہ فاتحہ کے لیے ۔ اگر بادشاہ اس وقت دارالحکومت سے باہر رہتا تو صرف ۱۲ ہزار روپیہ خرچ کیا جاتا تھا ۔ یہ خیرات صرف شہر آگرے تک محدود رہتی تھی ۔ میری رائے میں ۷۲ ہزار روپے خیرات کرنے کا فائدہ محض مسلمانوں کو پہنچتا ہوگا کیونکہ اسلامی روایات کے بموجب ایسی خیرات کے مستحق صرف اہل دیں اور نیک چلن مسلمان ہی ہوسکتے ہیں ۔

اور اس کے ذریعے صرف مستحقین کو فائدہ پہنچانے کی جانب ، اس قدر توجہ صرف کی تھی - ان چار طبقوں میں جن کے افراد کا شمار مستحقین[1] میں ہوتا تھا ایسے لوگ شامل تھے جو عامۃالناس کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے اور جن کا وقت کسی دوسری خدمت کے بہ نسبت اسی کام میں زیادہ بہتر طریقے پر صرف ہو سکتا تھا لہٰذا انھیں فکر معاش سے آزاد کر دیا جاتا تھا - اس کے مستحق ہر درجے کے ادباء اور ایسے علما و درویش سمجھے جاتے تھے جو خدمت دین میں ہمہ تن مصروف رہتے ہوں - تیسری صورت ایسے پرانے شریف خاندانوں کی حفاظت تھی جن کے اخلاف امتداد زمانہ کے ہاتھوں کسب معاش سے معذور ہو گئے تھے - ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں اور صوبائی افسروں کے نام خاص طور پر یہ احکام جاری کیے گئے تھے کہ وہ ان کا خاص خیال رکھیں - سرکاری حکام کے ورثا کے لیے جو انتظامات تھے اور امرائے دربار کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں کی تعلیم اور پرورش کے انتظامات ، سب اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھے - چوتھے گروہ میں ضعیف العمر ، کمزور ، معذور و مجبور اشخاص نیز ایسے اشخاص شامل تھے جو وقتاً فوقتاً ناساز گار حالات کا شکار ہو جاتے تھے - یہ ایسے ہی لوگ ہوتے تھے جنھیں ہم آجکل کی زبان میں بے روزگار کہتے ہیں - شیخ ضیاء اللہ نامی ایک شخص کا معاملہ اکبر کے سامنے پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ اس کا خاندان مفلوک الحالی کی وجہ سے صرف غلے پر گزارہ کر رہا ہے - نیز یہ کہ اس کا

---

۱ - دیکھئے صفحہ ۳۹۱ ، ۳۹۲

تعلق علماء کے ایک شریف خاندان سے ہے - اکبر کے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا اور اس نے شخص مذکور کو ان لوگوں میں شامل کرلیا جو ''عبادت خانے'' کے خاص جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے -[۱]

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اکبر نے یہ کام خود اپنے ذمے رکھا اور اکثر اوقات اس نے اپنے ہاتھ سے خیرات تقسیم کی یا اپنی نگرانی میں تقسیم کرائی - اس سلسلے میں بھی صدر کے اختیارات و اثرات کم کر دیے گئے - محتاج خانے، ابوالفضل کی نگرانی میں رکھے گئے اور دیگر مواقع پر، دیوان صدر کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا - جہانگیر نے اس طریقے کو برقرار رکھا اور بڑی احتیاط سے کام لیتا رہا - خیرات تقسیم کرنے کے لیے وہ اکثر کئی کئی آدمی مقرر کیا کرتا تھا تاکہ اس کا فائدہ زیادہ عام ہو سکے -[۲] ایک مرتبہ جب وہ کابل میں مقیم تھا، اس نے ہر جمعرات کو ایک ہزار روپیہ تقسیم کرنے کے لیے بارہ اشخاص مقرر کیے -[۳] شاہ جہاں نے ۲۰ سنہ جلوس میں ۱۰ قابل اعتماد اشخاص کے سپرد یہ کام کیا -[۴]

---

۱ - بدایونی، جلد دوم، صفحات ۲۰۱ و ۲۰۲

۲ - تزک - ایک سے زائد اشخاص کے تقرر کی مثالیں - صفحات ۲۱، ۳۹، ۵۱، ۱۲۰ - احمدآباد کے قریب بیوہ عورتیں اور دیگر معذور اشخاص جمع کیے گئے اور جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے خیرات تقسیم کی (صفحہ ۲۲۹)

۳ - تزک، صفحہ ۵۱ -

۴ - لاہوری - صفحہ ۶۳۱

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ بادشاہوں کی نیت بھی نیک تھی اور خیرات کی رقوم بھی بہت بڑی بڑی ہوتی تھیں، تاہم عام لوگوں کو اس سے کوئی مستقل فائدہ نہ پہنچا۔ مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں خیراتی و رفاہی امور کا انتظام کچھ بہت منضبط نہیں معلوم ہوتا۔ ان معنوں میں اس کے فائدے وقتی اور عارضی تھے۔ مقررہ وظائف اور عطیات اراضی کے علاوہ خیراتی و رفاہی امور کے لیے کوئی مستقل ادارہ یا نظام قائم نہ کیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان خیراتوں کی وجہ سے کچھ غریب لوگ فاقہ کشی سے بچ جاتے تھے اور بادشاہ جہاں کہیں جاتا تھا اپنے اس فرض کو خاص طور سے یاد رکھتا تھا۔

فہرست صدور

اکبر کے دور حکومت میں :—

۱- شیخ گدائی کنبوہ
۲- خواجہ محمدؐ صالح
۳- شیخ عبدالنبی
۴- سلطان خواجہ
۵- میر فتح اللہ شیرازی
۶- میراں صدر جہاں

جہانگیر کے دور حکومت میں :—

میران صدر جہاں اپنے انتقال تک، جو ۱۲۰ سال کی عمر میں ہوا، اس عہدے پر فائز رہا (تاریخ معلوم نہیں۔ ۱۱ سنہ جلوس تک اس کا ذکر ملتا ہے)

۷- موسوی خاں (تاریخ تقرر معلوم نہیں)

شاہ جہاں کے دور حکومت میں :-

موسوی خاں ۱۶ سنہ جلوس تک اس عہدے پر فائز رہا - بعد ازاں معزول کیا گیا -

۸- سید صدر جلال بخاری گجراتی (اپنے انتقال تک جو ۲۰ سنہ جلوس میں ہوا)-

۹- سید ہدایت اللہ - ۲۱ سنہ جلوس سے حکومت کے اختتام تک (شاہ جہاں کی جانب سے افضل خاں کی معیت میں اورنگ زیب سے گفت و شنید کی)

اکبر کے اکثر صدور صاحب منصب نہ تھے - انھیں صرف زمینیں دے دی گئی تھیں - آخری صدر ، میران صدر جہاں کا منصب دو ہزاری تھا - جہانگیر نے اسے چار ہزار کر دیا - حتیٰ کہ وہ ۵۰۰۰ اور ۱۵۰۰ تک پہنچا - موسوی خاں کا منصب ابتدا میں سہ ہزاری تھا بعد میں ترقی کر کے وہ ۴۰۰۰ اور ۷۰۰ تک پہنچا - سید جلال نے ۴۰۰۰ اور ۷۰۰ سے ابتدا کی اور ۶۰۰۰ اور ۲۰۰۰ تک پہنچا کوئی صدر اس سے بلند منصب حاصل نہ کر سکا - وہ یقیناً تمام صدور میں بہترین تھا اور علم و فضل ، ایمانداری ، دیانت اور بے نفسی کے لیے اس کا بہت احترام کیا جاتا تھا -

باب نہم

وزراء کی حیثیت ، اور اُن کے اختیارات پر قیود

خاکہ

مسلم فقہا کی رائے سے اختلاف۔

دیوان اعلیٰ اور میر بخشی

میر ساماں

صدر

وزراء کی حیثیت ایک دوسرے کے مقابلے میں

وزراء کے اختیارات پر قیود

(۱) درباری عہدہ داروں کے ذمے امور مملکت

(۲) مجالس کی شرکت محض وزراء تک محدود نہ رہی — —طریقۂ بحث۔ کس قسم کے مسائل زیر بحث آتے تھے۔

(۳) تمام امور پر بادشاہ کی نگرانی

مسلم فقہا کی رائے سے اختلاف

گزشتہ ابواب میں یہ بیان ہوچکا ہے کہ مسلم فقہا نے وزیر کا کیا درجہ متعین کیا تھا ، مشرقی ممالک کے مسلمان بادشاہوں کے وزرا نظم و نسق میں کتنا اثر رکھتے تھے اور اکبر نے کن مقاصد سے اپنے نظام وزارت میں اصلاحات کیں ۔

مسلم فقہا کا جو یہ فیصلہ تھا کہ امور سلطنت میں ایک وزیر کو پوری طرح با اختیار اور دخیل ہونا چاہیے اور اس سے غیر محدود وزارت کے جو امکانات پیدا ہوتے تھے ، اس میں اس بات کی گنجائش رہتی تھی کہ کمزور ، لاپروا یا کمسن حکمرانوں کے زمانے میں ایک با اختیار وزیر پورے نظم و نسق کو با آسانی سنبھال سکے ۔ اکبر نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ وزیر کے اختیارات و اثرات کم ہو جائیں تاکہ وہ سلطنت میں سیاہ و سفید کا مالک نہ بن سکے ۔ اس طرح اکبر کے اغراض و مقاصد مسلم فقہا کے اغراض و مقاصد سے مختلف تھے ۔ اس لیے اس نے ان کی رائے سے انحراف کیا ۔

سب سے پہلے اکبر کی اس حکمت عملی کا اثر دور مغلیہ کے وکیل پر پڑا ، جس کے ہاتھوں میں تمام دیوانی ، فوجداری اور عدالتی اختیارات مرتکز تھے ۔ اس کا عہدہ تو قدیم شان و شوکت کے ساتھ برقرار رہا مگر اس کے اختیارات سلب کر لیے گئے ۔

دیوان اعلیٰ اور میر بخشی

اصل اختیارات دیوانی و فوجداری ، دیوان اعلیٰ اور میر بخشی کے درمیان تقسیم کر دیے گئے لیکن انھیں ایک دوسرے سے آزاد نہیں رکھا گیا جس طرح سلطنت دہلی کے دور میں دیوان وزارت اور دیوان عرض

اپنے اپنے کام کے ذمہ دار رہتے تھے - فوجی اور مرکزی ملازمت کا نظام ایک یکساں نظام منصب داری پر قائم تھا جس نے مملکت کے دونوں خاص خاص محکموں کے بہترین انتظام کی ذمہ داری دونوں وزرا کے کاندھوں پر رکھ دی تھی -

روزمرہ کے انتظامی امور میں دیوان اعلیٰ کو نسبتاً کچھ بلند درجہ حاصل تھا لیکن اس کے مقابلے میں میر بخشی کا اثر، دربار شاھی کی خدمات کی وجہ سے، مرکزی حکومت میں زیادہ تھا - دیوان اعلیٰ (یا وزیر) کے عدالتی اختیارات سلب ہوجانے کی وجہ سے اس کی حیثیت پر اور زیادہ برا اثر پڑا - یہ اختیارات مسلمان سلطنتوں میں بالعموم وزیر اول کو حاصل رہتے تھے - غرضکہ یہ دونوں عہدہ دار اپنے اپنے محکمے کے صدر رہے ، دونوں مل جل کر ان حدود کے اندر کام کرتے ، جنھیں قطعی اور واضح طور پر معین کر دیا گیا تھا اور دونوں محض بادشاہ کے سامنے جواب دہ تھے -

میر ساماں

وزیر سوم یعنی میر ساماں کے فرائض منصبی اور روزمرہ کے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہم یہ توقع کرسکتے تھے کہ اس کی حیثیت ابن خلدون کے امیرحاجب کی سی ہوگی یا ویسی ہوگی جو سلطنت دھلی میں وکیل در اور باربک کی ہوتی تھی لیکن ایسا نہ تھا - میر ساماں کا عمل دخل دو باتوں کی وجہ سے محدود ہوگیا تھا - اول اس وجہ سے کہ دربار سے متعلقہ فرائض میر بخشی کے سپرد کردیے گئے تھے - دوم اس وجہ سے کہ داروغۂ غسل خانہ کا عہدہ قائم کر دیا گیا تھا جس کی معرفت خلوت خانے کی تمام اہم اور خفیہ کارروائیاں انجام پاتی تھیں - سوم

اس وجہ سے کہ اس محکمے کے دیوان کو غیر معمولی بلند درجہ عطا کردیا گیا تھا ۔ محکمۂ مذکور میں آخرالذکر کے اختیارات بھی وھی تھے جو اول الذکر کے تھے اور اس کی اھمیت کا اندازہ متعدد دیوانہائے بیوتات کی مثالوں سے ھو سکتا ھے جو وزارت اعلیٰ تک براہ راست پہنچ جاتے تھے ۔ ان میں مظفر خاں ، مقیم ، اور غیاث بیگ اعتمادالدولہ کے نام لیے جا سکتے ھیں ، اس سے معلوم ھوتا ھے کہ میر ساماں کو نہ اتنے اختیارات حاصل تھے نہ اس کا اتنا عمل دخل تھا جس کے باعث وہ درگاہ یا دربار کے افسر اعلیٰ کی حیثیت حاصل کر سکتا ۔ تاھم اس کا درجہ دیگر وزرا کے مساوی تھا اور میر بخشی کی طرح دربار میں بادشاہ کے قریب رھنے کی وجہ سے ان کے مساوی اثر بھی رکھتا تھا ۔

اس سے واضح ھوجائے گا کہ میر بخشی اور میر ساماں کے درمیان وھی تمام فرائض منقسم تھے جو دھلی کے وکیل در اور باربک کے یاسامانیوں کے حاجب بزرگ[1] کے اور عباسیوں کے صاحب الشرطہ[2] کے ذمے ھوتے تھے اور جن کا اثر متعلقہ سلطنتوں کے دربار میں سب سے زیادہ رھتا تھا ۔

---

۱ - ترکستان مولفہ بارتھولڈ ۔ صفحہ ۲۲۷ ۔ اس کا شمار زعمائے سلطنت کی صف اول میں ھوتا تھا ۔

۲ - ترکستان مولفہ بارتھولڈ ۔ صفحہ ۲۲۸ - درگاہ کے عہدہ داروں میں اس کا شمار دوسرے درجے میں تھا ۔ بموجب بیان نظام الملک ، بحوالہ سیاست نامہ ۔ صفحہ ۸۱ ۔ وکیل در کے فرائض میں باورچی خانے وغیرہ کا انتظام ھوتا تھا ۔ شاھان مغلیہ کا وکیل اس سے مختلف تھا دونوں کو ایک نہ سمجھنا چاھیے ۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ھے کہ شہر کا فوجی انتظام جو بالعموم صاحب الشرطہ سے منسوب کیا جاتا ھے ، مغلوں کے دور حکومت میں ایک علٰحدہ افسر کے ذمے رھتا تھا ۔

داروغۂ غسل خانہ ، خلوت خانۂ شاہی میں بادشاہ کے معتمد خاص کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور عرض مکرر تمام شاہی احکام پر نظر ثانی کرنے کے بعد دوبارہ انھیں بادشاہ کے سامنے بغرض منظوری پیش کرتا تھا ۔ یہ دونوں نئے عہدے قائم ہو جانے کے باعث ، نیز دونوں عہدہ داروں کو براہ راست بادشاہ کی ماتحتی میں رکھے جانے کی وجہ سے اور ان پر ایسے قابل اعتماد اشخاص کے تقرر کے باعث جنھیں بادشاہ بذات خود اچھی طرح جانتا تھا ۔ صف اول کے ان تینوں وزرا پر مزید نگرانی قائم ہو گئی ، جنھیں اپنے فرائض کی نوعیت و اہمیت کی وجہ سے بادشاہ کا قرب حاصل رہتا تھا ۔

دیگر مسلم سلطنتوں میں جو فرائض دبیر کے ہوتے تھے وہ سب یہاں داروغۂ غسل خانہ ، عرض مکرر اور مسودہ نویس (افسر تسوید فرامین) میں منقسم تھے ۔ ان عہدہ داروں کا وہی احترام ہوتا تھا جس کا ذکر چہار مقالہ[1] میں دبیر سلطنت کے متعلق کیا گیا ہے ۔

صدر چوتھا وزیر صدر تھا اس کے ملک کی مسلم آبادی پر اثر انداز ہو جانے کے جو وسیع امکانات تھے ان کی بنیادیں اکبر نے ہلا دیں ۔ تمام غیر مسلموں سے اس کی رواداری کی عام حکمت عملی کے باعث صدر کی وہ سرگرمیاں محدود ہو گئیں جن کے ذریعے وہ مسلم طبقۂ آبادی پر اپنا اثر قائم رکھتا تھا ۔

انتظامی نقطۂ نظر سے اس کے اختیارات (اول) نظم و نسق کے داخلی انتظامات کے ذریعے محدود کر دیے گئے جس کے بموجب

---

۱ ۔ صفحات ۱۲—۲۵ (فارسی متن ، گب میموریل سیریز)

منظور کردہ تمام عطیات اراضی کا دیگر تمام وزرا کے ھاتھوں سے گزرنا ضروری قرار پایا - (دوم) ان پابندیوں کے ذریعے جو عطیات منظور کرنے کے اختیار کے استعمال پر عائد کر دی گئیں اور (سوم) ھر صوبے کے لیے الگ الگ صدر مقرر کر کے صدر کے مذکورہ اختیارات محدود کر دیے گئے - حالانکہ جہانگیر اور شاہ جہاں اپنے اپنے زمانے کے صدور پر مہربان تھے لیکن انھوں نے بھی اکبر کی قائم کردہ حکمت عملی میں کوئی تبدیلی نہیں کی -

صدر ، عدلیہ کا صدر بھی باقی رھا لیکن ایسا معلوم ھوتا ھے کہ بادشاہ بذات خود مقدمات کا فیصلہ کرنے اور اس کے لیے بلا ناغہ ھفتہ وار عدالتی اجلاس منعقد کرنے کی وجہ سے صدر کے عدالتی اختیارات کو کافی نقصان پہنچا - صدور کا اثر ان کی سرگرمیوں کے تمام شعبوں سے کافی حد تک زائل ھو گیا اور وہ اختیار ، اعزاز اور وقار کے اس درجے پر کبھی فائز نہ ھو سکے جس کی سفارش مسلم فقہا نے ان کے عہدے کے لیے کی تھی - ان کا جو کچھ احترام کیا جاتا تھا وہ محض ذاتی ھوتا تھا لہذا ان میں سے جو صدر جتنا قابل ، جتنا اھل اور اپنے کام میں جتنا ھوشیار ھوتا تھا اتنی ھی اس کی عزت کی جاتی تھی -

غرضکہ مسلم فقہا کے تجویز کردہ کامل الاختیار و حاوی کل وزیر کے اختیارات مساوی درجہ و حیثیت رکھنے والے چار وزیروں کے درمیان منقسم تھے اور طریقۂ کار ایسا متعین ھوگیا تھا کہ چاروں وزرا اپنے اپنے محکموں سے انتظام میں آزاد تھے لیکن اس کے باوجود متعدد مسائل میں ایک دوسرے کے ساتھ ان کا رابطہ بھی قائم رھتا

تھا - اس انتظام میں نہ اس امر کا امکان تھا کہ تمام اختیارات صرف ایک وزیر کے ھاتھ میں پہنچ جائیں نہ اس بات کی گنجائش تھی کہ کوئی وزیر باقی وزراء پر حاوی ہو جائے۔

وزراء کی حیثیت ایک دوسرے کے مقابلے میں

جب کبھی کوئی شخص وکیل مقرر ہوتا تو اس کا درجہ سب سے بلند اور حکومت میں اس کا مقام اعلیٰ ترین ہوتا تھا - حالانکہ چند مثالیں ایسی بھی ھیں کہ بعض دیگر اشخاص کی تنخواہ کا گریڈ بھی وکیل کے برابر ھؤا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی کا درجہ وکیل سے اونچا رہا ہو۔

چاروں مستقل وزراء میں دیوان کو یقیناً نظم و نسق میں سب سے اعلیٰ حیثیت حاصل تھی لیکن ہر وقت اسے سب سے زیادہ تنخواہ نہیں دی گئی - ایسی مثالیں موجود ھیں جب کہ دیوان اعلیٰ کا منصب ۱۰۰۰ یا ۲۰۰۰ ذات سے شروع ہوا لیکن دیگر عہدہ دار شش ہزاری بلکہ ہفت ہزاری منصب رکھتے تھے - تمام ملازمتوں میں منصب ذاتی ہوتا تھا اور کسی عہدے کے لیے کوئی تنخواہ مقرر نہ ہوتی تھی - لہذا نظم و نسق میں دیوان اعلیٰ کو جو امتیاز حاصل رہتا اس کا تعلق اس کے عہدے سے ہوتا تھا نہ کہ اس کے ذاتی منصب یا اس کی تنخواہ کے گریڈ سے - یہ طریقہ کہ کسی بھی درجۂ ملازمت کے عہدہ دار کو وزیر اعلیٰ بنا دیا جاتا تھا اور اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہو جانے پر بھی اسے سب سے زیادہ تنخواہ نہ دی جاتی تھی ، اس کے اثر کو محدود رکھنے کا ایک مزید ذریعہ تھا ، اس طریقے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ

وزیر اعلیٰ محض اپنے عہدے اور ذاتی فوج کی وجہ سے جس کی تعداد اس کے ذاتی منصب پر منحصر تھی ، سلطنت کا سب سے زیادہ طاقتور عہدہ دار نہیں بن سکتا تھا -

میر بخشی کی حیثیت دیوان اعلیٰ سے کم ہوتی تھی - برنیر کہتا ہے کہ اس کی حیثیت دوسرے یا تیسرے وزیر کی ہوتی تھی لیکن لاہوری ، میر ساماں کے عہدے پر سعد اللہ خاں کے تقرر کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ عہدۂ مذکور وزارت اعلیٰ کے بعد ہی تھا - (در رتبہ تلو پایۂ گرانمایۂ وزارت است)[1] ابو الفضل ، میر بخشی کو بہ لحاظ درجہ دیوان کے بعد رکھتا ہے - لیکن وزراء کی فہرست میں وہ میر سامان کو بالکل شامل نہیں کرتا - اس کی وجہ مناسب مقام پر بیان کردی گئی ہے - میرا خیال بھی یہی ہے کہ میر بخشی کے فرائض کی نوعیت اور اس کے عمل دخل کو دیکھتے ہوئے اس کی حیثیت اس کے رفقائے کار کے درمیان یقیناً دوسرے درجے کی ہوگی - لاہوری کے الفاظ کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ عہدۂ مذکور کا حامل براہ راست وزارت اعلیٰ کے عہدے پر مقرر کیا جا سکتا تھا ، جس طرح کہ متعدد میر ساماں ، بشمول سعد اللہ خاں اس عہدے پر مقرر کیے گئے اور اسی طرح میر بخشیوں کا تقرر بھی کیا گیا -

اس طرح وزیروں میں میر ساماں کا درجہ تیسرا اور صدر کا درجہ بلا شبہ چوتھا ہوتا تھا اور اکبر کے عہد حکومت میں صرف میر فتح اللہ شیرازی کی ایک مثال ایسی ہے جو صدر سے دیوان اعلیٰ مقرر کردیا گیا تھا -

---

۱ - لاہوری ، جلد دوم ، صفحہ ۳۴۷ -

باب ۷ میں بیان ہو چکا ہے کہ دیوان بیوتات بھی براہ راست وزیر اعلیٰ بن سکتا تھا حالانکہ اس کا شمار کسی لحاظ سے بھی وزراء میں نہ ہوتا تھا اور شاہ جہاں کے عہد حکومت میں رائے رایاں کی واحد مثال ایسی ہے جو ایک مستقل دیوان کل بنا دیا گیا تھا حالانکہ وہ اسی محکمے میں ایک ماتحت عہدے پر کام کرتا تھا۔

وزراء کے اختیارات پر قیود

توازن اختیارات کا نظام چاروں وزراء کے درمیان اختیارات تقسیم کر دینے تک محدود نہ تھا۔ اکبر نے اپنی حکومت کے صیغوں کی نشو و نما کے دوران میں اس قسم کی مزید تدابیر اختیار کیں بعض انتظامی امور کی نگرانی ان افسروں کے سپرد کر دی جاتی تھی جو دربار سے معلق رہتے لیکن مرکزی حکومت کے کسی محکمے میں کسی عہدے پر فائز نہ ہوتے تھے۔

(۱) درباری عہدہ داروں کے ذمے امور مملکت

باب پنجم میں بیان ہو چکا ہے کہ حکیم ابوالفتح اور زین خان کوکہ کو ایک مرتبہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دیوان کے دفتر میں بیٹھا کریں اور وہاں کے معاملات سے اپنے کو باخبر رکھا کریں۔

۲۷ سنہ جلوس میں بازاروں کی نگرانی کا کام متعدد ممتاز عہدہ داروں کے سپرد کیا گیا اور کئی چیزوں کی فروخت ان کی نگرانی میں دے دی گئی۔[1] ۲۸ سنہ جلوس میں نظم و نسق

---

۱ - اکبر نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۳۹۶ - مرزا خاں کے ذمے گھوڑوں کی ، راجہ بیر بل کے ذمے گایوں کی اور ابوالفضل کے ذمے اونی اشیاء کی فروخت کی نگرانی رکھی گئی - اس طرح دیگر اشیاء کی فروخت

کے بعض شعبوں کی عام نگرانی بھی ممتاز اشخاص کے سپرد کی گئی جن میں شہزادے بھی شامل تھے۔[1] ۳۶ سنہ جلوس میں[2] اراضی خالصہ کو چار حصوں میں تقسیم کرکے چار مختلف اشخاص کے تحت رکھا گیا۔ ۳۹ سنہ جلوس میں عہدہ داروں کو مناسب جاگیریں عطا کرنے کے لیے آصف خان قزوینی کو کشمیر بھیجا گیا حالانکہ اس وقت دیوان کے محکمے سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔[3] ۴۰ سنہ جلوس میں ممنوعہ محصول تمغا[4] کی وصولی کو ختم کرنے کے لیے قلمرو کو پانچ حلقوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حلقہ اسی قسم کے ایک عہدہ دار کے ماتحت رکھا گیا۔ خود بادشاہ نے ایک حلقہ اپنے ماتحت رکھا۔ اسی طرح محصول باج[5] کی وصولی روکنے کے لیے چار حلقے بنائے گئے۔

کا انتظام کیا گیا۔ نگرانی کرنے والوں کو خرید کنندہ سے نصف فی صد اور فروخت کنندہ سے ایک فی صد کمیشن ملتا تھا۔

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۴۰۴ - جہانگیر کے ذمے سزا، انعامات، شادی اور پیدائش سے متعلقہ تقریبات کی نگرانی تھی۔ مذکورہ صورتوں میں ہر شعبے میں ایک سے زیادہ آدمی ہوتے تھے۔

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۶۰۵ - ابوالفضل کہتا ہے "حالانکہ قلیج خاں (دیوان) اچھا کام کررہا تھا لیکن ملک کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ کارروائی دور اندیشی پر مبنی تھی۔"

۳ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۶۶۱ -

۴ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۶۷۰ -

۵ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۸۰۱، ۴۶ سنہ جلوس بعض صورتوں میں وزرا بھی شامل کر لیے گئے تھے۔

(۲) مجالس کی شرکت محض وزراء تک محدود نہ رہی -

وزراء کے اختیارات پر قابو رکھنے کے لیے ایک کارروائی یہ بھی کی گئی کہ شاہی مجالس میں دیگر عہدہ داران و امراء کو بھی شریک کیا گیا - معلوم ہوتا ہے کہ مجالس مذکور تین قسم کی ہوتی تھیں - (اول) وہ مجالس جن میں محکموں کے متعلقہ امور زیر بحث آتے تھے - (دوم) جن میں خالص انتظامی امور کے سوا تمام اہم سیاسی و فوجی امور پر بحث ہوتی تھی - اور (سوم) جن میں عمومی و علمی مسائل بادشاہ کی موجودگی میں زیر بحث آتے تھے -

محکموں کے متعلقہ امور کے بارے میں مجلسیں اکبر کے عہد حکومت میں زیادہ ہوتی تھیں، کیونکہ اُس زمانے میں مختلف صیغے ابھی نشو و نما پا رہے تھے لہذا ایسی مجالس کی زیادہ ضرورت تھی - بعد ازاں جب قواعد منضبط اور روایات قائم ہو چکی ہوں گی، تو ایسے امور کا انتظام بادشاہ کے مشورے سے وزرا کرنے لگے ہوں گے - یہی وجہ ہے کہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں ایسی مجالس کا ذکر نہیں ملتا - حتیٰ کہ سعداللہ خاں کے زمانے میں نظام منصب داری میں جو تبدیلیاں کی گئیں اُن کے لیے بھی کسی مجلس کے انعقاد کا ذکر نہیں ملتا - اکبر کے زمانۂ حکومت میں بھی اہل مجالس میں صرف وزرا محکمہ جات کے صدر کی حیثیت سے شریک ہوا کرتے تھے - ان کا ذکر باب ۵ میں ہو چکا ہے -

دوسری قسم کی مجالس تینوں شہنشاہوں کے زمانے میں عام طور پر منعقد ہوا کرتی تھیں اور ان کا ذکر ہر عہد حکومت میں ملتا ہے۔ مانسریٹ[1] ان جنگی مجالس کا ذکر کرتا ہے، جو اس کے قیام کے دوران میں اکبر نے اس وقت منعقد کی تھیں جبکہ وہ اپنے بھائی حکیم مرزا کے خلاف فوج کشی کر رہا تھا۔ ابوالفضل نے اس نوعیت کی متعدد مجالس کا ذکر کیا ہے۔ ۱۷ سنہ[2] جلوس میں حملۂ گجرات کا ذکر کیا گیا ہے اور ۱۹ سنہ جلوس میں بنگال کی صورت حال کا ذکر ملتا ہے، جب کہ راجہ بھگونت داس، بیربر، ٹوڈرمل، لشکر خاں، اور شہباز خاں نے بحث میں اہم حصہ لیا تھا۔ تمام مواقع پر بادشاہ نے صدارت کی تھی۔ ابوالفضل ایک اجلاس کی مفصل روئداد بیان کرتا ہے جس میں مرزا حکیم کے اس خط پر بحث کی گئی تھی جس میں اس نے صلح کی درخواست کی تھی۔ اس موقع پر اکبر اجلاس میں شریک نہیں ہوا اور ابوالفصل کو ہدایت کی گئی کہ وہ بحث کا آغاز کرے اور ہر شخص کی رائے سے بادشاہ کو مطلع کرے۔ ہر شخص نے یہی رائے دی کہ صلح قبول کر لی جائے اور کابل پر چڑھائی نہ کی جائے۔ لیکن ابوالفضل نے دلائل کے کے ساتھ یہ مشورہ دیا کہ کابل پر فوراً چڑھائی کر دی جائے۔ وہ آپس میں متفق الرائے نہ ہو سکے اور یہ طے ہوا کہ

---

۱ - صفحہ - ۲۱۳ -

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۴ -

ہر شخص فرداً فرداً بادشاہ سے گفتگو کرے۔ اکبر نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا چنانچہ کابل پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا گیا اور نتیجے نے ثابت کر دیا کہ اس کا یہ اقدام حق بجانب تھا [1]۔

طریقۂ بحث

مذکورہ مجالس میں بحث کا طریقہ کیا تھا اس کی بابت مانسریٹ کہتا ہے:

''وہ (بادشاہ) ہر مشیر کی رائے فرداً فرداً معلوم کرتا ہے اور پھر خود ایسا فیصلہ کرتا ہے جس کی تائید اکثریت کرے اور اس میں سب سے زیادہ تجربہ رکھنے والے مشیر شامل ہوں۔ وہ ان کی رائے ایسے مسائل کے متعلق بھی معلوم کرتا ہے جن کی بابت اس نے پہلے ہی کوئی رائے قائم کر لی ہو۔ ایسے موقع پر وہ امراء سے کہتا ہے ''میرے خیال میں یہ ہونا چاہیے۔ کیا تم اس سے متفق ہو؟،، وہ جواب میں کہتے ہیں۔ ''جہاں پناہ۔سلام،، اس پر بادشاہ کہتا ہے ''اچھا تو اس کی تعمیل کی جائے،،۔ لیکن اگر مشیروں میں سے کسی مشیر کو اس کی رائے سے اتفاق نہیں ہوتا تو وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اس کے دلائل سنتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات خود اپنی رائے تبدیل کر دیتا ہے،، [2]

اسی قسم کی مثالیں جہانگیر کے زمانے میں بھی ملتی ہیں لیکن زیادہ تر وہ دکن کی لڑائیوں سے متعلق ہیں اور ان کا

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحات ۳۵۷ - ۳۵۸ - ۲۶ سنہ جلوس -

۲ - مانسریٹ - حاشیہ - صفحات ۲۰۳ - ۲۰۴

ذکر دیوانان عہد مذکور کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔ شاہ جہاں کے زمانے میں خان اعظم لودی کے فرار ہونے کے واقعے پر بھی، جس نے یکم سنہ جلوس میں بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی، اسی طرح بحث کی گئی تھی اور آصف خاں کی معرفت گفت و شنید کی گئی تھی۔

سیاسی نوعیت کا ایک سب سے زیادہ نمایاں واقعہ مرزا عزیز کوکہ کا واقع ہے جس نے جہانگیر کی تخت نشینی کی مخالفت کی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ جہانگیر کے وکیل، امیرالامراء سے ایک مجلس میں ایسے وقت جھگڑا کر بیٹھا جبکہ بادشاہ خود اس مجلس میں موجود تھا۔ جہانگیر اس کی اس حرکت پر ناراض ہو کر مجلس سے اٹھ کر چلا گیا اور دربار میں اپنے امراء سے مشورہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانۂ حکومت میں بھی حسب مراتب فرداً فرداً مشورہ کرنے کا طریقہ رائج تھا۔ امیرالامرا نے کہا ''کوئی وجہ نہیں کہ اسے بلا تاخیر قتل نہ کر دیا جائے''۔ جب مہابت خاں کی باری آئی تو اس نے رائے دی کہ ''میں ایک سپاہی ہوں۔ مجھے حق نہیں کہ کسی مجلس میں رائے دوں۔ میں تلوار استعمال کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ (حکم دیے جانے پر) اگر میں ایک ہی وار میں اس کے دو ٹکڑے نہ کر دوں تو میرے ہاتھ قلم کر دیے جائیں''۔ خان جہاں لودی نے کہا۔ ''مجھے تو اس کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے کیونکہ جہاں کہیں جہاں پناہ کا نام نامی پہنچا وہیں اس کا نام

بھی مشہور ہو گیا۔ بظاہر تو اس سے کوئی قصور ایسا سرزد نہیں ہوا ہے کہ اسے قتل کی سزا دی جائے۔ اگر اسے قتل کر دیا گیا تو لوگ اسے مظلوم کہیں گے اور ہر شخص دنیا میں اسی کا ذکر کرے گا،،۔ ان الفاظ پر جہانگیر کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا اور اسی اثناء میں اس کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم موقع پر پہنچ گئی اور اس نے پردے کے پیچھے سے کہا کہ ،،تمام بیگمات مرزا کوکہ کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنے کے لیے یہاں جمع ہیں۔ مناسب ہو گا کہ آپ محلسرا میں تشریف لائیں، ورنہ ہم سب باہر نکل کر آپ کے پاس آتے ہیں،،۔ اس پر جہانگیر مجبور ہو گیا۔ ان سے گفتگو کرنے کے لیے اندر گیا۔ ان کی سفارش منظور کی اور میرزا کا قصور معاف کر دیا۔[۱]

یہ معاملہ اور اسی قسم کے دیگر متعدد معاملات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ (۱) ایسے تمام اہم معاملات پر مجلس میں بحث کی جاتی تھی۔ (۲) ان مجالس میں محض وزرائے مملکت شریک نہ ہوتے تھے۔ (۳) ہر شخص وہاں یکے بعد دیگرے اپنے اپنے منصب اور درجے کے مطابق اپنی رائے ظاہر کرتا تھا۔ (۴) بالعموم بادشاہ ہی صدارت کرتا تھا۔ (۵) بحث و مباحثے میں صاف گوئی سے کام لیا جاتا تھا اور ہر شخص اپنی رائے آزادی کے ساتھ ظاہر کرتا تھا۔ (۶) آخری فیصلہ بادشاہ کرتا تھا اور حالانکہ وہ فیصلہ ہر وقت کثرت رائے کے مطابق

---

۱ - ماثرالامرا۔ جلد اول۔ صفحات ۶۸۶ - ۶۸۷

ہی نہ ہوتا تھا لیکن آزادی کے ساتھ بحث کرنے کا اثر بادشاہ کی ذاتی رائے پر یقیناً پڑتا تھا۔

تیسری قسم کی مجالس میں بھی اسی طریقے پر عمل کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات ان میں بہت مفید تجاویز پیش ہوا کرتی تھیں۔ ایک موقع پر اکبر نے حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ وہ کوئی ایسی اصلاح تجویز کریں جو ان کے خیال میں ضروری ہو۔ اس پر حاضرین میں سے ہر شخص نے اپنے اپنے خیال کے مطابق تجاویز پیش کیں۔ شہزادہ سلیم نے یہ تجویز پیش کی کہ کم سنی کی شادیاں موقوف کی جائیں۔ خان اعظم کوکہ نے سفارش کی کہ صوبائی گورنروں سے سزائے قتل کے اختیارات لے لیے جائیں۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ خیال ظاہر کیا کہ محل شاہی میں روزانہ خیرات تقسیم کی جائے اور امرا کو حکم دیا جائے کہ وہ ہر ہفتے، یا ہر ماہ یا ہر سال اپنی اپنی طرف سے یہی کام انجام دیں۔ راجہ بیربر نے یہ تجویز پیش کہ مختلف مقامات پر انسپکٹر مقرر کیے جائیں جو کسی رو رعایت کے بغیر مظلوموں اور فریادیوں کی حالت سے مطلع کرتے رہیں۔ قاسم خاں نے سفارش کی کہ سلطنت کی تمام سڑکوں پر مسافروں کے لیے سرائیں تعمیر کی جائیں۔ فیضی نے مشورہ دیا کہ بازار میں فروخت ہونے والی مختلف اشیاء کی قیمتیں مقرر کر دی جائیں۔ حکیم ابوالفتح نے شفا خانوں کے قیام کی خواہش ظاہر کی اور ابوالفضل نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر شہر اور قصبے کی مردم شماری کی

جانے اور ہر گھر کا جائزہ لے کر تمام باشندوں کے نام اور پیشے ، درج کیے جائیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہر شخص کے آمد و خرچ پر نظر رکھی جائے اور شرانگیزوں کی نگرانی کی جائے۔ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ایک صوبے کے ایک گورنر کے متعلق بحث کی گئی جو اپنی سخت گیری کے لیے بدنام تھا لیکن نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ شاہ جہاں نے انتظامی معاملات میں سختی اور نرمی کے استعمال سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے۔ لیکن ان مجالس میں انتظامی امور کی بہ نسبت عمومی و علمی نوعیت کے مسائل زیادہ زیر بحث آ۔ے تھے۔

ان مجالس کا موقع ایسے امراء اور عہدہ داروں کی موجودگی کے باعث نکل آتا تھا، جنھیں کچھ عرصے کے لیے دربار میں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ ان مجالس کی وجہ سے ایک طرف تو وزراء کے اختیارات پر ایک طرح کی نگرانی رہتی تھی اور دوسری طرف بادشاہ کو یہ موقع مل جاتا تھا کہ وہ اپنے متعدد لائق ملازمین کے تجربوں سے اور ان کی ذہنی قابلیت سے فائدہ اٹھا سکے۔

(۳) تمام امور پر بادشاہ کی نگرانی

سب سے آخری اور سب سے بڑا دباؤ خود بادشاہ کی ذات کا تھا۔ وہ دربار میں، مجالس میں نیز دوروں اور مہموں میں ہر جگہ خود موجود رہتا اور مملکت کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھتا۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات وہ عناصر جن میں باہمدگر سخت اختلاف ہوتا تھا متحد رہتے اور ان سے اس طرح کام لیا جاتا کہ مملکت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچتا۔

حصه سوم

باب دہم

نظام عدالت

خاکہ

اسلامی مملکت میں رعایا کی حیثیت۔ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے متعلق حکومت کے فرائض۔

سلاطین دھلی نے اس امر کا احساس اور اعتراف کر لیا کہ اسلامی قانون کی نظر میں مسلم و غیر مسلم مساوی شہری حیثیت رکھتے ھیں اور بلا رو رعایت انصاف کے مستحق ھیں۔ بلبن اور جلال الدین خلجی کے خیالات۔

نظام عدالت میں اسلامی قانون کا مقام اور شمالی ھند میں اس کے حدود اطلاق۔

مسلمان مملکت میں عدالت کا قیام۔ صرف دو ھستیاں—بادشاہ اور قاضی القضاۃ عدل گستری کی مجاز ھیں۔ قاضی القضاۃ—بادشاہ تقرر کرتا ھے—اس کے اختیارات۔ قاضی عسکر—قاضی القضاۃ کے مقابلے میں اس کی حیثیت۔

بادشاہ ایک شہر میں دو قاضی مقرر کر سکتا تھا۔

فرائض قاضی۔

عدالتی طریقۂ کار—نالش—شہادت—گواہ وغیرہ۔

مفتی تمام مقدمات میں ضروری نہ ہوتے تھے۔

محتسب - اس کے فرائض (الماوردی) -

مغلیہ نظام عدل بھی بالکل اسی طرز کا تھا - بادشاہ ــــ قاضی القضاۃ ــــ دو جج ــــ قاضی اور میر عدل ، ہر شہر میں ــــ مفتی - محتسب -

دور مغلیہ میں قاضی محض شہروں میں نہ ہوتے تھے - چھوٹے علاقوں میں بھی وہ مقرر کیے جاتے تھے -

بادشاہ اور عدل گستری ــــ معمولی مقدمات کی سماعت روزانہ دربار میں کی جاتی تھی ــــ تعین وقت ــــ اہم مقدمات ہفتے میں ایک بار ــــ ایک دن محض عدل گستری کے لیے مخصوص رکھا جاتا تھا -

دوروں پر بھی روزمرہ کے مذکورہ معمولات پر عملدرآمد ہوتا تھا - بادشاہ کے حضور کس قسم کے مقدمات پیش ہوتے تھے ــــ مقدمات دیوانی سے زیادہ مقدمات فوجداری -

مرافعہ ــــ کوئی خاص قواعد و ضوابط مقرر نہ تھے -

غیر جانبداری اور قانون کی سخت پابندی ــــ مثالیں ــــ مانسریٹ اور روجرز کے خیالات -

طریقۂ سماعت مقدمات فوجداری

عاملہ کو عدلیہ سے ہمیشہ علٰحدہ نہ رکھا جاتا تھا -

صوبائی گورنر اور دیوان کے اختیارات -

سزائیں ــــ اسلامی قانون کے بموجب چار قسمیں -

جرائم جن کی سزا موت تھی -

عہد مذکور کی تاریخی کتب سے جمع کیے ہوئے پچیس مقدمات کا تجزیہ۔

تعمیل سزائے موت۔

دیگر سزائیں۔

واقعات جو عتاب شاہی کے موجب ہوئے۔

سزائے قید —— سزا کے اصولوں پر عمل در آمد نہ ہوتا تھا۔ عاملہ کے ہاتھوں میں ظلم کا ایک ہتھیار —— انتظامات تسلی بخش نہ تھے۔ شاہی دورے ہی قیدیوں کی گلو خلاصی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتے تھے۔ ایسے واقعات کی مثالیں۔

اس نظام پر تبصرہ۔

باب ۸ میں اسلامی مملکت کے مسلم بادشاہوں کے وہ فرائض بیان ہو چکے ہیں جن کی رو سے آن پر قرآنی دستور کے مطابق حکومت کرنے اور اپنی قلمرو میں احکام شرعیہ نافذ کرنے کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ اسلام کے نظریۂ حکومت کے متعلق بحث کی جائے یا اس کے نظام عدالت کی تفصیلات بیان کی جائیں۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو سچے مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرنے میں مدد دے اور غیر مسلموں کے جان و مال کی حفاظت کی ضامن ہو اور انہیں اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دے۔

اس طرح ایک مسلمان بادشاہ کا فرض محض یہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے عہدے سے متعلقہ عام فرائض منصبی انجام دیتا رہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ مصرحہ ذرائع اور طریقوں سے اپنے مذہب کا وقار بھی قائم رکھے اور اسلامی قانون کے مطابق حکومت کرے۔

بلبن ہندوستان میں پہلا مسلم حکمران تھا جس نے اپنے آقا سلطان شمس الدین کی فتوحات کی تکمیل کے بعد، ہندوستان اور ہندوستانی رعایا کے مسائل سے باقاعدہ سابقہ پڑنے پر، صاف الفاظ میں غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کا اعلان کر دیا تھا۔ جلال الدین نے بھی ہندوؤں کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی اور آن سے مسلمانوں کے ساتھ برابر کا سلوک روا رکھا۔

اسلامی نظام حکومت کا یہ بہت اہم پہلو ہے کہ غیر مسلموں کے جان و مال کی حفاظت اور ان کے لیے پر امن زندگی کی ضمانت کی جائے اس کے علاوہ اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ سب سے بلا لحاظ مذہب و ملت انصاف کیا جائے۔ بادشاہی کا یہی پہلو تھا جس پر بلبن اور بغرا خاں نے زور دیا تھا۔ اسی پر مسلم فقہا بھی زور دیتے ہیں اور عدل وانصاف سے متعلقہ امور میں وہ رعایا کے ہر دو طبقات کو قانون کی نظر میں مساوی قرار دیتے ہیں "عدل و احسان تمام رعایا کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔ بادشاہ خدا کا سایہ ہوتا ہے اور رحم خداوندی کی نعمت کافر و مومن دونوں کے لئے یکساں ہے"[1] بادشاہ پر لازم ہے کہ وہ کمزوروں کو دست تظلم سے محفوظ رکھے کیونکہ پیغمبر اسلام کا فرمان ہے کہ "خدا کی جناب سے مظلوم کی فریاد کبھی مسترد نہیں ہوتی خواہ وہ مظلوم کافر ہی کیوں نہ ہو"۔[2]

قانون

صیغۂ عدل گستری ہی وہ صیغہ تھا جس میں سلاطین دہلی نے قانون اسلامی کو برقرار رکھا اور قابل حصول تاریخی شہادتوں کے پیش نظر یہی بات سلاطین مغلیہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اکبر کے زمانۂ حکومت میں اسلامی قانون سے انحراف کی

---

۱ - آداب سلطنت ـ ورق ۱۴

۲ - اکبر نامہ ، جلد سوم ، صفحات ۲۵۷ ، ۷۷۴ اور ۷۲۲ - نصیحت جو قاسم بیگ تبریزی "میر عدل اردو" (فوج) کو کی گئی -

بعض مثالیں بھی ملتی ھیں، لیکن وہ معدودے چند ھیں اور عملاً ان کا دائرہ اثر بھی بہت محدود تھا کیونکہ اس سلسلے میں اس کی حکمت عملی مسلم فقہا کے معینہ نظام عدل گستری پر کسی طرح اثر انداز نہ ھو سکی۔ قانون وراثت اور شادی طلاق کا تعلق مسلمانوں کے مذھبی عقائد و ایمان سے کچھ اتنا مستحکم ھے کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم ھو ھی نہ سکتی تھی۔ لہذا قانون دیوانی میں تو ھرگز کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی اور وہ آج[1] برطانوی ھند میں بھی اصلاً وھی ھے جو پہلے تھا

قانون شہادت اور قانون فوجداری سے البتہ کبھی کبھی تجاوز کیا گیا اور اکبر نے کئی بار اس بات پر زور دیا کہ قاضیوں کو محض گواھوں کے بیان پر بکیہ نہ کرنا چاھیے بلکہ معاملے کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے دیگر ذرائع سے بھی کام لینا چاھیے اور معلوم ھوتا ھے کہ اس کے قریبی جانشینوں نے بھی نظری طور پر تو نہیں لیکن عملی طور پر ضرور یہی اصول اختیار کیا۔ اسی طرح اس بات کا ثبوت بھی موجود ھے کہ بعض مقدمات فوجداری میں سزائیں من و عن اسلامی قانون کے مطابق تجویز نہیں کی گئیں۔ ان مقدمات کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا گیا ھے۔

حدود اطلاق

تمام مقدمات دیوانی اسلامی قانون کے مطابق طے کیے جاتے تھے۔

---

۱ - یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی تھی - مترجم

قانون فوجداری ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے مشترک تھا۔ اسی طرح مسلم قانون شہادت و معاہدہ کا اطلاق ہندوؤں پر بھی ہوتا تھا۔ وراثت، شادی اور اسی قسم کے دیگر امور سے متعلق ہندو قانون بھی اپنے اندر کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کی گنجائش نہ رکھتا تھا۔

قدیم دیہی نظام اور تمام ہندو ادارے جیسے تھے ویسے ہی برقرار رکھے گئے اور اس طرح اسلامی قانون کا دائرہ اطلاق اور بھی محدود ہو گیا۔ یہ نتیجہ تھا مسلم حکمرانوں کی رواداری کا نیز اس بات کا کہ وہ ان معاشری اداروں کے ساتھ جو اس معاشی دور حیات میں لوگوں کو بے انتہا عزیز تھے، کسی قسم کی مداخلت روا نہ رکھتے تھے [1] مکر جی کا خیال ہے کہ ہندو سیاسی مفکرین کی رائے کے بموجب ''عہدہ داران شاہی کو گاؤں کے باہر رہنا چاہیے'' اور ہندو حکمرانوں کے عہدحکومت میں ''وہ بالعموم مقامی امور کے انتظام میں اسی وقت دخل دیتے تھے جب ان کا مشورہ طلب کیا جاتا تھا''۔

اسی طرح سلاطین مغلیہ نے بھی دیہی اجتماعی زندگی کو بدلنے، یا اس کے قدیم اداروں میں مداخلت کرنے یا انہیں مرکزی نظام حکومت کے دائرے میں لانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی خود انتظامی برقرار رکھ سکے اور ''سارے ملک میں دیہی مجلسیں اب تک امور دیہی،

---

۱ - بیڈن پاول - "The Tribe and the village" صفحہ ۲۲۵

مالیات اور عدل گستری کا انتظام کررہی ہیں۔ نہ موریا خاندان کے حکمرانوں کی ضابطہ پرستی، نہ مسلمانوں کی یورشیں، نہ اکبر یا اورنگ‌زیب کا وہ نظام حکمرانی جس میں مرکز کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل تھے، نہ انگریزوں کا رعیت داری یا دوامی بندوبست، دیہی طبقوں کے ان قدیم حقوق کو نیست و نابود کر سکا جو ارتھ شاشتر میں مذکور ہیں——"[۱]

دیہات کو جن میں ملک کی ستر فی صد آبادی رہتی ہے، اس طرح خارج کردینے کے بعد عدل گستری سے متعلق حکومت کی ذمہ داری ملک کی صرف بڑی بڑی وحدتوں، مثلاً پرگنہ جات (یا قصبات) سرکاروں (یا اضلاع) اور صوبائی صدر مقامات (یا بلدات) تک محدود رہی۔

ان علاقوں میں ہندوؤں کے ان مقدمات کو جن کا تعلق میراث وغیرہ سے ہوتا، ہندو پنڈت ہندو مذہبی قانون کے مطابق طے کیا کرتے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں بدایونی لکھتا ہے کہ اکبر نے حکم دیا تھا کہ ہندوؤں کے مقدمات کا فیصلہ قاضی کے بجائے ہندو جج کیا کریں۔[۲] میرا خیال ہے کہ اس حکم کا تعلق صرف انہیں مقدمات سے تھا جن میں فریقین ہندو ہوتے تھے نہ کہ تمام دیوانی مقدمات سے۔ اس عہد کی تحریروں میں کہیں کہیں ایسے معاہدوں کے متعلق مقدمات کی مثالیں ملتی ہیں جن میں

۱- مکرجی - "مشرق کی جمہورتیں" Democracies in the East" - صفحہ ۲۰۷

۲- بدایوانی - جلد دوم، صفحہ ۳۰٦

دونوں فریق ہندو ہوتے تھے اور جن کی سماعت میر عدل کرتا تھا، یا جو بغرض فیصلہ بادشاہ کے پاس بھیج دیے جاتے تھے۔ اسی طرح ان مقدمات کی سماعت بھی، جن میں ایک فریق مسلم اور دوسرا غیر مسلم ہوتا تھا، سرکاری جج ھی کیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں فادر مانسریٹ کی یہ رائے کہ ”برھمن ایک سینیٹ اور ایک عوامی مجلس کے ذریعے وسیع النظری کے ساتھ حکومت کرتے ھیں“ اسی نظام عدل سے متعلق ھے جو دیوانی و فوجداری مقدمات طے کرنے کے لیے دیہات میں رائج تھا نہ کہ قلمرو کے دیگر علاقوں میں۔[1]

نظام عدل

سلاطین مغلیہ کا نظام عدل بالکل وھی تھا جو مسلم علماء قانون نے معین اور سلاطین دھلی نے شمالی ھند میں قائم کیا تھا۔

اگرچہ مسلم علمائے قانون کا اس امر میں اختلاف ھے کہ بادشاہ کسی قاضی کی مدد کے بغیر معدلت گستری کا حق رکھتا ھے یا نہیں، تاھم وہ اس امر پر متفق ھیں کہ اسے بذات خود عدل گستری کا حق حاصل ھے لیکن چونکہ قانون کے مطابق عدل گستری کے لئے فنی معلومات کی ضرورت ھے لہذا اس کا فرض ھے کہ وہ عہدۂ قضاء پر علماء عصر میں سے بہترین شخص کو مقرر کرے۔ اس طرح چونکہ عہدۂ مذکور ناگزیر قرار پایا لہذا انہوں نے یہ تجویز بھی کی کہ ایک جماعت ایسے علماء کی بھی ھونا چاھیے جو قانونی نکات

---

۱ - مانسریٹ - صفحہ ۲۱۹

کے متعلق فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے ہوں اور انہیں میں جو شخص سب سے زیادہ قابل ہو اسے قاضی القضاۃ مقرر کر دیا جائے۔

غرضکہ وہ صرف بادشاہ اور قاضی القضاۃ کو عدل گستری کا مجاز قرار دیتے ہیں۔

قاضی القضاۃ | ان کی رائے کے مطابق بادشاہ ایسے شخص کو قاضی القضاۃ مقرر کرے جسے وہ بذات خود جانتا ہو اور جو عہدۂ مذکور کے لئے بہترین ہو۔ اگر اسے بادشاہ اصالتاً نہ جانتا ہو تو ضروری ہے کہ علمائے کرام کی ایک جماعت اس کے علم و فضل کا امتحان لے اور اس کے ہمسایوں سے اس کی چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جائے۔

اس کا تقرر | یہ بھی ضروری ہے کہ بادشاہ خود کسی شخص کو یہ عہدہ پیش کرے نہ یہ کہ کوئی شخص اس کا طالب ہو (سزاوار نیست کسیکہ طلب قضا کند)

بادشاہ کو حق حاصل ہے کہ وہ قاضی کو عہدۂ قضا سے علحدہ کردے کیونکہ جو شخص قاضی کے تقرر کا حق رکھتا ہے وہ اسے بر طرف بھی کر سکتا ہے۔ مسلم فقہا کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ قاضی صرف ایک معینہ مدت کے لئے مقرر کیا جانا چاہیے۔ بعض کا خیال ہے کہ اسے صرف ایک سال کے لئے مقرر کرنا چاہیے تاکہ وہ حصول علم سے

غافل نہ ہو جائے (زیرا کہ علم را فراموش نہ کند)

اس کے اختیارات

جو شخص ملک کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا جاتا ہے اسے اپنے عہدے کی رو سے قلمرو کے مختلف حصوں کے لیے ماتحت قضاۃ مقرر کرنے کا حق بھی حاصل ہوجاتا ہے اور فقہا کی رائے میں بادشاہ کے یہ الفاظ ادا کر دینے پر کہ ''میں نے تجھے قاضی مقرر کیا'' (ترا قاضی ساختم) اسے عہدۂ مذکور کے متعلقہ تمام حقوق مل جاتے ہیں۔ الماوردی کو اس سے اختلاف ہے۔ اس کے خیال میں قاضی القضاۃ کو حقوق مذکور حاصل نہیں ہوتے تاوقتیکہ بادشاہ یہ نہ کہے کہ ''قاضی ساختم ترا بر ہر کس و در ہمہ واقعات'' یعنی میں نے تجھے سب پر اور تمام امور کے لئے قاضی مقرر کیا۔

بادشاہ قاضی کے اختیارات میں مداخلت کا حق نہیں رکھتا۔ اگر وہ قاضی کو حکم دے کہ وہ کسی خاص مقدمے میں شہادت نہ لے یا جب تک بادشاہ سفر سے دارالحکومت واپس نہ آئے وہ کسی مخصوص مقدمے کی سماعت ملتوی رکھے تو ایسا حکم نہ جائز ہوگا نہ قاضی کے لیے واجب التعمیل۔ اسی طرح جب قاضی کسی مقدمے کی سماعت ختم کرکے اس کا فیصلہ قانون کے بموجب سنادے اور وہ فیصلہ منصفانہ بھی ہو تو بادشاہ کا یہ حکم کہ مقدمۂ مذکور کی سماعت دوبارہ کی جائے، جائز نہیں۔

قاضی عسکر

بادشاہ کو فوج کے لیے ایک علیٰحدہ قاضی (قاضی عسکر) مقرر کرنے کا حق حاصل

ہے۔ لیکن اس کے اختیارات اسی علاقے تک محدود رہتے ہیں جو اس کے لیے معین کردیا جائے۔ اگر کسی مقدمے کا ایک فریق قاضی عسکر کے علاقے میں ہو اور دوسرا قاضی شہر کے علاقے میں رہتا ہو اور یہ دوسرا فریق اس بات پر مصر ہو کہ مقدمے کی سماعت قاضی شہر کی عدالت میں کی جائے تو قاضی عسکر اس مقدمے کی سماعت نہیں کر سکتا تاآنکہ اسے خاص طور پر ایسے تمام مقدمات کی سماعت کے اختیارات تفویض نہ کیے گئے ہوں جن میں ایک فریق کی سکونت اس کے زیر اختیار علاقے میں ہو۔ اس کے برعکس اگر فریقین کا تعلق عسکر سے ہو اور وہ اپنا مقدمہ قاضی شہر کی عدالت میں لے جانا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں اور قاضی شہر کو اس مقدمے کی سماعت کا اختیار حاصل ہے (زیرا کہ ولایت او عام است)

شہر میں ایک سے زیادہ قاضی

بادشاہ ایک شہر میں ایک سے زیادہ قاضی مقرر کر سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں ان کے فرائض کی صراحت ضروری ہے۔

فرائض قاضی

نئے قاضی کو چاہیے کہ اپنے تقرر پر سابق قاضی کے تمام کاغذات اپنے قبضے میں لے لے، خواہ ان کا تعلق حکومت سے، خواہ فیصلہ طلب مقدمات کے فریقین سے ہو اسے چاہیے کہ رجسٹر فیصلہ جات (کتاب حکم) کو بھی اپنے قبضے میں لے لے۔

قاضی محض جج ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنے علاقے کے تمام اوقاف کا متولی ہوتا ہے۔

اپنے تقرر کے بعد اسے قید خانوں کا معائنہ کر کے قیدیوں کے حالات پر تبصرہ کرنا اور ان کے حالات اور انفرادی معاملات کے متعلق تحقیقات کرنا چاہیے۔ اگر اس کے خیال میں کوئی قیدی رہائی کا مستحق ہے تو وہ اسے رہا کرسکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے اس پر لازم ہے کہ شہادت کو اچھی طرح جانچے اور تعجیل سے کام نہ لے۔

عدالتی طریقۂ کار

اسے کھلی جگہ میں عدالت کرنا چاہیے۔ اس کام کے لیے مسجد قابل ترجیح ہے[1] تاکہ غریب اشخاص آزادی کے ساتھ اس تک پہنچ سکیں۔ لیکن اگر وہ اپنے مکان پر عدالت کرے تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ لوگوں کو اندر آنے کی عام اجازت ہو۔

اس کے ساتھ کاتبوں کا رہنا ضروری ہے تاکہ عدالت میں جو شہادت پیش ہو وہ اسے قلم بند کرسکیں اور جب وہ کسی فریق یا گواہ کی زبان نہ جانتا ہو تو اس کے ساتھ ترجمانوں کا رہنا بھی ضروری ہے۔

قانون کی نظر میں عدالت میں حاضر ہونے والے فریقین کا درجہ مساوی ہوتا ہے لہذا قاضی کو چاہیے کہ وہ انہیں ایک ہی جگہ

---

۱ - بقول برنی علاء الدین کے عہد حکومت میں قاضی عدالتی کام مسجدوں میں کیا کرتے تھے، لیکن سلاطین مغلیہ کے دور حکومت میں وہ سرکاری عمارتوں میں یہ فرائض انجام دینے لگے۔ اپنے مکانوں پر عدالت کرنے کی انہیں ممانعت تھی۔

بٹھائے اور اگر کسی مقدمے میں خود بادشاہ ایک فریق کی حیثیت سے حاضر عدالت ہو تو بھی وہ انتظام نشست میں کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھے۔[1]

جب کوئی مدعی تحریری نالش کے بغیر ہی عدالت میں آئے تو قاضی کو چاہیے کہ اسے کاتب کے پاس بھیجے جو اس کا بیان ضروری تفصیل کے ساتھ مقررہ نمونے پر قلم بند کرے اور مدعا علیہ کو حاضر عدالت ہونے کا حکم بھیجے۔

فریقین مقدمہ کے حاضر عدالت ہونے پر جب دعویٰ قاضی کے سامنے پیش ہو تو وہ اس کی جانچ کرے اور اس کے جائز اور باضابطہ ثابت ہو جانے پر مقدمے کی سماعت شروع کرے، ورنہ اسے خارج کردے۔

مقدمے کی سماعت کے دوران قاضی خاموش رہے اور مدعی کا بیان بغور سنے۔ قاضی یا کاتب اس کا بیان لکھتا جائے۔ اس کے بیان میں ایک لفظ بھی اپنی طرف سے شامل نہ کیا جائے بعد ازاں وہ مدعا علیہ کو ان الفاظ میں مخاطب کرے۔ ''دعویٰ کردہ بر تو ایں خصم ھمچنیں، چہ می گوئی تو، پس اقرار کنید یا انکار'' (مدعی تم پر فلاں فلاں الزام لگاتا ہے۔ پس تم اس کے متعلق کیا کہتے ہو، اقرار کرو یا انکار) قاضی اُس کا جواب (اقرار یا انکار) قلم بند کرے۔ اگر ملزم انکار کرے تو وہ اپنی صفائی میں بیان

۱۔ سلوک الملوک ورق ۳۰ (کسی مغل بادشاہ کے حاضر عدالت ہونے کا کہیں ذکر نہیں ملتا)

دے اسے لکھ لے - فریقین مقدمہ کے بیانات اس طرح قلم بند کر لینے کے بعد وہ مدعی کو ان الفاظ کے ساتھ مخاطب کرے (تو ھم چنیں دعوئ کردۂ) اور مدعا علیہ سے کہے (تو ھم چنیں گفتۂ) اور جب دونوں اپنے اپنے بیانات کی صحت کی تصدیق کرچکیں تو وہ کاغذات کی جانچ پڑتال کرے اور اگر اسی وقت فیصلہ کر دینا ممکن ھو تو اسی وقت فیصلہ سنا دے اور اگر دعوئ ثابت نہ ھوا ھو تو مدعی کو ایسی مزید شہادت (بینات) دعوے کے ثبوت میں پیش کرنے کا حکم دے جو قانون شہادت کے مطابق ھو -

جب کوئی گواہ شہادت دینے کے لیے آئے تو قاضی اسے کوئی ھدایت نہ دے - جب اس طرح مقدمے کی کاروائی پوری ھو جائے تو قاضی بموجب شرع فیصلہ کرے -

اگر فیصلہ مدعا علیہ کے خلاف ھو تو وہ اسے معاوضہ ادا کرنے کا حکم دے - لیکن معاوضہ ادا نہ کرنے پر اسے جیل نہ بھیجے، تا آنکہ مدعی اس کی خواھش نہ کرے اور معاوضہ ادا نہ کرسکنے پر کسی کو گرفتار بھی نہ کیا جائے تا آنکہ دو آدمی اس امر کی شہادت نہ دیں کہ مدعا علیہ معاوضہ ادا کرنے کے قابل ھے (گواھی ندھند برغنائے او) -

مفتی

معلوم ھوتا ھے کہ مفتی کا ھونا ضروری نہ تھا - اگر قاضی خود ھی فتوئ صادر کرنے کی قابلیت اور سند رکھتا تو وہ مقدمے کا فیصلہ خود کر دیتا ورنہ مفتی کے پاس مقدمہ بھیج کر اس سے فتوئ طلب کرتا -

محتسب

اسلامی مملکت میں ایک محتسب بھی ہوتا تھا جس کے فرائض میں اوزان، پیمانہ جات اور اشیائے خوردنی کی جانچ پرتال کے علاوہ لوگوں کو قمار بازی و شراب خوری سے باز رکھنا بھی شامل تھا - اس کے علاوہ وہ احتساب مذہبی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا - الماوردی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے فرائض کتنے وسیع تھے -

(۱) مسلمانوں کر صوم و صلوة کا پابند رکھنا اور شراب خواری وغیرہ سے روکنا اس کا فرض تھا -

(۲) اس کا فرض یہ بھی تھا کہ گلی کوچوں میں لوگ گداگری نہ کرنے پائیں اور جس گداگر کے پاس گذر بسر کے لائق کچھ موجود ہو اسے گداگری سے روکا جائے -

(۳) ہر معالج کی اسناد کی جانچ پرتال کرنا اور اگر کوئی معالج مستند نہ ہو یا علاج کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اسے علاج کرنے سے روک دینا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا -

(۴) اس کا فرض یہ بھی تھا کہ وہ غلاموں کی حالت کی نگرانی کرے اور ان کے آقاؤں کو ان پر ظلم نہ کرنے دے -

(۵) اس کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ وہ کشتیوں پر ساحل چھوڑتے وقت ان کی گنجائش سے زیادہ وزن نہ لادنے دے - طوفانی موسم میں کشتیوں کو ساحل چھوڑنے کی اجازت نہ دے کیونکہ اس سے مسافروں کی سلامتی خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے -

(۶) اس کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ کسی عام راستے پر کوئی عمارت نہ بننے دے اور اگر کوئی ایسی عمارت تعمیر کرلی جائے جس سے راہ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو تو اسے مسمار کر دینے کا حکم دے خواہ وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو - (اگرچہ آں بناء مسجد باشد) -[۱]

مغلیہ نظام عدل بھی اسی طرح کا تھا

مغلیہ نظام عدل بھی بجنسہٖ اسی طرز کا تھا - قاضی القضاۃ (یعنی صدر) کا تقرر بادشاہ کرتا تھا اسے جج کے اختیارات حاصل ہوتے تھے - قلمرو کے دیگر علاقوں کے ماتحت قضاۃ مقرر کرنے کا اختیار بھی صدر ہی کو حاصل تھا لیکن ایسے تمام تقررات میں بادشاہ کی منظوری ضروری تھی - بادشاہ بھی اپنے اختیار سے کام لے کر ایک شہر میں ایک سے زیادہ قاضی مقرر کیا کرتا تھا اور اسی لحاظ سے ان کے فرائض کی تصریح بھی کردی جاتی تھی - یہ قاضی اور میر عدل ہوتے تھے اور تمام بڑے شہروں اور قصبوں میں دونوں موجود رہتے تھے -

بادشاہ ایک قاضی عسکر بھی مقرر کرتا تھا اور اس کے ساتھ بھی میر عدل کا تقرر ہوتا تھا - البتہ مفتی ہر جگہ نہ ہوتے تھے - چنانچہ سلطنت کے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں ان کے تقرر کا کہیں ذکر نہیں ملتا - محتسب دارالحکومت کے علاوہ صوبوں میں بھی مقرر کیے جاتے تھے ان کے فرائض میں مذہبی احتساب کے علاوہ

---

۱ - اس باب کا یہ حصہ الماوردی ، ھدایہ ، اور سلوک الملوک سے ماخوذ ہے (آخرالذکر ایک مخطوطہ ہے جس میں اس موضوع سے متعلق تمام مشہور و معروف مسلم فقہا کے خیالات کا خلاصہ مذکور ہے) اوراق ۶۶—۱۴

پولیس کے فرائض بھی داخل تھے۔[1] لیکن انھیں نہ سڑکوں کی دیکھ بھال سے کوئی تعلق ہوتا تھا ، نہ کشتیوں ، جہازوں اور ان کے مسافروں کی سلامتی سے کوئی واسطہ ، جیسا کہ الماوردی کے حوالے سے پہلے بتایا گیا ہے۔

قاضی صرف شہروں ھی میں نہ ہوتے تھے

عام طور پر خیال کیا جاتا ھے کہ قاضی محض دارالحکومت ، صوبائی صدر مقامات اور دیگر بڑے بڑے شہروں ھی میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن عہد مذکور کی تاریخوں میں جو واقعات جابجا مندرج ھیں ان سے حتمی طور پر یہ واضح ہو جاتا ھے کہ چھوٹے چھوٹے مقامات یعنی قصبات اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کیے جاتے تھے البتہ دیہات اس سے مستثنیٰ تھے۔

ابوالفضل اس کے متعلق بالکل خاموش ھے۔ عدالتی عہدہ داروں کے متعلق آئین میں صرف دو جگہ ذکر ملتا ھے۔ سیورغال کے ضمن میں وہ صدر کی حیثیت کے بارے میں لکھتا ھے کہ ''قاضی اور میر عدل اس کے زیر فرمان ہوتے ھیں'' [2] اور سرکاری افسروں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنے کے سلسلے میں وہ لفظ میرداد استعمال کرتا ھے اور اس کی بابت لکھتا ھے کہ وہ ایسا شخص ہونا چاھیے جو حرص و خود غرضی سے پاک ہو ، جو کمال احتیاط و دقت نظر سے متصف ہو اور محض گواہوں ارر حلفیہ

---

۱ - مراۃ - ورق ۳۲۵ ب - ''محتسب بلدہ و قصبات'' — جن کا تقرر صدر کی معرفت ہوتا تھا۔

۲ - آئین - صفحہ ۱۹۸ - بیورج - صفحہ ۲۸۵ -

بیانات پر تکیہ نہ کرتا ہو بلکہ مختلف سوالات کے ذریعے صحیح حال معلوم کرسکتا ہو'' ۔[1]

صاحب مرآۃ کے بیان میں بہت قطعیت ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ ''صوبے اور قصبات کے قاضی صدر اعلیٰ کی معرفت مقرر کیے جاتے ہیں اور وہ دربار سے ملی ہوئی سند کی بناء پر ، صدر صوبہ کی معرفت ، اپنے فرائض منصبی کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں............قاضیوں کو نقد تنخواہ (روزینہ) ملتا ہے اور ان کے پاس اراضی مدد معاش رہتی ہیں جو انہیں ملازمت کی مدت کے لیے عطا کی جاتی ہیں'' ۔[2] اس کتاب کے علاوہ جو صوبائی امور سے متعلق بہترین سند کی حیثیت رکھتی ہے ، ان مالی حسابات میں بھی جو ہر پرگنے سے مرکزی حکومت کو بھیجھے جاتے تھے ، ایک مستقل مد مقامی قاضیوں کے لیے انعام کی ہوتی تھی جو انہیں عیدین کے موقع پر دیا جاتا تھا ۔[3] نیز ہر پرگنے کے بازار کے نرخوں کی ، جن سے دارلحکومت کو مطلع کیا جاتا تھا ، تصدیق بھی یہی قاضی کیا کرتے تھے ۔[4]

بہر حال اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ قصبات یا پرگنہ جات میں میر عدل بھی ہوا کرتے تھے اور اس زمانے کے معاشرے کی تنظیم اور معاشی حالات بھی ایسے ہی تھے جن میں زیادہ مقدمہ بازی کی گنجائش نہ تھی ۔ غرضکہ یہ باور کرنے کی معقول

---

۱ - آئین ـ صفحہ ٥ - بیورج صفحہ ۹ (دیباچہ)

۲ - مراۃ ـ ورق ۳۲۵

۳ - م ـ ت ـ ٦٥٨٨ ، ورق ۸۹ الف

۴ - م ـ ت ـ ٦٥٩٩ ، ورق ١٩٦

وجہ موجود ہے کہ مذکورہ مقامات میں میر عدل قطعاً موجود نہ تھے۔

بادشاہ اور عدل گستری

عدل گستری کا دوسرا مقام بادشاہ کا دربار ہوتا تھا۔ شاہان مغلیہ نے مسلم فقہا کی اس اجازت کو ، کہ عدالتی مقدمات کا فیصلہ بادشاہ کو خود کرنا چاہیے ، پوری طرح استعمال کیا تھا۔ باب ۲ میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہان مذکور کس طرح اپنی رعایا کے غریب ترین افراد کو باریابی کا موقع دیتے تھے اور کس حد تک رعایا کو یہ موقع عملی طور پر حاصل تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ معمولی مقدمات کی سماعت بادشاہ دربار عام میں روزانہ کیا کرتا تھا لیکن اہم مقدمات کی سماعت جن میں گواہوں کی شہادت لینا اور ان پر جرح کرنا ضروری ہوتا ، وہ ہفتے میں صرف اس دن کرتا تھا جو محض عدل گستری کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ دوسرے باب میں مذکور ہو چکا ہے کہ اس کام کے لیے اکبر نے پنجشنبہ ، جہانگیر نے سہ شنبہ اور شاہ جہاں نے چہار شنبہ مخصوص رکھا تھا۔ اکبر کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے ”وہ باب عدل کھولتے اور دربار عام منعقد کرتے ہیں ، مظلوموں کے مقدمات کی تفتیش کے دوران وہ کسی شخص کی شہادت یا قسم پر اعتماد نہیں کرتے کیونکہ چالاک اشخاص انہیں چیزوں کا سہارا لیتے ہیں بلکہ وہ بیانات کے تضاد ، قیافہ شناسی ، قوت دقیقہ رسی اور فکر بلیغ کے ذریعے نتیجہ نکالتے ہیں۔ ان کی عدالت مرکز صداقت ہے اور اس کام میں کم از کم ڈیڑھ پہر

(یعنی ساڑھے چار گھنٹے) صرف ہوتے ہیں''۔[۱] ہاکنز بھی جہانگیر کے متعلق یہی کہتا ہے ''بادشاہ اس جگہ تمام مقدمات کی سماعت کرتا اور اس کام کے لیے روزانہ تقریباً دو گھنٹے کی نشست ہوتی ہے۔ (ہندوستان کے یہ بادشاہ روزانہ عدل گستری کے فرائض انجام دیتے ہیں)''۔[۲] ڈیلائٹ، جہانگیر کی ہفتہ وار عدل گستری کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''ہفتے میں ایک بار (سہ شنبہ کو) وہ کرسئی عدالت پر بیٹھتا اور نہایت سکون کے ساتھ ان تمام دیوانی و فوجداری مقدمات کی جو اس کے حضور پیش ہوں سماعت کرکے ہر مقدمے کے متعلق اپنا فیصلہ صادر فرماتا ہے۔ یہ فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا ہے''۔[۳] لاہوری کے بیان کے بموجب، شاہ جہاں ہر چہار شنبہ کو جھروکۂ درشن سے اٹھ کر دولت خانۂ خاص میں بیٹھا کرتا تھا اور اس روز ''متصدیان عدالت'' ''ارباب فتویٰ'' چند متقی و متدین علماء و فضلا اور ان امراء کے سوا، جو ہر وقت حضور شاہی میں موجود رہتے تھے، کسی دوسرے شخص کو وہاں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوتی۔ وہاں ''متصدیان عدالت'' داد خواہوں کو یکے بعد دیگرے پیش کرتے تھے۔ بادشاہ ان کا بیان کمال توجہ سے سنتا، شائستگی کے ساتھ اس پر جرح کرتا اور ان علماء کے فتوے کے مطابق، جو وہاں موجود ہوتے، فیصلہ صادر کرتا۔[۴]

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۲۵۷ - بیورج' صفحہ ۳۷۳

۲ - ہاکنز ـ صفحہ ۱۱۶

۳ - ڈی لائٹ ـ صفحہ ۹۳

۴ - لاہوری، جلد اول، صفحہ ۱۵۰

چند روز بعد برنیر نے بھی مغلیہ دربار میں یہی دیکھا ''عام خاص' میں انبوہ خلائق کی وجہ سے بادشاہ تک نہ پہنچنے والی عرضداشتیں یہاں بادشاہ کے حضور پیش کی جاتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے اور متعلقہ اشخاص کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بھی اس وقت حاضر رہیں۔ ان کا بیان خود بادشاہ سنتا ہے اور اکثر موقع ہی پر فریق مظلوم کی داد رسی کرتا ہے.............. وہ دارالقضاۃ میں، جسے عدالت خانہ کہتے ہیں، ہفتے میں ایک دن اور بھی، اپنے دونوں قاضی القضاۃ کے ساتھ ضرور موجود رہتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہان ایشیا، جنھیں ہم عموماً غیر مہذب سمجھنے کے عادی ہیں، اپنی رعایا کی داد رسی کی طرف سے ہمیشہ غافل نہیں رہتے۔[1]

دوروں پر بھی روز مرہ کے یہ معمولات جاری رہتے تھے

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بادشاہ خواہ کسی فوجی مہم پر ہوتا یا محض تفریح کے لیے دارالحکومت سے باہر جاتا یا صوبوں کے دورے پر نکلتا لیکن ان معمولات میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ جہانگیر اس فرض کی جانب سب سے زیادہ توجہ کرتا تھا چنانچہ بہت سے مقدمات کے فیصلے اس نے اپنے دوروں کے زمانے میں کیے۔ اس غرض سے وہ انتظامات جو اس نے اجمیر اور احمد آباد میں کیے تھے واقعی قابل تحسین ہیں اور اس کے ان ارادوں کو صحیح ثابت کرتے ہیں جن کا اظہار اس نے

۱- برنیر۔ صفحہ ۲۶۳۔ ان کا بیان ہے کہ اورنگ زیب ہفتے میں ایک دن اور بھی ''تخلیے میں، دو گھنٹے ادنٰی طبقوں سے منتخب کیے ہوئے دس اشخاص کی عرضداشتیں سنتا ہے''۔

متعدد بار اپنے عہد حکومت کے پہلے اور دوسرے دور میں کیا تھا۔ احمد آباد میں جہاں "لوگ کم ہمت اور مسکین طبع تھے" اس نے عدالت کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جہاں پھاٹک، دیوار، چوکیدار (یساول) یا چوبدار جیسی کوئی چیز ان کی راہ میں حائل نہ تھی"۔ یہ جگہ ندی کے قریب تھی۔ وہ کہتا ہے "میں جس دن شہر میں داخل ہوا اسی دن سے، اس امر سے باوجود کہ ہوا بہت گرم چلتی تھی، ہر روز .... وہاں دو تین گھنٹے بیٹھتا .... داد خواہوں کی فریادیں سنتا اور ظالموں کو ان کے جرائم کی نوعیت کے مطابق سزائیں دینے کے احکام صادر کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں بھی جبکہ میں (بوجہ علالت) کمزور تھا میں حسب معمول روزانہ (بعد نماز ظہر) جھروکے میں بیٹھا کرتا، حالانکہ اس سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی، لیکن میں آرام کو حرام سمجھتا تھا"۔ (تن آسانی بر خود حرام داشت)[1]۔

برنیر بھی اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ شاہان مغلیہ کے ان معمولات میں کبھی فرق نہ پڑتا تھا۔ "شاہان ہند، دارالحکومت کی طرح میدان جنگ میں بھی، چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ بلا ناغہ ایسی مجالس منعقد کرتے ہیں۔ اسے وہ اپنا فرض منصبی اور ایک

---

۱ - تزک - ۱۳ سنہ جلوس، صفحہ ۲۳۲ - ترجمہ، جلد دوم، صفحہ ۴۱ - اس موقع پر کس طرح لوگ آسانی کے ساتھ بادشاہ تک پہنچ جاتے تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ شاہی باغات کا نگران ایک باغبان اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور گورنر کے ایک ملازم کے متعلق یہ شکایت کی کہ اس نے شاہی باغ سے جس کی نگرانی میرے سپرد ہے چند پودے لے لیے ہیں۔ تحقیقات کی گئی۔ شکایت صحیح ثابت ہوئی اور ملازم کے دونوں انگوٹھے کاٹ دیے گئے (صفحہ ۲۰۷)

قانونی امر سمجھتے ھیں اور اس کی پابندی کو شاذونادر ھی فراموش کرتے ھیں،، ۔[1] شاہ جہاں نے بھی پنجاب ، کشمیر ، کابل اور پشاور کے دوروں میں اسی قسم کے انتظامات کیے تھے ۔

بادشاہ کے حضور کس قسم کے مقدمات پیش ہوتے تھے

بادشاہ دونوں قسم کے مقدمات (دیوانی و فوجداری) کی سماعت کرتا تھا ۔ اسے عدالت ابتدائی اور عدالت مرافعہ دونوں ھی کے اختیارات حاصل تھے ۔ ان واقعات سے جو عہد مذکور کی تاریخوں میں منتشر طور پر مذکور ھیں یہ پتا چلتا ھے کہ بادشاہ کے حضور دیوانی مقدمات سے زیادہ فوجداری مقدمات پیش ھوتے تھے ۔ اس کی توجیہ نہایت آسان ھے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ھوا ، ھندوؤں اور مسلمانوں کے قانون دیوانی کی نوعیت ھی ایسی تھی کہ دربار شاھی تک ان مقدمات کے پہنچنے کی بہت کم گنجائش رہ جاتی تھی ۔ صرف پیچیدہ یا غیر معمولی طور پر اھم مقدمات اس کے حضور بصورت مرافعہ پیش ھوتے تھے اور خود قاضی بھی ایسے مقدمات بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے ۔ اس کے برعکس فوجداری مقدمات کے لیے اس قسم کی کوئی قید یا رکاوٹ نہ تھی اور بحیثیت مجموعی تینوں شہنشاھوں کا اصول بھی یہی تھا کہ سزا دھی کے وسیع اختیارات عاملہ یا عدلیہ کے عہدہ داروں کے ھاتھوں میں نہ رکھے جائیں اور ضوابط میں یہ حکم قطعی طور پر موجود تھا کہ سزائے موت کے لیے ھر

---

۱ - برنیر ۔ صفحہ ۳۶۰ - ان میں سے پہلی مجلس عدل گستری کے لیے مختص تھی ۔

صورت میں بادشاہ کی منظوری لازمی ہے - ان حالات میں صوبوں کے گورنر بلکہ دار الحکومت کے اعلیٰ عہدہ دار بھی سزائے موت دینے یا اعضا کی قطع و برید کے احکام جاری کرنے کا خطرہ برداشت کرنے سے مجتنب رہتے تھے اور ایسے مقدمات بادشاہ کے پاس بھیج دینے کو ترجیح دیتے تھے - یہ پابندی اکبر نے صوبوں کی تنظیم کے بعد عائد کی تھی اور اسی پر اس کے جانشین بھی کاربند رہے - یہی وجہ تھی کہ جہانگیر کے عہد حکومت میں یورپین سیاح ہر ہفتے دربار شاہی میں مجرموں کو اس قسم کی سزائیں ملتے دیکھا کرتے تھے - ڈی لائٹ کہتا ہے " سزائے موت عموماً بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے دی جاتی ہے اور بہت ظلم کے ساتھ دی جاتی ہے خواہ بادشاہ دار الحکومت میں ہو، خواہ اس کا دربار کسی دوسری جگہ منعقد کیا گیا ہو " (صفحہ ۹۳) - غرضکہ ملزموں نے بادشاہ سے اپیل کی ہو یا ابتدائی سماعت کرنے والے مجسٹریٹوں اور ججوں نے مقدمات بادشاہ کے پاس بھیجے ہوں، مقدمات فوجداری کی تعداد مقدمات دیوانی سے بہت زیادہ ہوتی تھی - مصارف کے لحاظ سے بھی معاملے کی نوعیت یہی ہو سکتی تھی - مقدمۂ فوجداری میں ملزم کو تمام گواہوں کے ساتھ سرکاری خرچ پر دربار روانہ کر دیا جاتا تھا - لیکن مقدمۂ دیوانی میں فریقین خود مصارف مقدمہ برداشت کرتے تھے -

مرافعہ

مرافعے سے متعلق کوئی خاص قواعد و ضوابط مقرر نہ تھے، نہ مختلف درجوں کی عدالتیں تھیں جہاں ابتدائی سماعت کرنے والی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف

مرافعہ کیا جاتا - لیکن جہاں تک عملی صورت حال کا تعلق تھا دیوانی مقدمے کے ہر دو فریقوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہ راست اپنا مقدمہ بادشاہ کے حضور پیش کریں یا قاضی کے فیصلے کے خلاف اس سے اپیل کریں - اسی طرح مقدمہ فوجداری میں، ملزم کو حق مرافعہ حاصل تھا اور ابتدائی سماعت کرنے والا مجسٹریٹ بھی یہ اختیار رکھتا تھا کہ وہ فوجداری مقدمے کی سماعت خود کرے یا دوران سماعت جس مرحلے پر چاہے اسے دربار میں بھیج دے،

اس بات کا اندازہ کہ بادشاہ کے سامنے کس نوعیت کے دیوانی مقدمات براہ راست دائر ہوتے تھے یا قاضیوں کی عدالتوں سے بھیجے جاتے تھے حسب ذیل چند مثالوں سے ہو جائے گا- جہانگیر کے عہد حکومت کے پندرھویں سال، لاہور کے قاضی اور میر عدل نے اس کے پاس ایک مقدمہ بھیجا جس میں عبدالوہاب ابن حکیم علی نے، بعض سادات لاہور پر اسی ہزار روپے کا دعویٰ کیا تھا اور ایک معاہدہ پیش کیا تھا جس پر قاضی نور اللہ کی مہر ثبت تھی - مدعی نے کہا کہ میرے والد نے یہ رقم سید ولی کے پاس، جو مدعا علیہم کا باپ تھا، جمع کی تھی لیکن وہ اس سے انکار کرتے ہیں - ابن حکیم اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے علاوہ قرآن پاک کی قسم کھانے کے لیے بھی تیار تھا (اسلامی قانون اس طرح قسم کھانے کی اجازت دیتا ہے) جہانگیر لکھتا ہے - ”میں نے انھیں حکم دیا کہ وہ احکام شریعت کے مطابق کارروائی کریں - دوسرے دن معتمد خاں نے عرض کیا کہ سادات مذکور بہت عاجزی اور فرماں برداری کا اظہار کر رہے ہیں - معاملہ بہت پیچیدہ ہے - بہتر ہوگا کہ اس کی تحقیق و تفتیش میں زیادہ سے زیادہ غور و تامل

سے کام لیا جائے۔ چنانچہ میں نے حکم دیا کہ آصف خاں انتہائی جانفشانی اور دور اندیشی سے قضیۂ مذکور کی حقیقت دریافت کرے اور ایسی راہ نکالے کہ اصلاً شک و شبہ نہ رہ جائے۔ اس کے باوجود اگر معاملہ صاف نہ ہو تو میں خود باز پرس کروں گا۔ جوں ہی حکیم زادے نے یہ الفاظ سنے اس کے ھاتھ پاؤں پھول گئے۔۔۔۔۔ اور اس نے مقدمہ واپس لے لینے کا ارادہ ظاھر کیا''۔ لیکن اس کی اجازت نہ دی گئی اور اسے برائے پرسش آصف خاں کے سامنے حاضر ہونے پر مجبور کیا گیا۔ وھاں اس نے اعتراف کرلیا کہ میرے ایک ملازم نے وہ جعلی دستاویز تیار کی ھے، خود بھی مقدمۂ مذکور میں ایک گواہ بنا ھے اور مجھے بھی گمراہ کر دیا ھے۔ اس نے ان تمام باتوں پر مشتمل ایک تحریری بیان داخل کیا جو بادشاہ کے حضور پیش کردیا گیا۔ ''جب آصف خاں نے مجھے صحیح صورت حال سے مطلع کیا تو میں نے اسے (مدعی کو) منصب و جاگیر سے محروم کرکے اپنی نظروں سے دور کر دیا اور سید زادوں کو ھر طرح عزت و آبرو کے ساتھ لاھور واپس جانے کی اجازت دی''۔[۱]

شاہ جہاں کو ایک مقدمہ اس سے زیادہ پیچیدہ موصول ھوا جس کی نوعیت بھی عجیب تھی۔ مقدمۂ مذکور میں دو مختلف اشخاص ایک ھی بچے کو اپنا بیٹا بتاتے تھے۔ قاضی اور میر عدل نے اس شہادت کی بناء پر جو آن کے سامنے پیش کی گئی تھی مقدمے کا فیصلہ سنا دیا لیکن ھارنے والا فریق اپنے اس دعوے پر مصر ھی رھا کہ بچہ دراصل اسی کا بیٹا

---

۱ - تزک، صفحہ ۳۰۶ - ترجمہ، جلد دوم، صفحہ ۱۵۸ (جہانگیر کشمیر میں تھا)

ہے - چنانچہ وہ مقدمہ بادشاہ کے حضور بھیج دیا گیا - بادشاہ نے شہادت کی جانچ پرتال کی لیکن اسے برعکس فیصلہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی - چنانچہ انھیں آزمانے کے لئے اس نے کہا کہ اس لڑکے کو دو ٹکڑے کرکے نصف حصہ ایک کو اور باقی نصف دوسرے شخص کو دے دیا جائے - اس پر وہ شخص تو خاموش رہا جس کے حق میں فیصلہ ہوا تھا لیکن دوسرا شخص لرز اٹھا اور اس نے روتے ہوئے عرض کی کہ ''بچے کے ٹکڑے نہ کیے جائیں میں اپنے دعوے سے باز آیا'' - اس طرح صداقت آشکارا ہو گئی اور وہ بچہ اسی شخص کے حوالے کردیا گیا - مزید تحقیقات پر معلوم ہوا کہ وہ بچہ واقعی اسی شخص کا تھا - ۱

مظفر خاں کے مجموعۂ خطوط میں متعدد خطوط ایک میر عدل کے ملتے ہیں جو اس نے ایک دوست کی حیثیت سے مظفر خاں کو بعض اہم مقدمات اور بادشاہ کے بعض احکام موصولہ کی بابت لکھے تھے - وہ ایک نہایت پیچیدہ دیوانی مقدمے کا ذکر کرتا ہے جو کاروباری معاہدہ و شرکت سے متعلق تھا جس میں ہر دو فریق ہندو بقال تھے - مقدمۂ مذکور براہ راست بادشاہ کے حضور پیش ہوکر دربار میں فیصل ہوا تھا لیکن حکم کی تعمیل نہ ہو سکی تھی کیونکہ پرگنے کے مقامی افسروں نے کچھ مشکلات پیدا کردی تھیں - معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس مقدمے کو دوبارہ حضور شاہی

۱ - برھمن - م - اوراق ۱۹ ب اور ۲۰ الف (صفحات ۳۲ - ۳۳)

میں واپس بھیجا تھا - اس طرح وہ مقدمہ ہنوز بادشاہ کے حضور فیصلہ طلب ہی تھا کہ مدعاعلیہ 'ہربنس' فوت ہو گیا اور 'دیبی چند و رام چند' فرزندان ہربنس نے اپنے باپ کی اس جائداد پر قبضہ کر لیا جس کی بابت مدعی کا دعویٰ تھا - متعلقہ میر عدل شاید نیا نیا مقرر ہوا تھا - اسے دربار سے حکم موصول ہوا کہ وہ اس مقدمے کی بابت فوراً فیصلہ صادر کرے - چنانچہ جانچ پرتال کرنے پر اسے وہ مقدمہ بہت پیچیدہ معلوم ہوا - لہٰذا اس نے ضروری اطلاعات کے ساتھ اسے پھر بادشاہ کے حضور بھیج دیا - وہ لکھتا ہے ''مقدمہ الجھا ہوا اور پرانا ہے اور بقالان پرگنہ کی حیلہ سازی (حیلہ سازی جماعۂ بقالان قصبہ) کے باعث 'جو نہ سچ بتاتے ہیں نہ کسی طرح تنازعات طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں' میں مجبور ہو گیا ہوں - لہٰذا ہر دو فریق مقدمہ کو حاضر دربار کر رہا ہوں''[۱] مغلیہ نظام عدل کی ایک نمایاں

---

۱ - م - ت ۱۶۸۵۹، ورق ۳۲ الف اور ب - اس مجموعے کے متعدد خطوط میں بعض ایسے مقدمات کے متعلق، جن میں دونوں فریق ہندو تھے یا ایک مسلمان اور دوسرا ہندو، بہت مفید معلومات ملتی ہیں - ان خطوط کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان سے مقدمات مذکور کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے - ایک مقدمے میں دو بقالوں نے ایک شخص پر ۲۰ روپے کا دعوی کیا (ورق ۴۳) - ایک دوسرے مقدمے میں ساھو نند رام کا استغاثہ یہ تھا کہ اس کے کارندے، رگھوناتھ رائے نے زربفت کے کچھ تھان اونٹوں پر لاد کر احمد آباد سے لاھور روانہ کیے تھے - راہ میں اس کے آدمیوں پر ڈاکا پڑا اور ایک ہزار روپے کی مالیت کا کپڑا لوٹ لیا گیا - لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ اس معاملے کی تحقیقات کی جائے، راہ زنوں کو سزا دی جائے اور لوٹا ہوا کپڑا واپس دلایا جائے - چونکہ یہ وقوعہ میر عدل مذکور ہی کے علاقے میں پیش آیا تھا، لہٰذا اسی کی عدالت میں استغاثہ دائر ہوا - اس کی رائے میں مستغیث کا بیان صحیح تھا - (اوراق ۶۱ - ۶۲)

خصوصیت یہ تھی کہ انصاف کے اصولوں کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی - ہرگز کسی سے رعایت نہ کی جاتی تھی اور قانون کے معاملے میں سب کو برابر سمجھا جاتا تھا -

غیر جانبداری اور قانون کی سخت پابندی

عدل و انصاف کا نام سب کو پسند ہے مساوات ایسی چیز ہے جس سے بہت سے لوگ ڈرتے اور نفرت کرتے ہیں - اس کے باوجود ارسطو کا یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے کہ عدل و انصاف، مساوات ہی کی ایک صورت ہے، لہذا انصاف میں غیر جانبداری کا مطلب یہ ہوا کہ اس میں دو باتوں کا ہونا ضروری ہے :-

۱ - قانون کی پابندی میں کسی سے کوئی رعایت نہ کی جائے- جو مقدمات اس کی تعریف کے حدود میں آئیں ان پر اس کا اطلاق یکساں طور پر کیا جائے- قانون اچھا ہو یا برا، اخلاق نقطۂ نظر سے کوئی قاعدہ فی نفسہ انصاف پرمبنی ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں جن مقدمات یا معاملات پر اس کا اطلاق کیا جائے یکساں طور پر کیا جائے - لیکن قانون کی نظر میں سب کو برابر سمجھنے کا مطلب کچھ اور بھی ہے قانون کی اچھائی برائی کا لحاظ کیے بغیر اس کی پابندی بلا رو و رعایت کرنا ہی کافی نہیں ہے -

۲ - خود قانون بھی سب کے لیے ایک ہی ہو اور اس معاملے میں ان کے مذھب و ملک یا مرتبہ و نسل کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے پروفیسر ہاب ھاؤس (Hobhouse) کہتا ہے : ''زمانۂ جدید کے انسان کی نظر میں، قانون کے

سامنے سب کے برابر ہونے کا مفہوم یہی نہیں ہے کہ قتل کی مقررہ سزا، خواہ وہ کچھ ہو، بلا رو و رعایت دی جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ مذکورہ سزا ہر موقع پر دی جائے، خواہ قاتل اور مقتول کوئی ہوں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بموجب قانون ہر شخص کے جسم و جان کی حفاظت یکساں طور پر کی جائے گی اور ان سے تعارض کرنے والوں کو یکساں سزا دی جائے گی،،[1]

شاہان مغلیہ بہت اچھی طرح یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ انھوں نے مذکورۂ بالا معیار کے مطابق غیر جانبداری کے ساتھ عدل و انصاف کیا ہے ۔ نظریاتی حوالوں، اور شاہان مغلیہ کے اقوال کے علاوہ جن کا ذکر اکثر تاریخوں میں ملتا ہے اور جن پر عہدمذکور کے مورخین نے بھی کافی زور دیا ہے، ایسے واقعات بھی بیان کیے جاسکتے ہیں جن سے ثابت ہو جاتا ہے کہ شاہان مذکور نے اس عہد میں جس سے یہ کتاب بحث کرتی ہے، مذکورۂ بالا مفہوم میں بلا رو و رعایت عدل گستری کے فرائض انجام دیے ہیں ۔ اکبر کے عہد حکومت کے چوبیسویں سال اکبر کے منظور نظر گورنر، اور بچپن میں ساتھ کھیلے ہوئے، خان اعظم میرزا عزیز کوکہ کے خلاف ایک مقدمہ پیش ہوا ۔ مرزاء مذکور نے اس زمانے جب وہ گجرات کا گورنر تھا، علاءالدین نامی ایک عامل کو خیانت کے جرم میں گرفتار کرکے اپنے ایک ملازم کے حوالے کردیا

۱ ۔ ہاب ہاؤس (Hobhouse)، مبادیات عدل عمرانی (Elements of Social Justice) صفحہ ۱۰۳ ۔

تھا - وہ ملازم عامل مذکور کے خلاف دل میں کچھ کینہ رکھتا تھا لہذا اسے ملازم مذکور کے ایماء پر اتنا زد و کوب کیا گیا کہ وہ مر گیا - خان اعظم نے اس جرم پر اپنے اس ملازم کو موت کی سزا دی اور ابوالفضل کہتا ہے، ''اس نے یہ عادلانہ فیصلہ کسی کی استدعا پر نہیں بلکہ محض خدا ترسی کی بنا پر کیا'' غرضکہ سزا اسی شخص کو دی گئی جو اس قتل کا مرتکب ہوا تھا لیکن معاملہ یہیں ختم نہ ہوا - جب عامل کا باپ دادرسی کے لئے ایران سے آیا تو مقدمہ ازسرنو شروع کیا گیا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی سماعت عام عدالت میں کی جائے - یہ ثابت کرنے کی ذمہ داری کہ خان اعظم اس معاملے میں بے گناہ ہے خود خان اعظم پر عائد ہوتی تھی - آخر میں مقتول عامل کے باپ کو بموجب شرع ایک کثیر رقم بطور خوں بہا دے کر ہی خان‌اعظم کی گلو خلاصی ہوئی - لہذا ابولفضل کے یہ الفاظ اس موقع کے لحاظ سے نہایت موزوں ہیں کہ ''جہاں پناہ .....کی عدالت میں یگانہ و بیگانہ کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا نہ کسی بڑے سے بڑے امیر اور پریشان حال فقیر کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے ....''[1]

اسی طرح لوگوں کو سخت حیرت ہوئی جب اکبر نے گجرات میں، سابق حکومت گجرات کے ایک زبردست فوجی سردار جھجر خان کو ایک شخص چنگیز خاں نامی کو قتل

---

۱ - اکبر نامہ، جلد سوم، ۲۳ سنہ جلوس، صفحہ ۲۶۶—بیورج صفحہ ۳۸۷ -

کرنے کے جرم میں سزائے موت دی۔ مقتول کی ماں نے اکبر کے حضور اس کے قیام گجرات کے دوران میں دعویٰ پیش کیا۔ تحقیقات کی گئی، جرم ثابت ہو گیا اور اسے موت کی سزا دی گئی - یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ کارروائی ۱۸ سنہ جلوس میں کی گئی، حالانکہ مفتوحہ صوبے پر ہنوز پوری طرح قابو حاصل نہ ہوا تھا۔ ''اس بوڑھی اور بیکس عورت کے خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ اتنے ذی اثر آدمی کو اس کے ظلم کی سزا دی جائے گی - اسے اس انصاف پر سخت حیرت ہوئی ------ یہ عادلانہ سزا عوام (عموم خلائق) کے لئے ہدایت کا موجب ہوئی'' [1]

اسی طرح جب جہانگیر نے یہ سنا کہ اکبر کے عہد حکومت کے ایک ممتاز گورنر، سعید خان چغتائی کے خواجہ سرا، زیر دستوں، اور غریبوں پر طرح طرح سے سختیاں اور مظالم کرتے ہیں تو جہانگیر نے اس کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ''میرا عدل ظلم کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا خواہ اس کا مرتکب کوئی ہو۔ میزان عدل میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ اگر آئندہ تمھارے آدمیوں کے متعلق ظلم و تعدی کی شکایت موصول ہوئی تو تمھیں بلا رو و رعایت سزا دی جائے گی''، سعید خاں نے تحریری وعدہ کیا کہ اگر میرے ملازمین تعدی سے باز نہ آئے تو میں اپنا سر قلم کرا دوں گا[2]۔ جہانگیر کے عہد حکومت

---

۱ - اکبر نامہ جلد سوم، ۱۸ سنہ جلوس، صفحہ ۳۲ - بیورج، صفحہ ۴۶

۲ - تزک - ۱ سنہ جلوس، صفحہ ۶ - ترجمہ، صفحہ ۱۳ - مآثرالامراء، صفحہ ۴۰۵ - پرائس، صفحہ ۱۶ -

میں اسی قسم کے الزامات پر ایک دو گورنر معزول بھی کر دیے گئے تھے۔

بلا رو و رعایت عدل گستری کی ایک بین مثال، عزیز ترین امیر، خان عالم کے برادر زادہ، ہوشنگ کا معاملہ ہے۔ اس پر ایک غیر معروف شخص کو جس کا نام تک اس عہد کی تحریروں میں نہیں ملتا، قتل کر دینے کا الزام تھا۔ چنانچہ اسے موت کی سزا دی گئی۔ اس سلسلے میں جہانگیر لکھتا ہے: ''اسے اپنے حضور طلب کرنے کے بعد میں نے اس سے باز پرس کی اور بعد ثبوت قصاص کا حکم دیا۔ حاشا وکلّا۔ میں نے ایسے معاملات میں کسی شاہزادے کی بھی کبھی رعایت نہیں کی۔ امراء و عوام کس شمار میں ہیں۔ (حاشا۔ کہ دریں امور رعایت خاطر شاہزادہ نہ کردہ تا بہ امراء و سائر بندھا چہ رسد)۔ خدا مجھے ایسی ہی توفیق عطا فرمائے''[1]

پادری مانسریٹ نے یہی غیر جانبداری اکبر کے دربار میں مشاہدہ کی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے ''امور سلطنت میں بادشاہ حق و انصاف کا بے انتہا لحاظ رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے عام دستور کے مطابق مقدمات دھرے طریقے سے دو ججوں کے سامنے فیصل ہوتے ہیں۔ تاہم شاہی ہدایت کے مطابق تمام اہم مقدمات فوجداری، نیز ایسے مقدمات دیوانی جو واقعی اہم ہوں، خود بادشاہ کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ——————

۱۔ تزک، ۱۶ سنہ جلوس، صفحہ ۳۳۳۔ ترجمہ، جلد دوم، صفحہ ۲۱۱۔

علاوہ بریں وہ فطرتاً مہربان اور رحمدل واقع ہوا ہے اور اس کی دلی آرزو یہ ہے کہ جرم کی سزا تو دی جائے لیکن اس میں عداوت کا شائبہ تک نہ ہو نہ بے جا نرمی سے کام لیا جائے،،[1] روجرز، جہانگیر کے متعلق یہی رائے قائم کرتا ہے اور تزک جہانگیری کے دیباچے میں اس کی بابت لکھتا ہے ''ھیلم (Hallam) کی رائے میں مسلمان بادشاھوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو ان کے جرموں کی سزا دینے میں انتہائی انصاف سے کام لیتے ھیں۔ جہانگیر میں، اس کی تمام خامیوں کے باوجود، یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی اور عدل و انصاف کا شیدائی ہونے کے باعث آج تک اس کا نام مسلمانوں میں عزت و احترام سے لیا جاتا ہے،،۔[2]

عدل کے لیے شاہ جہاں کا نام بھی جہانگیر کی طرح ضرب المثل بن گیا ہے اور اس عہد کے ہر مورخ نے اس کے اس وصف کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ عام وقائع نگاروں اور برھمن کے علاوہ، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، ایک دوسرا ہم عصر مؤرخ صادق خاں بھی اس کی حکومت کی خصوصیات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر اس کے عدل و انصاف کا حال بیان کیا جائے تو ایک کتاب علحدہ تیار ہو جائے گی۔

---

۱ - صفحہ ۲۱۰
۲ - صفحہ ۱۲

مقدمات فوجداری کی سماعت

جہاں تک مقدمات کی سماعت کے طریقے کا تعلق ہے، مقدمات دیوانی کی طرح عاملہ کو عدلیہ سے ہمیشہ علحدہ نہ رکھا جاتا تھا۔ آئین کے بموجب گورنر کو سزائے موت دینے کا اختیار بھی حاصل تھا اگرچہ عملاً اس اختیار کے استعمال پر بڑی پابندیاں عائد تھیں۔ پلسائرٹ کا یہ قول کہ گورنر، دیوان اور بخشی روزانہ یا ہفتے میں چار دن ججوں کے ساتھ اجلاس کرتے ہیں، صرف نہایت اہم فوجداری مقدمات کے متعلق ہوگا۔[1]

مرآۃ میں مذکور ضوابط و ہدایات سے، جو وقتاً فوقتاً صوبوں کو بھیجے گئے تھے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنر کو اپنے صوبے میں مقدمات دیوانی کی سماعت پر عام نگرانی رکھنے کا حق حاصل تھا۔ مقدمات کی سماعت کے لیے وہ خود عدالت میں بیٹھتا تھا اور فوجداران ضلع جن ملزمان کو گرفتار کرتے انھیں اس کے حضور بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کا فرض تھا کہ نوعیت مقدمات کے بارے میں باز پرس کر کے دائرۂ شرع میں آنے والے مقدمات کو فیصلے کے لیے قاضی کے پاس بھیج دے، سیاسی جرائم کی سماعت خود کرے اور مالگزاری سے متعلق مقدمات دیوان کے پاس بھیجے۔[2]

۱۔ صفحہ ۵۷

۲- مرآۃ، ورق ۱۰۳ الف

کوتوال شہر براہِ راست گورنر کی نگرانی میں رہتا تھا اور مجرمین شہر کے بارے میں گورنر ھی اسے ھدایات دیتا تھا۔ ان مجرموں کو یا تو کوتوال کے ماتحت ملازمین یا خود مستغیث گورنر کے حضور لے کر آتے تھے۔[۱]

گورنر کو یہ ھدایت بھی تھی کہ وہ مہینے میں ایک بار قید خانوں کا معائنہ کیا کرے اور قیدیوں کی حالت معلوم کرے۔ اسے یہ اختیار حاصل تھا کہ جن قیدیوں کو وہ بےگناہ سمجھے انھیں رہا کر دے اور قاضی کو حکم دے کہ وہ زیر حراست ملزمین کے فیصلہ طلب مقدمات کی سماعت بلا تاخیر کرے۔[۲]

اس نوعیت کے معاملات میں اس کے اختیارات کا اندازہ ایک معاملے سے، جس میں احمد آباد کے قاضی کو اورنگ زیب نے تنبیہ کی تھی، نہایت اچھی طرح ھوتا ھے۔ اس تنبیہ کی وجہ یہ تھی کہ قاضیٔ مذکور نے بعض ایسے قیدیوں کو رہا کر دیا تھا جنھیں گورنر کے حکم سے مفسدہ پردازی کے الزام میں حراست میں رکھا گیا تھا۔ چنانچہ دیوان کے نام یہ حکم جاری ھوا کہ وہ اس قسم کے قیدیوں کو رہا نہ ھونے دیا کرے۔ آئندہ اگر ایسا ھوا تو اس کی ذمہ داری خود اُس پر عائد ھوگی۔[۳]

اورنگ زیب کے عہد حکومت کے بعض حوالوں سے پتا چلتا ھے کہ گورنر کے علاوہ ھر صوبے کے دیوان کا بھی یہ فرض تھا کہ

۱۔ مرآة، ورق ۱۰۴ ب

۲۔ مرآة، ورق ۱۰۴ الف

۳۔ مرآة، ورق ۱۱۱ ب

وہ عدل گستری کے اس شعبے پر نظر رکھے - چنانچہ ایک فرمان کے ذریعے خواجہ محمود ہاشم ، دیوان احمد آباد کو براہ راست حکم دیا تھا کہ وہ فیصلہ طلب مقدمات کا جائزہ لے کر ایسی تدابیر اختیار کرے کہ وہ بلاتاخیر مزید فیصل کر دیے جائیں - نیز اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں گورنر کے مشورے سے کام کرے اور تمام معاملات سے دربار کو مطلع کرتا رہے - (پیوستہ حقائق را می نوشتہ باشند و دریں باب تاکید دانند) -[1]

غرضکہ جس طرح دارالحکومت میں مقدمات فوجداری کے منصفانہ فیصلے کی نگرانی بادشاہ کرتا تھا اسی طرح صوبے میں اس کی نگرانی بادشاہ کے نائب یعنی گورنر صوبہ کے ذمے تھی اور گورنر نیز قاضی کے کام کی نگرانی ، دیگر صوبائی امور کی طرح ، دیوان کرتا تھا -[2]

سزائیں

"سزاؤں کے معاملے میں بھی مغل اسلامی قانون کی پابندی کرتے تھے اور اگرچہ تینوں بادشاہوں نے بعض معاملات میں اس کی پابندی نہ کی لیکن بحیثیت مجموعی قاضی اور مجسٹریٹ تمام مقدمات کے فیصلے اسلامی قانون ہی کے مطابق کیا کرتے تھے -

---

۱ - مرآۃ ، ورق ۱۰۴

۲ - اورنگ زیب کے ایک حکم سے جو صوبجاتی عہدہ داروں کے نام ہے ، یہ پتا چلتا ہے کہ قاضی ہفتے میں چار دن اجلاس کرتے تھے - جمعے کو تعطیل رہتی تھی - چہار شنبہ کو انہیں گورنر کے دفتر میں حاضر رہنے کا حکم تھا جہاں غالباً وہ گورنر کے ساتھ اجلاس کر کے مشترکہ طور پر مقدمات فوجداری کی سماعت کیا کرتے تھے - عدالت کا وقت طلوع آفتاب سے لے کر نماز ظہر (ایک بجے بعد دوپہر) تک ہوتا تھا - مرآۃ -

اسلامی قانون کے بموجب سزائیں چار قسم کی ہوتی ہیں :

۱- قصاص - یعنی وہ سزا جو کسی شخص کو قتل کر دینے یا اس طرح مجروح کرنے پر کہ نتیجہ ہلاکت نہ ہو ، دی جائے۔

۲- دیت یعنی خوں بہا یا معاوضہ جو کوئی شخص ، جس نے کسی دوسرے کو قتل یا مجروح کیا ہو ، ادا کرے۔

۳- حد - یعنی وہ ناقابل تبدیل سزائیں جو از روئے شرع پہلے سے مقرر ہیں یا جن کی قطعی تعریف اسلامی شریعت میں موجود ہے اور جس میں کمی یا بیشی کی گنجائش نہیں ہے - مثلاً (الف) زنا کرنے پر سنگسار کرنا یا درے لگانا (ب) کسی شادی شدہ عورت پر حرامکاری کا جھوٹا الزام لگانے پر درّے لگانا - (ج) چوری کرنے پر ہاتھ کاٹ دینا - یا ڈاکا ڈالنے کی سزائیں جو مختلف حالات میں مختلف نوعیت کی ہیں -

۴- تعزیر - وہ سزا ہے جس کا تعین جج خود اپنے اندازے کے مطابق کرے ''فقہ میں تعزیر ایسے جرم کے لیے ہے جس کے لیے حد شرعی جاری نہ ہو سکے نہ اس کے لیے کوئی کفارہ مقرر ہو خواہ وہ جرم خدا کے کسی حکم کی نافرمانی ہو جیسے پنجگانہ نماز نہ پڑھنا روزہ نہ رکھنا ، خواہ وہ ایسا جرم ہو جس میں کسی بندۂ خدا کی حق تلفی ہوتی ہو جیسے فریب دہی اور جھوٹی شہادت دینا ......'' تعزیر میں قید ، جلاوطنی ، سزائے تازیانہ ، سرزنش یا

کوئی دوسری ذلت آمیز کارروائی داخل ہے۔ تعزیر کے اطلاق کی خاص شرط یہ ہے کہ مجرم کے ہوش و حواس درست ہوں۔[1]

اس امر کا فیصلہ کہ کس قسم کی اور کتنی سزا دی جائے قطعاً جج کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا کیونکہ اس قسم کی سزا کا مقصد اصلاح ہے لہٰذا اس سزا کی مقدار ہر شخص کے لئے الگ الگ ہوتی ہے۔ بعض فقہا معاشری حیثیت اور ذہنی صلاحیتوں کی بناء پر عوام کو چار طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں اور بعض ''فرد کے باطنی اوصاف''، اس کی دین داری اور طرز معاشرت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔

''حد'' کی بہ نسبت ''تعزیر'' والے مقدمات کی سماعت کا طریقہ آسان ہے۔ یہ سزا اقبال جرم کرلینے پر دی جاتی ہے۔ اقبال جرم کر لینے کے بعد انکار جرم نہیں ہو سکتا یہ سزا دو گواہوں کی شہادت پر بھی دی جا سکتی ہے خواہ ان میں سے ایک گواہ کوئی عورت کیوں نہ ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ جرم کے متعلق جج کی ذاتی واقفیت ہی کافی ہے۔

جہاں تک قصاص یعنی قتل کے مقدمات میں سزائے موت کا تعلق ہے اکبر اور اس کے قریبی جانشینوں کی کوشش خاص طور پر یہی رہی کہ اس سزا کا اختیار کلی طور پر قاضیوں اور دوسرے مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں نہ رہے۔ ۲۷ سنہ جلوس اکبری میں اکبر

---

۱ - باب ھذا کا یہ حصہ انسائیکلو پیڈیا آو اسلام، جلد اول، صفحات ۱۳۲، ۹۸۰، جلد دوم، صفحات ۱۸۶، و ۱۰۳۸، اور صفحہ ۷۱۰ (تعزیر کے لیے)۔ اور ھدایہ (ھیملٹن) جلد ھفتم، سے ماخوذ ہے۔

کے حضور یہ تجویز پیش کی گئی کہ صوبائی گورنروں کے ہاتھوں سے اس سزا کا اختیار واپس لے لیا جائے اور یہ قاعدہ وضع کیا گیا کہ اس سزا کی تعمیل کے لیے بادشاہ کی منظوری لازمی ہے۔ اکبر کے جانشینوں نے بھی یکساں طور پر سے برقرار رکھا۔ چنانچہ ہر جانشین کے حالات میں اس سلسلے کے قطعی احکام یا حوالے موجود ہیں۔ حتیٰ کہ، بقول پادری مانسریٹ کے جب اکبر خود فرائض قضا انجام دیتا تو اس کی تاکید یہی تھی کہ جب تک وہ تیسری بار حکم صادر نہ کرے، مجرموں کو سزا نہ دی جائے۔[1] جہانگیر کے متعلق ڈیلائٹ کے خیالات اوپر بیان ہو چکے ہیں۔[2] تھوناٹ (Thevenot) کہتا ہے ''بادشاہ یہ اختیار اپنے لیے ہی مخصوص رکھتا ہے۔ لہذا جب کوئی شخص سزائے موت کا مستوجب ٹھہرتا ہے تو بادشاہ کی مرضی معلوم کرنے کے لیے ایک نامہ بر اس کے حضور بھیجا جاتا ہے اور جوں ہی وہ بادشاہ کا حکم لے کر واپس آتا ہے فوراً اس کی تعمیل کی جاتی ہے''[3] شاہ جہاں کے متعلق لاہوری بھی یہی کہتا ہے۔ ''جب کسی صوبے میں کسی شخص کا ایسا جرم ثابت ہو جاتا ہے جس کی سزا موت ہو تو ناظم (گورنر) یہ جرأت نہیں کر سکتا

---

۱ - مانسریٹ، صفحہ ۲۰۹ - وہ خاص خاص مقدمات کا بھی ذکر کرتا ہے - صفحات ۲۰۹ - ۲۱۱

۲ - ڈیلائٹ - صفحہ ۹۳ -

۳- تھوناٹ (Thevenot)، جلد سوم، صفحہ ۱۹

کہ بادشاہ کی منظوری حاصل کیے بغیر سزائے موت کے فیصلے کی تعمیل کردے"۔[1]

جرائم جن کی سزا موت تھی

بموجب ہدایہ ایسے جرائم صرف تین ہیں۔ الحاد و ارتداد، زناء محصنہ اور قتل۔[2] لیکن سلطان محمد تغلق نے جب ایک بار ضیاء برنی

۱ - پادری مانسریٹ نے وہ مقدمہ جو دیوان، شاہ منصور پر غداری کے جرم میں اور ایک دوسرا مقدمہ جو ایک عہدہ دار پر زنا کرنے کی پاداش میں چلایا گیا تھا، خود اپنی سے دیکھا تھا۔ اس نے اول الذکر مقدمے کے سلسلے میں جو کچھ دیکھا تھا اس کی تفصیل وہ یوں بیان کرتا ہے۔ "بادشاہ نے اپنے محافظ دستے نیز جلادوں کے افسروں کو اور چند ممتاز سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ وہ سب منصور کے ساتھ بادوم نامی مقام پر ٹھہریں (بادشاہ کابل جارہا تھا) بعد ازاں اس نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ وہ ان گواہوں کے سامنے جملہ الطاف و عنایات خسروی کی تفصیل بیان کرے جو اس نے منصور پر زمانۂ طفلی سے اس وقت تک ارزانی فرمائی تھیں۔ اس کے بعد اس کی احسان فراموشی اور غداری کے ثبوت اس کے سامنے پیش کیے گئے۔ ملزم کا جرم ثابت ہوگیا۔ اس کے وہ خطوط جو اس نے مرزا حکیم کو خود لکھے تھے، عدالت میں پیش کیے گئے اور اسے دکھائے گئے۔ چنانچہ اس شہادت پر اسے پھانسی کا حکم دیا گیا . . . اسے پھانسی دے دینے کے بعد تمام لوگ شاہی فرودگاہ پر واپس آگئے۔ بادشاہ کے سوگوار چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس بد نصیب شخص کے انجام پر بے انتہا صدمہ ہے (صفحہ ۹۹)۔ اس معاملے کا حوالہ باب ۵ میں دیا جاچکا ہے

دوسرے مقدمے کی بابت وہ لکھتا ہے۔ "بادشاہ کو عیاشی اور زنا کاری سے اس قدر نفرت تھی کہ اس نے اپنے محکمۂ تجارت کے حاکم اعلیٰ کو شادی شدہ ہونے کے باوجود، شریف برہمن خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ زنابالجبر کرنے پر معاف نہیں کیا حالانکہ اس سلسلے میں اس پر اثر بھی ڈالا گیا اس سے منت سماجت بھی کی گئی اور ایک بڑی رقم بطور فدیہ بھی ادا کرنے کی پیش کش کی گئی۔ اس بدبخت کو بادشاہ کے حکم سے نہایت بیدردی کے ساتھ گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ (صفحہ ۲۱۰)

۲ - ہدایہ۔ صفحہ ۱۷۸ -

سے اس کی بابت استفسار کیا تو ضیاء نے جواب دیا کہ ایسے جرائم سات ہیں (پہلے تین تو وہی جو اوپر مذکور ہوئے اور جن کی اجازت حق تعالیٰ نے دے دی ہے۔ ان کے علاوہ چار یہ ہیں: غداری، بغاوت، بادشاہ کے دشمنوں کو آدمی، اسلحہ یا اطلاعات بہم پہنچا کر مدد دینا اور ایسی عدول حکمی جس سے مملکت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو) جو بادشاہوں کے نزدیک امن و امان قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں اور جو جمشید کے مجموعۂ ضوابط میں بھی شامل ہیں۔[1]

مجھے سزائے موت کے صرف پچیس مقدمات ایسے مل سکتے ہیں جن کی سماعت اور فیصلہ زیر بحث تین مغل شہنشاہوں نے کیا تھا۔ ان میں سے ۱۳ مقدمات کا تعلق اکبر کے دور حکومت سے، ۱۲ کا جہانگیر سے اور صرف ایک کا شاہ جہاں سے ہے۔[2]

بہ لحاظ نوعیت جرم انہیں حسب ذیل شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:—

قتل	۱۱
کھلی بغاوت، جس میں غنیم سے مل جانا بھی شامل ہے (لیکن اس میں زمینداروں کی مسلح بغاوتیں شامل نہیں ہیں)	۷
شاہی خزانے میں چوری	۱

۱ - برنی - صفحات ۵۱۰ - ۵۱۱ -

۲ - اس حساب سے کل مقدمات چھبیس ہوتے ہیں - اس میں شمار کی غلطی معلوم ہوتی ہے مترجم -

ڈاکا	۱
فوجی سپاہیوں کا بلا اجازت ایک غنیم کی لشکر گاہ لوٹنا	۱
زناء محصن	۱
رعیت پر شقدار کا ظلم	۱
ایک جلودار کا شاہی شکار میں رکاوٹ پیدا کرنا	۱
عہد حکومت شاہ جہان (۴ سنہ جلوس) میں قحط کے دوران میں بکری کے گوشت کے بجائے کتے کا گوشت فروخت کرنا....	۱
میزان———	۲۵

تعمیل سزائے موت

معلوم ہوتا ہے کہ سزائے موت کی تعمیل میں اسلامی قانون کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ اس کا طریقہ زیادہ تر جرم کی نوعیت اور ان حالات کی مناسبت سے طے کیا جاتا تھا جن میں متعلقہ جرم کا ارتکاب کیا گیا ہو۔ پادری مانسریٹ، جو واقعات کو بہ نظر عمیق دیکھتا اور تذکرہ نگاری میں قطعیت، شرح و بسط اور صحت کا شائق ہے، سزاؤں کی نوعیت بھی بیان کرتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے: ''سزائے موت کے مجرموں کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا جاتا ہے یا انھیں سولی یا پھانسی دی جاتی ہے۔ اغوا کرنے والوں اور زانیوں

سے اس کی بابت استفسار کیا تو ضیاء نے جواب دیا کہ ایسے جرائم سات ہیں (پہلے تین تو وہی جو اوپر مذکور ہوئے اور جن کی اجازت حق تعالیٰ نے دے دی ہے۔ ان کے علاوہ چار یہ ہیں: غداری، بغاوت، بادشاہ کے دشمنوں کو آدمی، اسلحہ یا اطلاعات بہم پہنچا کر مدد دینا اور ایسی عدول حکمی جس سے مملکت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو) جو بادشاہوں کے نزدیک امن و امان قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں اور جو جمشید کے مجموعۂ ضوابط میں بھی شامل ہیں۔[1]

مجھے سزائے موت کے صرف پچیس مقدمات ایسے مل سکتے ہیں جن کی سماعت اور فیصلہ زیر بحث تین مغل شہنشاہوں نے کیا تھا۔ ان میں سے ۱۳ مقدمات کا تعلق اکبر کے دور حکومت سے، ۱۲ کا جہانگیر سے اور صرف ایک کا شاہ جہاں سے ہے۔[2]

بہ لحاظ نوعیت جرم انھیں حسب ذیل شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:—

قتل	۱۱
کھلی بغاوت، جس میں غنیم سے مل جانا بھی شامل ہے (لیکن اس میں زمینداروں کی مسلح بغاوتیں شامل نہیں ہیں)	۷
شاہی خزانے میں چوری	۱

۱ - برنی - صفحات ۵۱۰ - ۵۱۱ -

۲ - اس حساب سے کل مقدمات چھبیس ہوتے ہیں - اس میں شمار کی غلطی معلوم ہوتی ہے مترجم -

ڈاکا	۱
فوجی سپاھیوں کا بلا اجازت ایک غنیم کی لشکر گاہ لوٹنا	۱
زناء محصن	۱
رعیت پر شقدار کا ظلم	۱
ایک جلودار کا شاھی شکار میں رکاوٹ پیدا کرنا	۱
عہد حکومت شاہ جہان (۴ سنہ جلوس) میں قحط کے دوران میں بکری کے گوشت کے بجائے کتے کا گوشت فروخت کرنا....	۱
میزان	۲۵

تعمیل سزائے موت

معلوم ھوتا ھے کہ سزائے موت کی تعمیل میں اسلامی قانون کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ اس کا طریقہ زیادہ تر جرم کی نوعیت اور ان حالات کی مناسبت سے طے کیا جاتا تھا جن میں متعلقہ جرم کا ارتکاب کیا گیا ھو۔ پادری مانسریٹ، جو واقعات کو بہ نظر عمیق دیکھتا اور تذکرہ نگاری میں قطعیت، شرح و بسط اور صحت کا شائق ھے، سزاؤں کی نوعیت بھی بیان کرتا ھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ھے: ''سزائے موت کے مجرموں کو ھاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا جاتا ھے یا انھیں سولی یا پھانسی دی جاتی ھے۔ اغوا کرنے والوں اور زانیوں

کو پھانسی دی جاتی ہے یا انھیں دار پر چڑھایا جاتا ہے،،۔[1]
سزائے موت کے مذکورۂ بالا پچیس مقدمات میں پانچ ملزموں کو ھاتھی کے پاؤں سے کچلوایا گیا۔[2] ایک کو گلا گھونٹ کر ھلاک کیا گیا اور باقی اشخاص کے سر قلم کیے گئے یا انھیں پھانسی دی گئی۔[3]

---

۱ اور ۲ - مانسریٹ ، صفحہ ۲۱۰ اور صفحات ۸۰—۸۷، ھاتھیوں کو مختلف کاموں کی تربیت خاص طور پر دی جاتی تھی۔ ''وہ اپنے مہاوتوں کی آواز اچھی طرح پہچانتے ھیں اور بلا چون و چرا اُن کا حکم مانتے ھیں۔ وہ گرہ باندھ اور کھول سکتے ھیں۔ کوئی چیز ھو اسے دھکا دے سکتے ' اٹھا سکتے ' دوبارہ نیچے رکھ سکتے یا اُسے پلٹا سکتے ھیں۔ وہ پھندے لگا سکتے اور انھیں کھول سکتے ھیں - زمین سے باریک تنکے اور چھوٹے سکے اٹھا سکتے ھیں - انھیں رقص کرنا بھی سکھایا جاسکتا ھے۔ مختصر یہ ھے کہ وہ اپنے مہاوت کے اشاروں پر ناچتے ھیں - - - ۔ مجرموں کو ان کے پاؤں سے کچلوا کچلوا کر ھلاک کر دیا جاتا ھے - - - ۔ اس تربیت کی وجہ سے وہ ھر اس آدمی کو کچل ڈالنے پر مائل ھوجاتے ھیں جو ان کی پشت پر سوار ھوتے وقت پھسل جائے یا نیچے گر پڑے کیونکہ وہ یہی سمجھتے ھیں کہ اسے ان کے سامنے اسی واسطے پھینکا گیا ھے''۔

۳ - ایڈورڈ ٹیری ، (Edward Terry) اس پر اتنا اضافہ اور کرتا ھے کہ کتوں اور سانپوں کے ذریعے نیز اسی قسم کے دیگر ذرایع استعمال کرکے بھی سزائے موت دی جاتی ھے (صفحہ ۳۲۶)۔ لیکن اس طرح سزا دینے کی نہ کوئی مثال میری نظر سے گزری نہ اس کا کہیں ذکر ملا۔ نہ کہیں اس بات کا ذکر نظر آیا کہ اس غرض کے لیے سانپ پالے جاتے تھے - البتہ شاھی شکار میں استعمال کے لیے کتے ضرور رکھے جاتے تھے - ٹیری نے اپنے سفرنامے میں اپنی معلومات کے تین ذرائع بتائے ھیں - (۱) ذاتی مشاھدہ ، (۲) ''کچھ کوریٹ (Coryat) سے'' (۳) ''کچھ سفیر (سرطاس رو) کے ملازموں وغیرہ کی گپ شپ سے یا سوداگران سورت کی یاوہ گوئی سے ماخوذ ھے'' (صفحہ ۲۸۸)۔ معلوم ھوتا ھے کہ ان اطلاعات کا اصل ماخذ نمبر (۳) ھے۔

بہر حال یہ بات قابل ذکر ہے کہ مقدمات فوجداری کی سماعت کرنے والے قاضیوں اور مجسٹریٹوں کو مذکورۂ بالا نوعیت کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اسلامی قانون کی پابندی کرتے تھے یا مقدمہ بادشاہ کے حضور بھیج دیتے تھے۔ صالح لکھتا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں اگر کوئی مجسٹریٹ کسی مقدمے کی سماعت کے سلسلے میں حدود شرع سے تجاوز کرتا تو اس جرم کی پاداش میں اسے بموجب شریعت سزا دی جاتی (در پیش گاہ خلافت و عدالت جزائے آں بر وفق شریعت بتقدیم رسد)۔[1]

دیگر سزائیں

آئین کے دیباچے میں ابوالفضل ایسے بدکردار شخص کے ھاتھ پاؤں کاٹ دینے کو حق بجانب قرار دیتا ھے ''جس کی سیہ کاریاں دوسروں کے لیے خطرناک ھوں اور جس کی برائیاں ایک جہان کو رنج میں مبتلا کر دیتی ھوں''۔ جب سرزنش، دھمکیوں یا قید سے کام نہ چلے تو ''اسے ان ذرائع ھی سے محروم کر دینا چاھیے جن کی مدد سے وہ بدکاری کرتا ھو چنانچہ اسے اپنی بینائی یا اپنے ھاتھ یا پاؤں سے محروم ھو جانا چاھیے۔ لیکن سزا دھی کے سلسلے میں بادشاہ اتنی سختی نہ کرے کہ مجرم کا رشتہ حیات ھی منقطع ھو جائے۔ (در گسیختن تاروپود ھستی دلیری

---

۱ - صالح، جلد اول، صفحہ ۲۵۲

نہ نمایند) کیونکہ حکماء محققین کی رائے میں انسان اللہ کی ایک نہایت عظیم الشان تخلیق ہے جسے تباہ کرنا وہ جائز نہیں گردانتے،،۔ [۱]

صوبائی حاکموں کے لیے جو ضوابط مقرر کیے گئے تھے وہ بھی اسی اصول پر مبنی تھے۔ ''اسے چاہیے کہ دقیقہ رس ہو اور نافرمانوں کو نیک مشوروں کے ذریعے راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔ اگر اس سے کام نہ چلے تو فوراً سزا دے۔ یہ تنبیہوں، دھمکیوں، قید، سزائے تازیانہ یا قطع اعضا کی شکل اختیار کر سکتی ہے لیکن کسی کا رشتۂ حیات منقطع کرنے سے قبل اسے انتہائی غوروخوض سے کام لینا چاہیے،،۔ [۲]

جہاں تک قطع اعضا یا بینائی سے محروم کر دینے کے واقعات کا تعلق ہے مانسریٹ ایک کا بھی ذکر نہیں کرتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک اس کا قیام دربار میں رہا اس نے کسی ایک مجرم کو بھی ایسی سزا پاتے نہیں دیکھا۔ اکبر اس معاملے میں بہت محتاط تھا اور مانسریٹ آن آلات سزا کی شکل و صورت بیان کرتے ہوئے، جو جلاد خاص کی تحویل میں رہتے تھے، لکھتا ہے: ''تاہم کسی کو سزا دیتے وقت ان آلات کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ استعمال کے لیے نہیں بلکہ زیادہ تر ان کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنا مقصود ہے،،۔ [۳]

---

۱ - آئین، صفحہ ٦ ' انگریزی ترجمہ ' صفحہ ۹ (دیباچہ)

۲ - آئین، صفحہ ۲۸۰ ' ترجمہ، صفحہ ۳۷ ' ابوالفضل بھی اسی پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اکبر مشکل ہی سے کسی کو سزائے موت دیتا ہے (اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۲۹۸ - ترجمہ، صفحہ ۴۴۲)

۳ - صفحہ ۲۱۱

جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد ایک فرمان کے ذریعے ناک کان کاٹنے کی سزا کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس سلسلے میں کہتا ہے کہ ''میں نے خود بھی خدا کی جناب میں یہ عہد کیا ہے کہ یہ سزا دے کر میں کسی کی شکل نہ بگاڑوں گا''۔ ایک دوسرے فرمان کے ذریعے جو ۶ سنہ جلوس میں جاری کیا گیا تھا حاکمان صوبجات کو حکم دیا گیا کہ وہ آئندہ کسی کو اندھا کرنے کی سزا نہ دیں۔[1]

واقعات جو عتاب شاہی کے موجب ہوئے

اس عہد کی تاریخ میں ایک واقعہ یہ مذکور ہے کہ جس زمانے میں اکبر گجرات کا دورہ کر رہا تھا اس کے ایک ملازم نے کسی دیہاتی کا جوتا زبردستی چھین لیا۔ اس پر اکبر نے ملازم کے پاؤں قلم کر دینے کا حکم دیا۔[2] اسی طرح بدتہذیبی اور گستاخی (بدزبانی[3]) پر ہمزبان کی زبان قلم کرا دی گئی اور ۳۴ سنہ جلوس میں شہزادۂ سلیم کے ساتھ بد تہذیبی سے پیش آنے پر خواجہ بھول کی زبان کی نوک کاٹ دی گئی[4] اور اسی سال قاسم نامی ایک شخص کو ایک با عصمت عورت کی عصمت دری کرنے پر آختہ کر دیا گیا۔[5] ۳۹ سنہ جلوس

۱۔ تزک ترجمہ، صفحہ ۲۰۵۔
۲۔ اکبر نامہ، جلد سوم، ۱۷ سنہ جلوس
۳۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۲۹
۴۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۷۷
۵۔ اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۷۳۳

میں شاہی ملبوسات خانے کے تحویلدار، شیدا بیگ کو کشک[1] (محل کی پہرہ داری) سے روزانہ غائب رہنے پر ماہ بہمن کی سردی میں کپڑے اتروا کر ٹھنڈے پانی میں غوطے دیے گئے۔ سردی کے باعث وہ مر گیا۔

جہانگیر کے عہد حکومت میں اس قسم کی سزا کے صرف دو واقعات ملتے ھیں۔ ایک تو راجہ بکرماجیت کے بیٹے کلیان کا واقعہ ھے جس میں کلیان کو اغوا اور قتل کے جرم میں زبان کاٹ دینے کے بعد قید کی سزا دی گئی اور شاہی عتاب کا نشانہ بننے کی دوسری مثال دو کہاروں کا واقعہ ھے جن کے پاؤں اس بناء پر قلم کر دیے گئے کہ انھوں نے شاہی شکار میں ایسے وقت رخنہ ڈالا تھا جب جہانگیر نشانہ لگا کر بندوق داغنے ھی والا تھا۔[2]

اکبر یا جہانگیر کے عہد میں کسی کو بینائی سے محروم کرنے یا کسی کے ناک کان کاٹ دینے کا ایک بھی واقعہ کہیں مذکور نہیں ھے۔ لیکن جہانگیر کے دو فرمانوں سے پتا چلتا ھے کہ اس نوعیت کی سزائیں صوبوں میں دی جاتی تھیں اور انھیں ممنوع قرار دینے کے لیے قطعی احکام صادر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

اس قسم کی سزاؤں کے مقدمات کا صحیح نمونہ ایک چور کا واقعہ ھے جسے ۱۲ سنہ جلوس میں جہانگیر کے حضور اس کے

۱۔ اکبر نامہ، جلد سوم صفحہ ٦٦٦ انگریزی ترجمے میں صفحہ ۱۰۲۱ پر کشک (Kishik) کا املا کشک (Kashak) غلط ھے۔

۲۔ تزک صفحہ ۷۹۔ ترجمہ، صفحہ ۱٦۴ (ترجمہ اصل سے مختلف ھے)
ان واقعات میں وہ سزائیں شامل نہیں ھیں جو جہانگیر نے شہزادہ خسرو کے حامیوں کو اس کی بغاوت کے بعد دی تھیں۔ ان کا شمار باغیوں میں کیا گیا تھا۔ ان کے واقعات عام معدلت گستری کے دائرے میں نہیں آتے۔

قیام احمد آباد کے دوران میں پیش کیا گیا ''....... کوتوال شہر ایک چور کو گرفتار کر کے لایا - وہ پہلے بھی کئی چوریاں کر چکا تھا اور ہر مرتبہ اس کا کوئی نہ کوئی عضو کاٹ دیا گیا تھا - ایک بار اُس کا داهنا هاتھ کاٹ دیا گیا - دوسری بار اس کے بائیں هاتھ کا انگھوٹھا ، تیسری بار اس کا بایاں کان ، چوتھی مرتبہ اس کے ایک گھٹنے کے پیچھے کی نس کاٹ کر اسے لنگڑا کر دیا گیا اور آخری بار اس کی ناک بھی اڑا دی گئی - لیکن ان سزاؤں سزاؤں کے باوجود وہ چوری سے باز نہ آیا اور کل چوری کرنے کے لیے ایک گھسیارے کے مکان میں گھس گیا - اتفاق سے مالک مکان غافل نہ تھا اور اس نے چور کو گرفتار کرلیا - چور نے گھسیارے کے جسم پر چاقو سے کئی وار کیے جس سے وہ بری طرح زخمی هوا اور مر گیا - شور غل اور گڑ بڑ میں گھسیارے کے عزیز و اقارب نے چور پر حملہ کر کے اسے پکڑ لیا - میں نے حکم دیا کہ چور کو گھسیارے کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا جائے اور وہ خود اس سے قصاص لیں (تا او را بہ قصاص رسانند)''[1]

مجھے شاہ جہاں کے عہدہ کا کوئی ایسا واقعہ نہیں ملا جسے معدلت گستری کے سلسلے میں عتاب شاهی کا نتیجہ قرار دیا جائے -

ملحوظ رہے کہ مذکورۂ بالا واقعات اس قسم کی سزاؤں کی مثالیں نہیں هیں بلکہ کل واقعات هی اتنے هیں جو عہد مذکور کی

---

۱ - تزک ، صفحہ ۲۱۴ - ترجمہ ، صفحہ ۴۳۲ - چور کے کان ناک وغیرہ کاٹنا جہانگیر کے محولۂ بالا حکم کے خلاف تھا - معلوم هوتا ھے کہ جہانگیر نے اسے نظر انداز کر دیا - اسی طرح یہ بھی اس سے ظاهر هوتا ھے کہ بار بار چوری کرنے کے باوجود مجرم کو موت کی سزا نہیں دی گئی کیونکہ ازروئے ضوابط اس جرم کے کے لیے سزائے موت کی اجازت نہ تھی -

تاریخوں میں مذکور ہیں اور یہی وہ تمام اہم واقعات ہیں جن میں بادشاہ نے بذات خود ایسی سزائیں دیں ۔ تاہم ان میں صوبوں کے واقعات شامل نہیں ہیں ۔ ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق تاریخی حقائق کی بنیاد پر کوئی قطعی رائے قائم کی جا سکے ۔ ڈیلائٹ ، پلسائرٹ اور ٹیری بعہد جہانگیر اور اس کے بعد برنیر ان سزاؤں کے متعلق جو واقعی ظالمانہ تھیں ، اپنی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ ان واقعات کو بیان نہیں کرتے جو انھوں نے مشاہدہ کیے تھے ۔ اکبر کے زمانے میں مانسریٹ نے سزائے موت کے دو واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے ۔ ان کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اور یہ دونوں واقعات اکبر نامے میں بھی مذکور ہیں ۔

قید — اس سزا کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ کوئی خاص مدت متعین نہیں کی جاتی تھی ۔ قاضی اور مجسٹریٹ کو حق حاصل تھا کہ وہ کسی شخص کو بھی کسی ایسے قصور یا جرم کی پاداش میں قید کر دیں جس کی سزا قید ہو اور قید سے رہائی پانے کے لیے ضروری تھا کہ ملزم سے آثار ندامت ظاہر ہوں ۔ اس سزا کی غرض یہ بھی ہو سکتی تھی کہ کسی کو زیر حراست رکھا جائے اور یہ بھی کہ اس کی اصلاح ہو جائے ۔ لیکن اول الذکر غرض کے لیے کسی مدت کا تعین ضروری ہے اور مؤخر الذکر مقصد کے لیے ضروری ہے کہ قید کے دوران میں قیدی کی اصلاح کے لیے کوئی عملی تدابیر اختیار کی جائیں ۔ اول الذکر کے نہ ہونے سے غریب قیدی مایوسی کا شکار ہو جاتا تھا اور مؤخر الذکر کا فقدان عاملہ کے ہاتھوں میں ظلم و تعدی کا ایک

خطرناک ہتھیار بن جاتا تھا۔ اسلامی قانون کے بموجب ہر قاضی کا یہ دینی فرض ہے کہ وہ قیدیوں پر رحم کرے اور اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے کہ آیا قیدیوں سے آثار ندامت ظاہر ہوئے یا نہیں، وقتاً فوقتاً ان کی حالت کا معائنہ کرتا رہے۔ لیکن ہر جج یا مجسٹریٹ خدا ترس نہیں ہو سکتا نہ ہمیشہ اپنے فرائض میں اصول کا پابند رہ سکتا ہے۔ اس کے اوپر کوئی ایسا با اختیار طاقتور حاکم ہونا چاہیے جو اسے فرض منصبی کے ادا کرنے پر مجبور کرسکے۔ اسی طرح کوئی قطعی قانون ایسا ہونا چاہیے جو اس کی رہنمائی کرسکے اور غفلت پر اسے ذمہ دار قرار دے۔

قیدیوں کی حالت ہماری توقع کے مطابق اچھی نہیں ہو سکتی تھی۔ یوروپین سیاحوں کے بیانات نیز ان واقعات کے بموجب جو جا بجا تاریخی کتب میں مذکور ہیں، یہ واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آج کل کی اصطلاح کے مطابق باقاعدہ جیل خانے نہ ہوتے تھے نہ اخلاقی یا سیاسی مجرموں کو زیر حراست رکھنے کے لیے مناسب انتظامات تھے۔ اس کے متعلق بھی مانسریٹ کا بیان اس کے دوسرے بیانات کی طرح نہایت مفصل ہے۔ وہ کہتا ہے: ”معمولی مجرموں کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر زیر نگرانی رکھا جاتا ہے مگر انھیں کسی قید خانے میں نہیں رکھتے۔ وہ شہزادے جنھیں سزائے قید دی جاتی ہے گوالیار بھیج دیے جاتے ہیں جہاں وہ قید اور گندگی میں زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ طبقۂ امرا کے مجرموں کو سزا کے لیے دیگر امراء کے حوالے کردیا جاتا ہے لیکن معمولی درجے کے اشخاص کو یا تو ہرکاروں کے سربراہ کے سپرد یا جلاد خاص کے

حوالے کردیا جاتا ہے''۔[1] ہر شخص اچھی طرح یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ ان حالات میں ہر طبقے کے قیدیوں کا کیا حال رہتا ہوگا۔ یہ حالات اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں تینوں کے دور حکومت کے واقعات سے مطابقت بھی رکھتے ہیں۔ مرزا حکیم (برادر اکبر) کے فرزند مرزا کیقباد کو بہت زیادہ شراب پینے کے جرم میں جگن ناتھ کے حوالے کر دیا گیا۔[2] شہزادہ خسرو کو جہانگیر کے عزیز دوست انی رائے کی نگرانی میں رکھا گیا تھا۔[3] اسی طرح سلطان حسین مرزا کے بیٹے شہزادہ رستم مرزا کو، ظلم و تشدد کی بنا پر ٹھٹھہ (سندھ) کی گورنری سے معزول کیے جانے کے بعد، انی رائے کے حوالے کیا گیا تھا۔[4]

کوتوالوں کو اورنگ زیب کی ہدایت تھی کہ قیدیوں کی میعاد قید ختم ہو جانے پر وہ انھیں متعلقہ قاضی کے پاس لے جایا کریں اور ان کی رہائی کی بابت اس سے دریافت کیا کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی مدت قید کا تعین بھی کیا کرتے تھے۔

---

۱ - مانسریٹ، صفحہ ۲۱۱

۲ - اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۲۸

۳ - رو۔ (Roe) صفحہ ۲۴۶ - مراۃ میں ان قیدخانوں کا ذکر ہے جو صوبائی صدر مقامات میں تھے اور جہاں صوبہ کی تمام قسمتوں سے قیدی بھیجے جاتے تھے۔

۴ - تزک - ۹ سنہ جلوس، صفحہ ۱۲۸ -

ڈیلائٹ - صفحہ ۳۶، گوالیار، رنتھمبور، اور روتھاس کے جیل خانوں کے لیے -

برنیر - صفحات ۱۰۶ - ۱۰۷، ان شہزادوں کے متعلق جنھیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے قید خانوں میں ڈالا جاتا تھا۔

لیکن قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ بھی ان کی ذاتی رائے ہی پر منحصر رہتا تھا ، اس کے لیے کوئی مقررہ قواعد نہ تھے ۔

اس قسم کے قیدی سب سے زیادہ تعداد میں اس وقت رہا ہوتے تھے جب بادشاہ اپنی قلمرو کا دورہ کرتا تھا ۔ اکبر نے اپنے دوروں میں متعدد بار قیدیوں کو رہا کیا ۔ لیکن تعجب ہے کہ ابوالفضل ان واقعات کا ذکر نہیں کرتا ۔ حالانکہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے متعلق ایسی متعدد مثالیں مذکور ہیں ۔ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد وہ تمام قیدی رہا کردیے ''جو قلعوں اور قید خانوں میں عرصۂ دراز سے اسیر تھے''۔[۱] ۱۱ سنہ جلوس میں اجمیر سے دکن جاتے ہوئے اس نے قلعۂ رنتھمبور کے بعض قیدیوں کو رہا کر دیا ۔[۲] ۱۳ سنہ جلوس میں واپس ہوتے ہوئے اس نے قلعۂ مذکور کے تمام قیدیوں کے حالات کا دوبارہ جائزہ لیا ۔ ''میں نے حکم دیا کہ میرے حضور آن تمام مجرموں کو پیش کیا جائے جو اس قلعے میں قید ہیں تا کہ میں ہر ایک کے حالات پر غور کرسکوں اور ایسا حکم دے سکوں جو انصاف پر مبنی ہو ۔ مختصر یہ کہ ان اشخاص کے سوا جو قتل کے جرم میں ماخوذ تھے یا جن کی رہائی ملک میں شورش یا کسی مصیبت کا موجب ہو سکتی تھی ، میں نے سب کو رہا کر دیا اور ہر ایک کو اس کے حالات کے مطابق مصارف سفر اور خلعت سے سرفراز کیا ۔[۳] متعدد انفرادی معاملات

---

۱ - تزک ـ صفحہ ۵ ۔

۲ - تزک ـ صفحہ ۱۷۰ ۔

۳ - تزک ـ صفحہ ۶۵۲ - ترجمہ ' صفحات ۵۹—۶۰ ۔

کی جانب بھی جہانگیر نے وقتاً فوقتاً بہ نفس نفیس توجہ کی اور اس کا نتیجہ بحیثیت مجموعی بہت ہی اچھا نکلا۔

اسی طرح شاہ جہاں نے گوالیار کے قلعے کا کا معائنہ کیا، تمام قیدیوں کے حالات کا جائزہ لیا اور بجز ان قیدیوں کے جن کی رہائی مناسب نہ تھی یا خطرے سے خالی نہ تھی، سب کو رہا کر دیا۔[1] ۵ سنہ جلوس میں جب وہ دوبارہ اس طرف سے گزرا تو قلعۂ مذکور میں صرف گیارہ قیدی ایسے تھے جو عرصۂ دراز سے وہاں قید تھے۔ وہ سب رہا کر دیے گئے۔ اس سلسلے میں وقائع نگار لکھتا ہے کہ مقررہ قاعدہ یہی ہے کہ جس قلعے میں بادشاہ قیام فرمائے اس کے تمام قیدیوں کے حالات حضور شاہی میں پیش ہونے چاہییں۔[2]

۱۷ سنہ جلوس میں شاہ جہاں کی عزیز ترین بیٹی، بیگم صاحب کو، طویل علالت کے بعد صحت نصیب ہوئی۔ اس خوشی میں بڑا جشن منایا گیا اور ایک غیر معمولی واقعے کے طور پر وہ تمام قیدی بھی رہا کر دیے گئے جو پرانے قرضوں کی عدم ادائگی کی بناء پر قید کیے گئے تھے اور ان سب کے قرضے جن کی مجموعی مالیت سات لاکھ روپے ہوئی شاہی خزانے سے ادا کر دیے گئے۔[3]

---

۱ - لاهوری، جلد اول، صفحہ ۲۴۵ -

۲ - لاهوری، جلد اول، صفحہ ۲۴۶ -

۳ - لاهوری، جلد دوم، صفحہ ۳۵۵ -

نظام عدالت پر تبصرہ

گزشتہ صفحات میں جس نظام عدالت کا بیان ہوا۔ اس کی دو خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔ اولاً یہ کہ اکبر اور اس کے جا نشینوں نے اسلامی مملکت کے اس ڈھانچے کو من و عن بر قرار رکھا جو مسلم فقہا نے معین کیا تھا اور نظام عدالت میں علی العموم انھوں نے اسلامی قانون کی سخت پابندی کی۔ اتنی سخت پابندی انھوں نے اپنی سلطنت کے کسی سیاسی شعبے میں نہیں کی۔

ثانیاً یہ کہ ان کا محکمۂ عدل، بلحاظ تنظیم، درجہ و عظمت، مرکزی حکومت کے باقی تمام محکموں سے کہیں زیادہ بہتر و برتر تھا حالانکہ باقی محکموں کی تنظیم بھی نہایت اعلیٰ درجے کی تھی اور ان کا عملہ بھی قابل و کار گزار اشخاص پر مشتمل تھا۔

تاریخ ہند کے اس دور کے حالات لکھنے والے مورخین نے وقتاً فوقتاً مذکورہ بالا ہر دو خصوصیات کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان اسباب سے بحث نہیں کی جن کے باعث یہ صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلامی قانون کی حدود اطلاق کیا تھیں، نیز یہ کہ اس کا اطلاق محض ایک قلیل حصہ آبادی پر کیا جاتا تھا۔ دوسری خصوصیت کا مقدم ترین سبب محض یہ تھا کہ مندرجہ ذیل امور نے سرکاری محکمۂ قضا کے کام کو بہت مختصر بنا دیا تھا:-

(ا) هندو قانون اور مسلم قانون کی مذہبی نوعیت جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ (ب) هندوستانی دیہات کی وہ تنظیم جس میں دیہاتی باشندے اپنے مقدمات دیوانی و فوجداری خود ھی طے کر لیا کرتے تھے۔ (ج) شہروں اور قصبوں کے معاشرے کی تنظیمی نوعیت——جس میں خاندان، قبیلے یا برادری، کے بزرگ یا سردار تنازعات کا فیصلہ کرتے تھے اور دیوانی معاملات میں مقدمہ بازی کی گنجائش بہت کم رہ جاتی تھی۔ (د) وہ گہرے تعلقات جو لوگوں کے درمیان، معاشرے کی مخصوص نوعیت اور اس کی ضروریات کے تقاضوں کی بناء پر، ایک دوسرے سے قائم رہتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں بھی لوگ ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ معاشرے کی یہ خصوصیت آج بھی هندوستان میں پریزیڈنسیوں کے بڑے بڑے صدر مقامات میں تو نہیں لیکن چھوٹے چھوٹے شہروں میں ضرور پائی جاتی ھے۔[1]

مثال کے طور پر اگر وراثت سے متعلق کوئی دیوانی جھگڑا اٹھ کھڑا ھوتا تو اسے خاندان کے بزرگ طے کر دیتے تھے جنھیں خارجی گواھوں کی بہ نسبت حقیقت حال کا بہتر علم ھوتا تھا یا پھر اسے مسلمان فریقین کے لیے قاضی اور ہندوؤں کے لیے هندو عدالتیں طے کرتی تھیں۔ اس طرح سرکاری عدالتوں میں صرف وھی چھوٹے چھوٹے مقدمات پہنچتے ھوں گے جن

---

۱ - یہ برطانی عہد کے هندوستان کا ذکر ھے - مترجم

کا تعلق مختلف افراد معاشرہ کے کار و باری یا معاهداتی معاملات سے ہوتا ہوگا اور عہد مذکور کی تاریخ میں جن مقدمات کا ذکر ملے گا وہ اسی نوعیت کے ہوں گے۔

اسی طرح ایک ایسے معاشرے میں جہاں ہر شخص دوسرے شخص کو اچھی طرح جانتا ہو اور جہاں ایک شخص کی نقل و حرکت، اس کی طرز زندگی اور چال چلن دوسرے سے پوشیدہ نہ رہ سکتی ہو، جس میں کوئی خبر یا افواہ آگ کی طرح پھیل جاتی ہو اور کسی شخص کی بد چلنی محض اس کی بدنامی کا سبب نہ بنتی ہو بلکہ اس کے پورے خاندان کی شہرت و حیثیت کو خاک میں ملا دیتی ہو، ایسے معاشرے میں معدودے چند جرائم ہو سکتے ہیں اور ان کا پتا چلا لینا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ چنانچہ عہد مذکور کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی مطالعہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ چوری، ڈکیتی اور راہ زنی ہی خاص جرائم تھے اور ان کے مرتکب خاص طور پر وہ لوگ یا ایسے گروہ ہوتے تھے جو ایسے جرائم کا ارتکاب بطور پیشہ کرتے تھے۔ البتہ ان میں وہ واقعات شامل نہیں ہیں جو وقتاً فوقتاً ہر معاشرے میں اتفاقیہ طور پر انسان کی زندگی اور انسانی تعلقات میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔

مجرموں کے ان گروہوں کو امن و عافیت کا دشمن سمجھا جاتا اور اُن کے استیصال کے لیے فوجی طاقت استعمال کی جاتی تھی۔ وہ لوگ بھی اس کے لیے تیار رہتے تھے اور ان کی قسمت کا فیصلہ عدالتوں میں نہیں بلکہ جنگ کے میدانوں میں

ہوتا تھا - شہروں اور قصبوں میں چھوٹے چھوٹے جرائم کرنے والے اشخاص با قاعدہ سرکاری عدالتوں میں اور سنگین قسم کے اتفاقی جرائم کے مقدمات بادشاہ کے حضور پیش کیے جاتے تھے -

حکومت نے معاشرے کے قدیم ڈھانچے کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ یہ انتظام بھی کیا کہ وہ آئندہ بھی باقی رہے - مغلوں کے طویل دور حکومت میں اس کی اصل خصوصیات یا تنظیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی - نہ اس میں سرکاری عدالتوں کے ذریعے عدل گستری کی کوئی مزید گنجائش پیدا کی گئی -

معاشرے کا رحجان نیز حکومت کا اصول کار یہی تھا کہ لوگ مقدمہ بازی کو مذموم سمجھیں اور اس سے محترز رہیں لہذا اس کے لیے سہولتیں مہیا نہیں کی جاتی تھیں -

شہروں اور پرگنوں کی عدالتیں مقامی مقدمات کے لیے، جن کی تعداد محدود ہوتی تھی، کافی تھیں اور اس امر کی ضرورت ھی محسوس نہ ہوتی تھی کہ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے - اسی طرح چونکہ مقصد یہ تھا کہ لوگ مقدمہ بازی میں مبتلا نہ ہوں، مختلف درجوں کی عدالتیں بھی قائم نہیں کی گئیں اس سے ہر فیصلے کے خلاف مرافعے کی ترغیب ہوتی ہے - اس نقطۂ نظر کی تائید طریقۂ عدل گستری سے بھی ہوتی ہے - کوشش کی جاتی ہے کہ مقدمے کا فیصلہ محض اس شہادت کی بناء پر نہ کیا جائے جو عدالت میں پیش

کی گئی ہو بلکہ حقیقت معلوم کرنے کے لیے دوسری تدابیر بھی اختیار کی جائیں اور اس کا نتیجہ اکثر اچھا نکلتا تھا۔

جہاں تک مخصوص حدود کے اندر معدلت گستری کا تعلق ہے، اس کی اہم خصوصیات بیان ہو چکیں۔ ان امور کے پیش نظر نہ ٹیری (Terry) کے اس مضحکہ خیز بیان کو صحیح سمجھا جا سکتا ہے کہ (مغلیہ دور حکومت میں) کوئی تحریری قانون نہ تھا، نہ برنیر کے اس غیر ذمہ دارانہ بیان کی تائید کی جا سکتی ہے کہ لاکھوں نفوس پر گورنر کی ہیبت یا بادشاہ کی مرضی حکومت کرتی ہے۔[1] قاضی، مجسٹریٹ یا بادشاہ، کوئی بھی دائرہ قانون سے باہر قدم نہ رکھ سکتا تھا۔ بادشاہ کی مرضی صرف سزا دھی کے طریقے میں دخل پا سکتی تھی۔ تحریری دعوے دائر کیے جاتے تھے، تحریری دستاویزات داخل کی جاتی تھیں۔ گواہ پیش ہوتے تھے اور ان پر جرح کی جاتی تھی۔ قتل کے ایک مقدمے میں، جو مظفر خاں جہاں کے خطوط میں مذکور ہے، ملزم نے اپنی صفائی میں اسّی گواہ پیش کیے تھے۔ شہادت ہمیشہ اسلامی قانون شہادت کے بموجب لی جاتی تھی۔ وہ قلمبند کی جاتی اور اہم مقدمات میں مفتی کے پاس بغرض فتویٰ بھیج دی جاتی تھی۔ بادشاہ کبھی مفتی کے بغیر عدالت نہیں کرتا تھا۔ مقدمات کے فیصلے مسلم فقہا کی ہدایات کے بموجب قلم بند ہوتے تھے۔ تاہم یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انھیں اسی نمونے پر بالتفصیل قلمبند کیا

---

۱ - برنیر - صفحہ ۲۳۶ -

جاتا تھا، جیسا کہ آج کل عدالت مرافعہ کی رہنمائی کے لیے کیا جاتا ہے۔

اس نظام کی سب سے بڑی خامی قاضیوں کی بد اعمالی تھی۔ یہ خامی شروع سے آخر تک نظر آتی ہے اور اسی کو یوروپین سیاحوں نے بھی خوب اچھالا ہے۔ مسلمانوں کے مذکورہ طبقۂ علما کی اصلاح کے لیے اکبر نے جو تدابیر اختیار کیں اُن سے متوقع کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ جب فریضۂ معدلت گستری انھیں لوگوں کے سپرد رہا اور اکبر جیسا حکمران بھی انھیں ان کے اختیارات سے محروم نہ کر سکا تو حکومت کے دیگر اعلیٰ عہدوں کی مناسبت سے ان کا درجہ بھی بلند ہونا ضروری تھا۔ لیکن اس کے بر عکس اکبر نے نہ صرف ان کا درجہ گھٹا دیا، بلکہ ان کا وقار بھی کم کر دیا۔

اس کے قریبی جانشینوں کے دور میں بھی ان کی حیثیت بجنسہ قائم رہی۔ زیادہ تر انھیں ملازمت کی شرط پر اراضی مدد معاش دی جاتی تھی، اور ان کے زمرے کے ممتاز افراد کو جب کوئی درجہ دیا گیا ہمیشہ معمولی دیا گیا۔ حتیٰ کہ شاہ جہاں کے دور میں قاضی اسلم جیسے ممتاز شخص کے پاس بھی کابل میں سیورغال اراضی اتنی ہی تھی جس سے صرف دس ہزار روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی اور قاضی خوش حال، جو دارالحکومت (شاہ جہاں آباد) میں عہدہ قضا پر مامور تھا، محض ۵۰۰ ذات کا منصب رکھتا تھا۔ [۱]

۱- صالح، مخطوطہ، ورق ۴۴۵-

اکبر کا حکم تھا کہ صوبوں میں گورنر (ناظم) تمام قاضیوں پر نظر رکھیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بھی ان کی حیثیت بلند نہ تھی، کیونکہ اورنگ زیب نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہر چہار شنبہ کو گورنر کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ (روز چہار شنبہ نزد ناظم صوبہ حاضر شوند)۔[۱]

لیکن قاضیوں کی بداعمالی سے متعلق پلسائرٹ[۲] اور برنیر[۳] کے بیانات بہت مبالغہ آمیز ہیں۔ تینوں بادشاہ جتنے محتاط رہتے تھے اور عدل گستری میں جتنی سختی کے ساتھ وہ قانون کی پابندی کرتے تھے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تقررات کے سلسلے میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیتے ہوں گے اور ان تینوں بادشاہوں کے دور حکومت میں بعض ایسے اشخاص کے نام ملتے ہیں جن کا احترام بادشاہ اور رعایا دونوں کی نظر میں یکساں تھا۔[۴]

علاوہ بریں، مقدمہ بازی کی زیادہ گنجائش نہ ہونا، بادشاہ کے حضور براہ راست مقدمہ پیش کر سکنے کی سہولت، نیز دیوان و بخشی کو ناظم اور قاضی کے ساتھ وابستہ کر دینے کا طریقہ، یہ تمام امور ایسے تھے جن کے باعث بداعمال قاضیوں کو ناجائز کارروائیوں کے لیے یقیناً بہت ہی محدود

---

۱ - مرأت - مخطوطہ، ورق ۱۰۱ ب

۲ - صفحہ ۵۷

۳ - صفحہ ۲۳۶

۴ - اکبر کے عہد حکومت میں لاہور کے قاضیوں کے حالات کے لیے ہفت اقلیم بھی دیکھیے۔

میدان ملتا ہو گا۔ جو اشخاص قاضیوں کو رشوت دینے کے ذرایع رکھتے تھے وہ دور دراز صوبوں سے آ کر اپنے معاملات بادشاہ کے حضور بھی پیش کرا سکتے تھے۔ غریبوں کا جہاں تک تعلق ہے ان کی بابت برنیر کہتا ہے: ''ایشیا میں اگر کبھی کسی کے ساتھ عدالتوں کے ذریعے انصاف کیا جاتا ہے تو غریبوں کے ساتھ۔ یعنی ان اشخاص کے ساتھ جو یکساں طور پر غریب ہونے کے باعث ججوں کو رشوت دینے اور لوگوں سے جھوٹی شہادت دلوانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے''۔[۱]

رشوت ستانی کی جتنی گنجائش باقی رہ گئی تھی اس کا واحد سبب یہی تھا کہ قاضیوں کو میر عدل کی بہ نسبت کم درجے اور ادنیٰ حیثیت میں رکھا جاتا تھا۔[۲]

مذکورہ نظام عدل و معدلت گستری کی مخصوص خوبیاں یہ تھیں کہ تینوں حکمرانوں نے سب کو قانون کی نظر میں برابر رکھنے کی کوشش کی، نیز یہ کہ انھوں نے قانون کی سخت پابندی کی اور انتہائی غیر جانبداری کے ساتھ انصاف کیا۔ یہی نہیں کہ سب کے لیے ایک ہی قانون تھا، بلکہ جہاں تک تاریخوں میں مذکور مقدمات سے پتا چلتا ہے اعلیٰ و ادنیٰ سب کو ایک ہی سی سزائیں بھی دی گئیں۔ عدالتوں کی تعداد قلیل تھی، طریقہ کار بے حد آسان تھا اور مقدمات کا فیصلہ آناً فاناً کر دیا جاتا تھا۔[۳] نہ ایسے وکلاء ہوتے تھے

---

۱ - صفحہ ۲۳۷ -
۲ - ملحوظ رہے کہ سلاطین دہلی کے دور میں میر عدل اور ''داد بک'' کی حیثیت بہت بلند اور ممتاز ہوتی تھی -
۳ - ٹیری، صفحہ ۲۳۶ -

جن کا ذریعۂ معاش ھی مقدمہ بازی ھو نہ کسی بہت اعلیٰ پیمانے کے سرکاری محکمۂ عدالت کو قائم رکھنے کے لیے بھاری بھاری عدالتی فیسیں لی جاتی تھیں۔[1] یہ نظام اچھا تھا یا برا یہ ایک نزاعی مسئلہ ھے جس کا فیصلہ جدید ماھرین بھی قطعیت سے نہیں کر سکتے لیکن یہ یقینی ھے کہ جس عہد میں وہ نظام قائم تھا اور جس معاشرے کے لیے اسے جاری کیا گیا تھا، اس کے لیے وہ مناسب تھا۔ اس کی خامیاں عہدمذکور میں شروع سے آخر تک موجود رھیں لیکن اُن سے جو نقصان پہنچا وہ اس سے بہت ھی کم تھا جتنا سمجھا جاتا ھے۔

۱- برنیر- صفحہ ۲۳۶- ''تاھم، بعض لوگ یہ کہیں گے کہ مطلق العنان حکومتوں کے بھی چند مخصوص فوائد یقیناً ھوتے ھیں۔ ایسی حکومتوں کے دور میں وکلاء نسبۃً بہت کم ھوتے ھیں، مقدموں کی تعداد کم ھوتی ھے اور وہ بھی بہت جلد طے کر دیے جاتے ھیں''- برنیر کی رائے میں اس کا سبب یہ تھا کہ لوگوں کو ذاتی جائداد رکھنے کا حق نہ تھا اور اس نظام کو وہ اس لیے مذموم قرار دیتا ھے تاکہ سترھویں صدی کے فرانسیسی نظام کو حق بجانب ثابت کر سکے۔ ''بے شک اس طرح مقدمات کو آناً فاناً طے ھوتا دیکھ کر ھمارے سیاح حیرت زدہ رہ جاتے تھے اور وہ یہ کہتے ھوئے فرانس واپس جاتے تھے۔ واہ وا معدلت گستری کا کتنا معقول انتظام ھے اور کتنی جلدی مقدمات کا فیصلہ کر دیا جاتا ھے! دیانت دار قاضیوں کے کیا کہنے! فرانسیسی مجسٹریٹوں کو ان کی تقلید کرنی چاھیے!!.... لیکن انھیں اس بات کی خبر نہیں ھوتی کہ اگرحقیقی مجرمین قاضی یااس کے دفتری اھلکاروں کے ھاتھ میں دو ایک اشرفیاں رکھ دیتے اور دو ایک اشرفیاں خرچ کرکے دو جھوٹے گواہ خرید لینے کی استطاعت رکھتے ھوں تو مقدمہ کسی رد و قدح کے بغیر یقینی طور پر انھیں کے حق میں طے ھو جاتا ھے یا اس کی میعاد ان کی مرضی کے مطابق بڑھا دی جاتی ھے'' (اس سے برنیر کی تنقید کا انداز ظاھرھوتا ھے اور بددیانتی کے امکان کا بھی پتا چلتا ھے اور اندازہ ھوجاتا ھے کہ اس کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ھو سکتی تھی)۔

باب یازدہم

خلاصہ اور نتائج

خاکہ

اکبر نے اپنے اصول حکومت کی بنیاد گزشتہ تجربات پر قائم کی۔۔۔۔۔فتوحات اور استحکام۔

وزارت اور طبقۂ امراء کے مشکل مسئلے کا حل۔۔۔جہانگیر اور شاہ جہاں نے بھی اسی کی حکمت عملی اختیار کی۔۔۔۔اس طریق عمل کے بڑے بڑے نقائص۔

بادشاہ اور رعایا کے درمیان براہ راست رابطہ اور اس کے اثرات۔ اس نظام کے قابل ذکر نقائص۔

اکبر نے اپنے اصول حکومت کی بنیاد گزشتہ تجربات پر قائم کی

دیباچے میں شمالی ہند کی جغرافیائی خصوصیات بتائی جا چکی ہیں۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ خصوصیات وہاں کے باشندوں اور طرز حکومت پر کس طرح اثر انداز ہوئیں اور کس طرح ملک کے مخصوص حالات نے حکومت کی سرگرمیوں کا تعین کیا۔

ابتدائی دور کے سلاطین دھلی نے اس امر کا بخوبی اندازہ کرلیا تھا کہ انھیں کن حالات میں حکومت کرنا ہے اور سلطنت دھلی کے طویل دور میں، شروع سے آخر تک، تمام حکمران خاندان تحفظ و رواداری کے انھیں اصولوں پر کاربند رہے جن کی ابتدا بانیان سلطنت مذکور کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں انھیں اسی طرح کبھی کم کبھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی جس طرح ان کے پیش رو ہندو حکمرانوں کو اپنے اپنے دور میں حاصل ہو چکی تھی۔ قانون اسلامی کا سوال بھی بہت ٹیڑھا تھا۔ اگرچہ بلبن اور جلال الدین خلجی جیسے سلاطین ملک میں شریعت اسلامی کی پوری پابندی کے ساتھ حکومت نہ کر سکے مگر اس ناکامی کے باوجود اور اس حقیقت کے باوصف کہ انہوں نے تبلیغ اسلام کی نہ خود کبھی کوشش کی نہ کسی اور کی اس بارے میں ھمت افزائی کی، سلطنت میں اسلامی رنگ بہر حال غالب رہا۔ ملک میں یہی صورت حال موجود تھی حتیٰ کہ اکبر نے اسے فتح کر کے از سر نو منظم کیا۔

فتوحات

ملک کے بعض حصوں کا فتح کرنا اس کے لیے ضروری تھا کیونکہ اپنے پیش رو حکمرانوں

کی طرح اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ تمام شمالی ہند کو ایک ھی بادشاہ کے تحت رکھنا لازم ھے کیونکہ اس کے بغیر نہ تو وہ رعایا کی حفاظت موثر طور پر کر سکتا تھا نہ ان کے لیے پر امن زندگی کی ضمانت کر سکتا تھا۔ اس کے پیش نظر بھی ''چکر ورتی'' بننے کا وھی نصب العین تھا جسے چندر گپت موریا اور اس کے بعد تمام ھندو حکمرانوں نے ھمیشہ اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ یہ ایک ایسی سیاسی ضرورت تھی جسے ملک کے جغرافیائی حالات کے باعث شمالی ہند کے حکمران محسوس کرنے پر مجبور ھو جاتے تھے۔ اس معاملے میں نہ کسی توضیح کی ضرورت ھے نہ کسی ایسے اختلاف کی گنجائش جیسا تاریخ ہند لکھنے والے دو فاضل مؤرخوں کی متضاد تحریروں میں نظر آتا ھے۔ کاؤنٹ فان نوئر (Von Noer) لکھتا ھے ''شہنشاہ نے ملک گیری کی ھوس میں تلوار نہیں اٹھائی تھی''۔[1] لیکن مسز بیورج فان نوئر کی کتاب (انگریزی ترجمہ) کے دیباچے میں لکھتی ھے کہ وہ ''اپنی قلمرو کی سرحدیں وسیع کرنے میں انتہائی جرأت و قوت سے کام لیتا تھا۔ اس کے سامنے بے چارے لارڈ ڈلہوزی کا ذکر کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ھے.... اس کا ایمان تھا کہ تفوق و برتری فی نفسہ قابل قدر چیز ھے اور اسی لیے اسے حاصل کرنا چاھیے۔ اس کے پاس دولت بھی تھی اور فوجیں بھی۔ چنانچہ اس نے ان سے کام لیا اور بلا تامل ایک علاقے کے بعد دوسرا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کرتا چلا گیا''۔ ونسنٹ اسمتھ بھی اس کا ھم خیال ھے۔ لیکن یہ تاریخ ہند کی غلط تعبیر اور واقعات کا صحیح تجزیہ نہ کرنے کا نتیجہ ھے۔ اکبر کی تمام فتوحات کو نہ فان نوئر کے

---

۱ - فان نوئر، جلد دوم، صفحہ ۲۳۱ -

بیان کا سہارا لے کر جائز کہا جا سکتا ہے نہ مسز بیورج کے بیان کی روشنی میں مذموم قرار دیا جا سکتا ہے ۔ شمالی ہند کی تسخیر کو فتح دکن سے علٰحدہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ تسخیر دکن کے جواز میں نہ جغرافیائی مجبوریاں پیش کی جا سکتی ہیں نہ سیاسی مصلحتیں ۔

تنظیم

لیکن محض ملکی فتوحات پر اکتفا نہیں کی جا سکتی ۔ اکبر کی عظمت کا انحصار اس کے فوجی کارناموں ھی پر نہ تھا ۔ ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے : ”قدرت نے اسے تنظیم کی ایسی فطری قابلیت بخشی تھی جو مشرق فرماں رواوں میں تو کیا ، دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی شاذ و نادر ھی نظر آتی ہے ۔ اس کا دماغ نہ صرف یہ صلاحیت رکھتا تھا کہ جارحانہ جنگوں کے ذریعے فتح کی ھوئی ایک وسیع سلطنت کے انضمام و استحکام کے لیے اچھوتے اور جامع اصول وضع کر سکے بلکہ وہ پورے انہماک کے ساتھ جزئیات پر حاوی رہنے کی غیر معمولی اہلیت بھی رکھتا تھا “۔

اکبر نے جب سے ملکی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا ، اسی وقت سے یہ ظاہر ھوتا تھا کہ وہ نہ صرف شمالی ھند کا چپّا چپّا فتح کرنے کا عزم رکھتا ہے بلکہ یہ تہیہ بھی کر چکا ہے کہ مصالحت آمیز طریقوں سے باشندگان ملک کے ھر طبقے کو اپنا طرف دار بنائے رکھے گا ، ان کی حمایت حاصل کریگا اور ان کی قوت کو مٹا دینے کی بجائے ، خود اپنی طاقت کو بڑھانے کے لیے اسے استعمال کرے گا ۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس کا اصول حکومت زیادہ واضع اور کام زیادہ آسان ہوتا گیا ۔ اپنے مفتوح حریفوں، شکست خوردہ دشمنوں، مغلوب باغیوں اور سر کش عہدہ داروں کے ساتھ جیسا سلوک اکبر نے کیا اس سے ایک ہی مقصد اور ایک ہی اصول حکومت واضح ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اکبر سب کے ساتھ صلح اور سب کے لیے امن چاھتا تھا ۔ تقریباً بیس سال کی قلیل مدت میں وہ فتوحات، مراعات اور صلح جوئی کے ذریعے تمام آریہ ورت میں امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا ۔ فتوحات ملکی اور ذی اقتدار مقامی اشخاص کی تالیف قلوب کے بعد تنظیم و استحکام کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ سلطنت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے اور لوگوں کا یہ خیال رفع ہو جائے کہ کسی خاندان کی حکومت چند روز سے زیادہ قائم نہیں رہتی، کیونکہ متعدد حکمران خاندانوں کی حکومتوں کو جلد جلد تبدیل ہوتے دیکھکر ملک میں یہی خیال پیدا ہوگیا تھا ۔

اکبر نے ادنی درجے کے افراد سے تنظیم کی ابتدا کرنے کی بجائے اس کی ابتدا امراء اور وزراء سے کی ۔ اس تنظیم کے ہر شعبے کی خصوصیات اپنی اپنی جگہ بیان ہو چکی ہیں ۔ تمام حکمران خاندانوں کے لیے ہمیشہ یہ مسئلہ خاص طور پر درد سر بنا رہا کہ امراء اور وزراء کے ساتھ بادشاہ کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاھیے ۔ ایک طرف بلبن اور علاءالدین جیسے حکمرانوں نے اور دوسری طرف سلطان فیروز تغلق

و بہلو ل لودھی جیسے سلاطین نے جو کوششیں کیں ان کے باوجود سلطنت دھلی کے دور میں کوئی حکمران خاندان خود کو اپنے وزراء اور امراء کی سرگرمیون سے محفوظ نہ سمجھتا تھا اور وزراء اور امراء کے ھاتھون ھی تبدیلیاں رونما ھوتی رھیں۔ صوبون کے حاکم یا سپہ سالار اپنے آقاؤں کے جانشین بن کر نئے نئے حکمران خاندانون کے بانی بھی بن جاتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں ھر ملک کی تاریخ بادشاہ اور ذی اقتدار مقامی اشخاص کی باھمی کشمکش سے پر نظر آتی ھے۔ اس طرح کی باھمی کشمکش میں کبھی ایک فریق کو اور کبھی دوسرے فریق کو کامیابی حاصل ھوتی تھی۔ پروفیسر هاب هاؤس اسی موضوع پر یون اظہار خیال کرتا ھے ''شخصی حکومت کا دائرۂ اثر اکثر بہت محدود رھتا ھے ... ایک وسیع علاقے کا فاتح بھی بالآخر اپنے حقیقی اقتدار کے بیش تر حصے سے ھاتھ دھولینے پر مجبور ھو جاتا ھے''۔[1]

وزارت و عمارت کے مشکل مسئلے کا حل

لیکن اکبر نے مسئلے کو جس طرح حل کرکے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی اس سے یہ ثابت ھو جاتا ھے کہ وہ ''تنظیم کی فطری قابلیت اور پورے انہاک کے ساتھ جزئیات پر حاوی رھنے کی غیر معمولی اھلیت رکھتا تھا''۔ اپنی تنظیمی اصلاحات میں اس نے مسلم فقہا کے معینہ اصولوں کو قطعاً نظر انداز کردیا۔ اسی طرح اس

۱۔ هاب هاؤس Morals in Evolution ۔ صفحہ ٥٦

معاملے میں اس نے سلطنت دہلی اور دیگر اسلامی حکومتون کی بھی تقلید نہیں کی - اس نے اس اصول کو بھی بالکل نظر انداز کردیا کہ تمام قلمرو میں صرف ایک مختار کل وزیر رہنا چاہیے - وزیر کے فرائض و اختیارات اس نے ایسے چار وزراء پر تقسیم کر دیے جو اختیارات، منصب اور درجے کے لحاظ سے ایک دوسرے کے تقریباً برابر ہوتے تھے - اس نے اپنے وکیل کو جو حیثیت عطا کی اور اپنے دیوان اعلیٰ کو جو اختیارات سونپے اس سے اس کی جدت طبع کا ثبوت ملتا ہے - میر بخشی اور میر سامان کے درمیان کام کی تقسیم کے سلسلے میں اس نے روک تھام اور توازن کی جو نئی نئی صورتیں پیدا کیں اور نظم و نسق کا وہ طرز جو اس نے قائم کیا اور جس کے باعث اس کے چارون وزراء اور صدر کو ایک دوسرے کے ساتھ براہ راست رابطہ رہتا تھا، قطعاً اس قدرت و اہلیت کا نتیجہ تھا جو اسے جزئیات پر قابو رکھنے کے سلسلے میں حاصل تھی - اس نے جس درجے، طبقے یا فرقے سے مناسب سمجھا اپنے وزراء منتخب کر لیے اور اس طرح حکومت کے ان اصولون کو خیر باد کہہ دینے کی ایک مزید مثال پیش کی جو ہندوؤں اور مسلمانون میں بالعموم رائج تھے -

اس نے طبقۂ امرا کے وقار، اقتدار اور اثر پر ایک کاری ضرب لگائی - کوئی امیر محض اپنے منصب یا تنخواہ کی بناء پر کوئی اعلیٰ عہدہ نہ طلب کر سکتا تھا نہ اسے حاصل کرنے کی توقع رکھ سکتا تھا - منصب ذاتی ہوتا تھا اور

اسے حکومت کے کسی عہدے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح بعض امراء کو وزراء سلطنت سے بھی زیادہ بلند منصب عطا کر دینے کے باعث وزراء اپنے اختیارات کا استعمال من مانے طور پر نہ کر سکتے تھے۔ ایسا شاذ و نادر ھی ھوتا تھا کہ اعلیٰ منصب اور اختیارات دونوں ایک ھی شخص کو سونپ دیے جائیں۔ اکبر کے عہد حکومت میں مرزا عزیز کوکہ کو اور شاہ جہاں کے عہد میں آصف خاں کو اعلیٰ ترین منصب بھی حاصل تھا اور وہ وکیل کے عہدے پر بھی فائز تھے لیکن اس کے باوجود انھیں کوئی خاص اختیارات حاصل نہ تھے۔ اگر کسی کو اختیار، منصب اور اثر صحیح معنیٰ میں حاصل تھا تو وہ شاہ جہاں کا دیوان سعداللہ خان تھا جسے وھی اعلیٰ ترین منصب عطا کیا گیا تھا جس پر آصف خان فائز تھا اور اس حقیقت نے اس کی امتیازی شان کو اور زیادہ نمایاں کر دیا تھا کہ وہ اس مرتبے تک محض اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر پہنچا تھا۔ اس میں نہ کسی کی سفارش یا اعانت کو دخل تھا نہ بادشاہ کے ساتھ اعتمادالدولہ یا آصف خاں کی طرح اس کی کوئی رشتہ داری تھی۔ وزراء امراء کے اجلاس بلا ناغہ طلب کرنا اور تمام اھم امور کے متعلق ان کی رائے دریافت کرنا شاید ھندوؤں کی تقلید تھی اور اگر مانسریٹ کا یہ قول صحیح ھے کہ ارکان مجلس کی تعداد بیس ھوتی تھی تو یقیناً یہی کہا جائے گا کہ سب ھندو روایات کے تتبع میں کیا جاتا تھا۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان تمام پابندیوں کے باوجود جو وزراء پر عائد کردی گئی تھیں ان کے وقار کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا ۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں، تینوں شہنشاہوں کے دور میں وزراء کو اپنے آقاؤں کا پورا پورا اعتماد حاصل رہا۔ ان میں جو وزیر ممتاز ترین ہوتا اس کا احترام بھی اتنا ہی زیادہ کیا جاتا تھا جتنا کسی مملکت میں ایک وزیر کا ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ اکبر کے دور میں مظفر خاں، راجہ ٹوڈرمل، اور میر فتح اللہ شیرازی کا، جہانگیر کے عہد حکومت میں اعتماد الدولہ اور خواجہ ابوالحسن کا اور شاہ جہاں کے دور حکومت میں علامی افضل خاں اور سعداللہ خاں کا ذکر خاص طور پر کیا جا سکتا ہے ۔ چاروں وزیر حقیقۃً سلطنت کے چار ستون ہوتے تھے لیکن سلطنت ترکیہ کی طرح وہ محض علامتی تھے کہ محض خیمے کو برقرار رکھنے کا کام دیں ۔ وہ مغلوں کے تاج محل کے ستونوں کی طرح تھے جو عمارت کو سہارا نہیں دیتے بلکہ اس کی عظمت، شان اور خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتے ہیں ۔

اس طریق کار کا تسلسل

اکبر نے جو نظام قائم کیا اور جس جذبے کے ساتھ اس پر عملدرآمد کیا گیا اسے اس کے قریبی جانشینوں نے بڑی احتیاط سے برقرار رکھا ۔ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں تو اس کے ہر شعبے میں ایک نئی روح پھونک دی گئی ۔ کسی نظام کی خوبی کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے کہ جس مقصد کے

لیے وہ قائم کیا گیا ہے اس میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی ۔ اس معیار پر جانچنے کے بعد اکبر کے نظام سلطنت کی معقولیت اور اس پر کامیاب عملدرآمد کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ۹۷ سال (۱۵۶۰—۱۶۵۷) کے دوران میں : (۱) صرف ایک وزیر، شاہ منصور، پر اکبر کے عہد حکومت میں بغاوت کا الزام لگایا گیا اور بادشاہ نے اس کا مقابلہ کسی میدان جنگ میں نہیں کیا بلکہ اس پر باقاعدہ عدالت میں مقدمہ چلایا گیا جس نے اس کے لیے سزائے موت تجویز کی۔ اسے خاموشی کے ساتھ سزائے موت دے دی گئی ۔ الزام ایک راز سر بستہ ہی رہا اور بادشا کو اپنے وزیر کے اس انجام پر بے انتہا صدمہ ہوا ۔ (۲) حکام، طبقے، مذہب یا مشرب کے لحاظ کے بغیر محض اپنی ذاتی اہلیت اور وفاداری کی بناء پر کسی اثر یا سفارش کے بغیر، دفتری اہلکاری کے ادنیٰ ترین درجے سے ترقی کرکے وزارت کے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچ گئے ۔ اکبر کے عہد حکومت میں مظفر، شاہ منصور، رائے پتر داس اور آصف خاں قزوینی ابتداً بہت چھوٹے چھوٹے عہدوں پر مقرر ہوئے تھے ۔ خود اعتمادالدولہ نے ایک مشرف کی حیثیت سے ملازمت کی ابتدا کی تھی لیکن وہ اپنی بیٹی مہرالنساء کے نورجہاں بننے سے پانچ سال قبل ہی جہانگیر کا ایک وزیر بن چکا تھا ۔ شاہ جہاں کے دور حکومت میں سعداللہ خاں اور رائے رایاں دونوں ہی، دفتری اہلکاروں کی حیثیت سے ملازمت میں داخل ہوئے تھے ۔ (۳) وزراء میں

صرف تین اشخاص بداعمالی کے مرتکب ہوئے جن میں دو کا تعلق اکبر کے عہد حکومت سے ہے خواجہ جہاں اور رائے پتر داس ۔ اول الذکر کو صرف بدایونی مودر الزام قرار دیتا ہے اور عہدے سے اس کی برطرفی کا سبب بھی وہی بتاتا ہے جو مظفر خاں کی برطرفی کا تھا کیونکہ اس وقت دونوں مشترکہ طور پر فرائض منصبی انجام دے رہے تھے - آخرالذکر کا حال باب پنجم میں مذکور ہو چکا ہے ۔ تیسرا واقعہ سب سے زیادہ حیرت انگیز اعتمادالدولہ کا ہے جو جہانگیر کے عہد حکومت میں پیش آیا ۔ معتمد خاں اس پر رشوت خوری کا الزام لگاتا ہے اور بحیثیت مجموعی مورخ مذکور کے مرتبے اور کردار کے پیش نظر اس الزام کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ۔ عہد مذکور کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے مستند ترین اور کارآمد ہے ۔ انتہائی بے باک اور صاف گو ہونے کے باوجود وہ اپنے معاصرین و رفقاء کار کی بابت اپنی رائے کے اظہار میں انتہائی احتیاط سے کام لیتا ہے ۔ چنانچہ دیوان مذکور کی اہلیت، اس کے علم و فضل، حسن تدبیر اور شائستہ اطواری کے متعلق وہ بہت اعلیٰ رائے رکھتا اور اس کی ہر دلعزیزی کی بابت جہانگیر کے بیانات کی تصدیق کرتا ہے ۔ لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ رشوت خواری میں وہ بہت دلیر و بے باک تھا ۔ (بغایت نیک ذات و کارگزار بود ....لیکن در رشوت گرفتن سخت دلیر و بے باک بود) ۔ [1]

---

۱ - معتمد ۔ صفحہ ۵۵

شاہ جہاں کے صدر اعلیٰ، موسوی خاں پر بے ضابطگی کا الزام تھا نہ کہ رشوت خواری کا ۔

نظام مذکور کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ میعاد وزارت کے دوران میں وزرائے سلطنت نہایت مامون و مصون رہتے تھے ۔ ان سے نہایت اچھا سلوک کیا جاتا تھا اور وہ ان خطرات سے بھی محفوظ تھے جو مطلق العنان بادشاہوں کے دور حکومت میں عموماً بادشاہ کی متلون مزاجی یا دربار کی سازشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی وزیر نے اس قسم کے حالات کی بناء پر اپنی جان یا عہدے سے ہاتھ دھویا ہو ۔ نہ یہ ہوا کہ اپنے عہدے پر برقرار رہنے کا یقین نہ ہونے کی بناء پر کسی نے اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں کوتاہی کی ہو ۔ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ نورجہاں بھی جہانگیر کے کسی وزیر کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی حالانکہ تمام وزراء اس کے منصوبوں کے خلاف تھے اور وقت آنے پر سب نے ہر طرح شاہ جہان کی مدد کی ۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ پورا نظام متحرک تھا اور اس کا ہر حصہ باقاعدہ کام کرتا تھا ۔ ہر محکمہ میں معمولی اہلکار سے لے کر وزیر تک یہ جانتا تھا کہ اس کے فرائض کیا ہیں، اس کی حیثیت کیا ہے اور اسے ہر روز کیا کام کرنا ہے ۔ ایک اہلکار وزیر سے اور وزیر بادشاہ سے یہ کہہ سکتا تھا کہ فلاں معاملے کے متعلق ضابطہ یہ کہتا ہے ۔ ہر شخص کی زبان پر یہی فقرہ رہتا تھا کہ ''ضابطہ نیست'' ۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ایک مہتمم دفتر رائے سوبھا چند

نے دیوان اعلیٰ کو اپنے دائرہ اختیار سے باہر کارروائی کرنے سے روک دیا تھا اور سعداللہ خاں نے سب سے زیادہ ذی اثر شاہزادے داراشکوہ کے مقدمے کے سلسلے میں بادشاہ کے حضور صاف صاف ''ضابطہ نیست،، کہا تھا۔ اکبر نے روایت قائم کی اور اس کے قریبی جانشینوں نے نہ صرف اس کا احترام کیا بلکہ اس کے معین کردہ قواعد و ضوابط کو قانون کا تقدس عطا کیا۔ بادشاہ کو اپنی مرضی کے مطابق کارروائی کرنے کا حق یقیناً حاصل تھا لیکن جب تک وزراء معینہ ضوابط کی پابندی کرتے ان کا عہدہ وزارت پر برقرار رہنا بھی یقینی تھا۔ عملاً بادشاہ اپنے وضع کردہ قواعد و ضوابط کا احترام خود بھی کرتے تھے اور اس وزیر کی بھی قدر کرتے تھے جو آن قواعد و ضوابط کی پابندی کر کے فرض شناسی کا ثبوت دیتا تھا۔

اس انتظام کے خاص خاص نقائص

اس نظام کی چوتھی خصوصیت، تنظیم وزارت سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ وزیراعظم کو زیادہ اختیارات حاصل نہ تھے۔ جن حالات میں اکبر نے اپنا کام شروع کیا تھا وہ ضرور اس امر کے مقتضی تھے کہ کوئی اصولی تبدیلی کی جائے اور جس قسم کے اشخاص سے اسے سابقہ پڑا تھا ان کے ہوتے ہوئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اصل اختیار تو اپنے ہاتھ میں رکھے اور ملک کا نظم و نسق مساوی حیثیت کے متعدد ایسے وزراء کو سونپ دے جن سے خود اس کا قریبی رابطہ قائم رہے تاکہ نظم و نسق کی کل

بگڑنے نہ پائے، لیکن جب صورت حال بہتر ہو گئی اور مستحکم روایات قائم ہو گئیں تو وزیر اعظم کو ویسا حقیقی اختیار، جیسا کہ ہر طرز کی حکومت میں بالعموم حاصل رہتا ہے حاصل نہ ہونے کی خرابی غالباً خود وزراء نے محسوس کی۔ شاہ جہاں کے دیوانان اعلیٰ نے تو بالواسطہ اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ علامی افضل خاں نے کہا تھا کہ وزیراعظم کو اپنے ماتحت حکام کے عزل وتقرر کا اختیار ہونا چاہیے۔ نیز اسے یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ بڑے سے بڑے امراء مملکت کو مرعوب رکھنے کے لیے اپنی ملازمت میں زیادہ سے زیادہ فوجی سپاہی رکھ سکے۔ بہ الفاظ دیگر وہ مملکت میں سب سے زیادہ طاقتور عہدہ دار بن کر رہنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ایک ایسا درجہ تھا جس کی گنجائش مغلیہ نظام سلطنت میں قطعی نہ تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے دیوان اعلیٰ، اسلام خاں نے بھی، جس کا شریک کار رائے دیانت رائے مقرر ہوا تھا، یہی محسوس کیا کہ اس کی حیثیت غیر مستحکم ہے۔ چنانچہ اس نے دل لگا کر اسی وقت کام کیا جب رائے کا تبادلہ دوسرے محکمے میں ہو گیا۔ اسلام خاں کہا کرتا تھا کہ تمام دنیا کا انتظام ایک ہوشیار شخص تن تنہا کر سکتا ہے۔ وزیر اعظم کا ضروری اختیارات سے محروم ہونا اور اس قاعدے کی سخت پابندی، یہی وہ خرابیاں تھیں جنھوں نے اس نظام کو، اس وقت ناقابل عمل بنا دیا جب بادشاہ اس کی اصل قوت نافذہ کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ یہی وہ خاص سبب تھا جس کے باعث شاہ جہاں کے دور حکومت

میں سعداللہ خاں کے انتقال کے بعد پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ بادشاہ کی صحت روز بروز بگڑ رہی تھی۔ وہ علالت کے باعث حکومت کرنے کے قابل نہ رہا تھا اور مملکت میں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو اس نظام کو نافذ رکھ سکے درآں حالیکہ یوں ہر چیز ہر طرح درست حالت میں تھی۔ قوت کا یہی فقدان تھا جس کے باعث فوراً ہی شاہ جہاں کے بیٹے آپس میں دست و گریباں ہو گئے اور اس کی حکومت کا خاتمہ نہایت الم ناک حالات میں ہوا۔

بادشاہ اور رعایا کے درمیان براہ راست رابطہ

مرکزی نظام کا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ مملکت میں بادشاہ کی حیثیت اپنی نظر میں کیا تھی اور رعایا کے بارے میں اپنے فرائض کا تصور اس کی نظر میں کیا تھا۔ دونوں امور کے اہم پہلو باب اول میں واضع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح ان فرمانرواؤں نے اپنے منشاء کی تکمیل کے لیے جو تدابیر اختیار کیں ان کا ذکر باب دوم میں ہو چکا ہے۔ بموجب قانون بادشاہ خدا کا خلیفہ ہوتا تھا لٰہذا احکام الٰہی کے مطابق حکومت کرنا اس کا فرض تھا۔ بموجب آئین وہ ایک مطلق العنان فرماں روا تھا۔ نظری اعتبار سے اس کا ہر حکم قانون کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی مرضی کے سامنے اس کی کل رعایا کو نہایت خوشی سے سر تسلیم خم کرنا ہوتا تھا۔ لیکن پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں نے کس حد تک عملاً خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے حکومت کی اور کس حد تک انھوں نے مسلم فرماں رواؤں کی

حیثیت سے احکام شریعت کا نفاذ کیا۔

اکبر نے اس قطعی ارادے کے ساتھ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی کہ وہ بالکل غیر مذہبی انداز کی حکومت قائم کرے گا۔ (اول) مسلم اور غیر مسلم رعایا میں کوئی امتیاز نہ رہے گا۔ (دوم) بادشاہ اور رعایا کے درمیان براہ راست روابط قائم کیے جائیں گے۔ چنانچہ اس نے مسلم حکومت کے قیام کا خیال قطعاً ترک کر دیا۔ وہ چاھتا تھا کہ اس کے کسی ادارے سے اس کی مملکت پر اسلامی ہونے کا گمان نہ گزرے وہ اس بات کو بھی پسند نہ کرتا تھا کہ کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ بادشاہ یا اس کی مملکت میں کوئی گروہ اسلامی مملکت قائم کرنا چاھتا ھے۔ اس کے عہد حکومت کی تاریخ اس قسم کی جد و جہد کی مثالوں سے بھری پڑی ھے۔

اس کے عہد میں وفاداری اور قابلیت کی بنا پر ھر شخص ترقی پا سکتا اور امتیاز حاصل کر سکتا تھا۔ لائبیر (Lybyer) سلطنت ترکی کا مقابلہ ھندوستان کی سلطنت مغلیہ سے کرتے ہوئے لکھتا ھے: ''یہاں بھی قسطنطنیہ کی طرح ھر تقرر یا ترقی کا دارومدار شجاعت اور کارھائے نمایاں پر تھا۔ زمانۂ عروج میں، شروع سے آخر تک ترقی کا راستہ اس قدر صاف رھا کہ ھر شخص اپنی محنت، ھمت اور شجاعت کی بدولت ادنیٰ ترین درجے سے ترقی کرکے بلا مزاحمت تخت حکومت کے زینے تک پہنچ سکتا تھا''۔[1] قانون سب کے لیے

۱۔ لائبیر (Lybyer) سلطنت عثمانیہ کا نظام حکومت (Government of the Ottoman Empire)

ایک تھا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ، اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ اور اس معاملے میں مغلیہ شہنشاہوں نے یقیناً نہ صرف آریاورت کی ہندو روایات سے بہتر روایات قائم کیں بلکہ اپنے دور کی عام ذہنیت سے بلند و برتر ذہنیت کا ثبوت بھی دیا ۔

باشندگان ملک کے ہر طبقے سے زیادہ قریبی رابطہ قائم کرنے کے لیے طرح طرح سے کوشش کی گئی ——— مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دل مسخر ہو جائیں اور سلطنت کو استحکام نصیب ہو —— تالیف قلوب کے اصول نے جو فتوحات کے بعد اختیار کیا گیا ، بڑے اہم مقامی ہندو سرداروں کے دل جیت لیے ۔ اس رواداری کی بدولت ، سرداران مذکور نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ تعاون کیا جسے دیکھ کر دیگر طبقوں کے افراد نے بھی آسانی کے ساتھ اطاعت قبول کرلی ۔

اکبر نے ملک کو چھوٹی چھوٹی فوجی جاگیروں میں تقسیم نہ کیا بلکہ اسے بڑے بڑے صوبوں میں منقسم کر کے منظم کیا اور اس طرح تمام ملک میں دارالحکومت کے زیر اثر یکساں ادارے قائم ہوگئے اور ان میں یکساں طریق کار رواج پاگیا ۔ ان انتظامات ہی کے باعث داخلی تحفظ کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور طاقتوروں کے مظالم سے کمزوروں کو نجات مل گئی ۔ ابوالفضل کے اس اصول کو کہ امن پسندوں کے لیے ”حاکم عادل کا دل ایک حصار آہنی و سلاح آسانی“ کا حکم رکھتا ہے اور شرپسندوں کے حق میں وہی ”ایک تیغ جانستاں اور خنجر براں“ بن جاتا ہے ، اکبر اور اس کے دونوں جانشینوں نے قولاً و فعلاً بڑی اہمیت دی ۔ یہی تھا وہ تحفظ حقوق اور یہی تھی

وہ رواداری اور یہی تھا وہ کامل امن اور بے رو و رعایت انصاف ، جس کا اظہار فیضی نے ان اشعار میں کیا ہے :

خداوندے کہ مارا خسروی داد
دل دانا و بازوئے قوی داد
بعدل و داد مارا رهنموں کرد
بجز عدل از خیال ما بروں کرد

بادشاہ جس انہماک کے ساتھ اپنے مختلف النوع فرائض ادا کرتا اور جس توجہ سے امور مملکت کے ہر پہلو پر نظر رکھتا تھا اس سے اس امر کی ضمانت مل گئی تھی کہ معینہ نظام کامیابی کے ساتھ برقرار رہے گا ۔ نیز ہر درجے اور ہر محکمے کے عہدہ داروں پر جس توجہ کے ساتھ بادشاہ کی نگرانی رہتی تھی ، اس سے حکومت کے آن نظریوں اور اصولوں میں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہونے کا یقین پیدا ہوگیا جو زیر تبصرہ دور میں متعین ہوئے اور جن پر شروع سے آخر تک پوری پابندی کے ساتھ عملدرآمد ہوتا رہا ۔ دربار عام روزانہ منعقد کیا جاتا اور اس میں ادنیٰ ترین شخص کو بھی حاضری کی اجازت تھی ۔ تمام اقتدار فقط بادشاہ کی ذات میں مرکوز تھا ۔ اسی طرح تقررات اور سرپرستی کی تمام صورتیں اسی کی مرضی پر منحصر رہتی تھیں ۔ بادشاہ قلمرو کے مختلف حصوں کا دورہ کیا کرتا تھا ــــــ تاکہ ملک کے ہر حصے کے باشندوں کو یکساں طور پر بارگاہ شاہی میں رسائی حاصل ہو سکے اور وہ بادشاہ کی ذاتی توجہ سے یکساں طور پر فیض یاب ہو سکیں ــــــ باشندگان ملک کی قدیم روایات سے دلچسپی لی گئی اور وہ زندہ و برقرار رکھی

گئیں۔ لوگوں کے رسم و رواج کا احترام کیا گیا۔ ان کے تیوہار مثلاً دسہرہ، دوالی اور راکھی پونم، مسلمانوں کی عیدوں کی طرح سرکاری طور پر منائے جاتے تھے اور یہ وہ تمام ذرایع معینہ مقصد کے حصول کے لیے استعمال ہوتے رہے۔

ان بادشاہوں کو اس طریق کار کا صلہ بھی اچھا ملا۔ ملک میں جہاں امن و خوش حالی کا دور دورہ رہا وہیں حکمران خاندان کو بھی وہ سلامتی نصیب ہوئی جو صدیوں سے کسی دوسرے خاندان کو ہندوستان میں نصیب نہ ہوئی تھی۔ ان امور کی وضاحت ضروری نہیں۔ کیونکہ تاریخ ہند کا ہر طالب علم ان سے واقف ہے۔[1]

اس نظام کے خاص خاص نقائص

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس مملکت نے کیا کیا کارنامے انجام دیے دل میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی سلطنت کو اور اس کے ساتھ ملک کی خوشحالی کو کیوں تیزی کے ساتھ زوال آیا اور وہ کیا اسباب تھے جن کے باعث نظام مذکور اپنی ٹھوس بنیادوں کے باوجود برقرار نہ رہ سکا۔

۱۔ لائبیر، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، لکھتا ہے: "سلطنت مغلیہ کا میزانیہ اس کے زمانۂ عروج میں، آمد و خرچ دونوں کے لحاظ سے جس حد تک پہنچ گیا تھا اس کی مثال اس سے پہلے شاید ہی مل سکے۔ ممکن ہے مشرق رومی سلطنت کا میزانیہ شاہان مقدونیہ کے زمانے میں اور عربوں کی سلطنت کا میزانیہ ہارون الرشید کے عہد میں سلطنت مغلیہ کے میزانیے کی طرح بڑا ہوتا ہو لیکن اغلب یہی ہے کہ صرف مغربی ممالک کی بڑی بڑی حکومتیں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں صنعتی انقلاب کے باعث دولت مندی کی اس حد کو پہنچی ہیں کہ ان کی دولت مندی اورنگ زیب کی سلطنت کی دولت مندی سے سبقت لے جا سکی ہے"۔ (صفحہ ۲۹۵)

اس نظام کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اس میں مرکز کا عمل دخل ضرورت سے کہیں زیادہ تھا اور اس کا سارا دارومدار بادشاہ کی ذات پر تھا۔ اگرچہ انصاف کی بات یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا دستور موجود نہ تھا، جو قائم شدہ اداروں کو برقرار رکھنے کا ضامن ہوتا۔ ایسی حالت میں مذکورۂ بالا صورت حال کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ ملک میں کوئی ایسا گروہ نہ تھا جو ایک طاقتور بادشاہ کی جگہ لے سکتا۔ مغلیہ دور حکومت سے قبل بھی ہندوستان میں کسی گروہ نے کبھی اس بات کا ثبوت نہ دیا تھا کہ وہ اس قسم کی اہمیت رکھتا ہے اور ملک اور عوام پر اثر انداز ہونے والے اہم مسائل سے مخلصانہ دلچسپی لے سکتا ہے۔ عوام کو سرکاری عہدہ داروں اور مقامی حکمرانوں کے مظالم سے محفوظ رکھنے کے لیے بادشاہ کو ہمیشہ ایک سپر کا کام کرنا پڑتا تھا۔ مقامی حکمرانوں کی من مانی کارروائیوں اور ان کے خود غرضانہ منصوبوں اور ان کی باہمی رقابتوں اور خانہ جنگیوں نے، مختلف اوقات میں ملک پر جو مصیبتیں نازل کی تھیں ان کے پیش نظر، اس نوعیت کے مزید تجربات کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ چنانچہ مغلوں کا نظام حکومت قطعاً مختلف بنیادوں پر قائم ہوا اور اس میں زمینداری کے حقوق بالکل ختم ہو گئے۔ لہٰذا نقص اداروں میں نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ حکومت شخصی تھی۔ کسی دوسرے طرز کی حکومت سے ملک واقف نہ تھا۔ خود مغل بھی نہ تو کسی دوسرے طرز کی حکومت سے واقف تھے اور نہ وہ اس امر کی ضمانت دے سکتے تھے کہ ہمیشہ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان جیسے فرماں روا ہی یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آتے رہیں گے۔ جب

ان بادشاهوں کا زمانہ ختم ہوگیا تو ان کے خاندان اور ان کی سلطنت کا انجام بھی قدرتاً وہی ہوا جو دنیا کے باقی حصوں میں دوسرے حکمران خاندانوں اور ان کی سلطنتوں کا ہو چکا ہے۔

دوسرا نقص اصول ملک گیری تھا۔ اس اصول کو بھی اکبر ہی کی ذات سے منسوب کرنا چاہیے، جس کی جدت طبع اور دیگر ایسے اوصاف کی بدولت، جو قدرت کی طرف سے اسے ودیعت ہوئے تھے، سلطنت کو اتنا عروج حاصل ہوا۔ شمالی ہند کے دیگر حکمرانوں کی طرح اکبر کو بھی یہ ترغیب ہوئی کہ وہ ان علاقوں کو فتح کرے جو آریہ ورت کے جنوب میں دور تک واقع ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے اقتدار کی بنیادیں مستحکم ہو چکی ہیں اور سلطنت ہر طرح محفوظ ہے تو وہ سطح مرتفع دکن میں داخل ہوا لیکن اس کی کامل تسخیر کا کام اس کے جانشینوں کے لیے باقی رہ گیا۔ اس کے جانشینوں نے اس کام کو بھی اسی گرمجوشی سے اختیار کیا جس سے انھوں نے اس کے دیگر منصوبوں کو اختیار کیا تھا اور ان میں سے کسی کو یہ خیال تک نہ گزرا کہ اس کام کو جاری رکھنا بیکار ہے جیسا کہ تقریباً دو سو سال قبل فیروز تغلق نے محسوس کیا تھا۔ اگر اکبر نے اپنی تمام کوشش "چکرورتی" بن جانے کے شوق کی تکمیل کے لیے وقف نہ کردی ہوتیں تو اس کی کامیابیاں زیادہ شاندار بھی ہوتیں اور غالباً سلطنت بھی زیادہ عرصے تک قائم رہتی۔

زوال سلطنت کا تیسرا سبب ملک میں قومی جذبے کا فقدان تھا۔ سنسکرت ادب میں جذبۂ قومی اور ضرورت اتحاد کی بے انتہا

تعریف کی گئی ہے اور ہند کے قدیم مذہبی و سیاسی اہل قلم بھی ہمیشہ اس کی اہمیت جتاتے رہے لیکن تاریخ نہیں بتاتی کہ کسی بھی نازک موقع پر ملک میں اس جذبے کا اظہار کیا گیا ہو۔ مسلمان بھی اس سر زمین میں داخل ہونے کے بعد اس کی کوئی مثال پیش نہ کرسکے۔ اسلامی اخوت، اسلامی مملکت اور احکام الٰہی کی پابندی کے متعلق ان کے نظریات و تصورات بلند ضرور تھے لیکن اس کے باوجود وہ غیر مسلموں کی سر زمین میں کبھی آپس میں اتحاد پیدا نہ کر سکے۔ انھوں نے سلطنت دھلی کو کبھی اپنی مشترکہ میراث نہ سمجھا۔ نہ اس کے وقار یا اس کی سالمیت کو کو برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے متحد ہو کر کبھی کوئی کوشش کی۔ راجپوت سرداروں کی طرح مسلمانوں میں باھمی نا اتفاق اور رشک و رقابت کے جذبات ھی رہے، جو سلطنت دھلی کی بنیادیں ھلا دینے اور بالآخر اسے ختم کر دینے میں دوسرے اسباب سے زیادہ موثر ثابت ہوئے۔ خاندان سور، کے زوال کا سبب یہی بھی تھا۔ سلطنت مغلیہ کو بھی ابتدائی دور میں یہی دقت پیش آئی۔ اکبر کو پورا احساس تھا کہ ملک میں جذبۂ قومی کا فقدان ہے۔ لہٰذا اس نے یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے خاندان کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اپنے اس عظیم مقصد میں ناکام رہا۔

اکبر اور اس کے قریبی جانشین جو شاندار کارنامے انجام دے سکے اور ان کے عہد میں ملک کو جو خوشحالی نصیب ہوئی یہ سب محض ان کی عظیم شخصیتوں کا کرشمہ تھا نیز اس امر کا کہ حسن اتفاق سے ان بادشاھوں نے طویل عمریں بھی پائیں۔ اسی وجہ سے وہ امراء و وزراء کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کے تمام تخریبی

عناصر کو قابو میں رکھ سکے - لیکن جوں ھی ان عظیم شخصیتوں کا دور دورہ ختم ھوا عام ھندوؤں اور مسلمانوں ، دونوں میں پھر پہلی خصوصیتیں عود کر آئیں اور تاریخ نے اپنے واقعات ٹھیک اسی طرح دھرائے جیسا کہ دیباچے میں مذکور ھو چکا ھے - زوال سلطنت کے لیے سکھ، راجپوت ، سید ، شیخ ، افغانی ، ایرانی اور تورانی ، جن کی معاشرے کے اعلیٰ طبقے میں اکثریت تھی ، سب کے سب برابر کے ذمہ دار ھیں -

بہر حال شاہ جہاں نے اکبر کے خواب کی تعبیر اپنے دور حکومت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور عجب بات یہ ھے کہ اس کا ثبوت ھمیں اورنگ زیب کے ذریعے ملتا ھے جس نے اس کا ذکر اپنے ایک مکتوب[1] میں کیا ھے - اس سے مملکت کی سرگرمیوں کی حدود کا پتا چلتا ھے اور معلوم ھوتا ھے کہ بادشاھی کا نصب العین کیا تھا اور اس سے رعایا کی کیا کیا توقعات وابستہ تھیں - شاہ جہاں کے دور حکومت کے خاتمے کے قریب سعد اللہ خاں کے عہد وزارت میں ، ایک دن شاہ جہان کا جلوس کہیں سے گزر رھا تھا کہ یکایک کسی نا معلوم شخص کے اس طرح آواز دینے پر بادشاہ رک گیا : ”زندہ باد ! مرحبا ! اے بادشاہ ! خدا کا شکر ادا کر کہ اس نے تجھے عدل و انصاف کی دولت سے نوزا ھے ، وزراء لائق ھیں اور کارپردازان حکومت ایماندار - ملک خوشحال ھے اور رعایا مطمئن !“ یہ سنتے ھی شاہ جہاں نے دعا کے لیے ھاتھ اٹھائے ، اپنا سر خم کیا اور خدا کی جناب میں شکر بجا لایا اور امراء و وزراء اور عوام سب نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا -

---

۱ - م - ت ۶۵۸۸ ، ورق ۵۵ ب

ضمیمه

کمترین بندگان بموجب حکم معلی
از هم زبان دوستکامان آن خان فضایل مرتبت بود
اکثر اوقات در صحبت آن خان قدرشناس از نقطه شام
تا صبح صادق بیک دماغ بسر میرفت که شب بیدار و صبح
خیز بود و با وجود شغل وزارت شغل باطنی داشت و در
عین تعلق دم از بی تعلقی میزد در هنگامی که مجازات جزیلی
آن خان والاشان صورت انجام یافت و اداره برمسند
دولت نشست نگاهی بر ایوان رزنگار نموده ابیی برکشید
از انجا که آسیای انقلاب فلک همیشه در گردش است
و پیر و جوان و دانا و نادان دانه این آسیا است
علامه جوان بخت پیر تدبیر در دار الخلافه شاهجهان
آباد در عین جوانی و کامرانی بعالم جاودانی شتافت
اعلی حضرت خاقانی در ایام عارضه آن وزیر بی نظیر از
غایت مهربانی و قدردانی بمنزل آن وزارت وزیر
شایسته تشریف ارزانی فرموده عنایت و قدردانی
خود را بر جهان و جهانبانان ظاهر و آشکارا گردانیدند

۱- برهمن بحیثیت مصاحب سعدالله

(ملاحظه هو صفحه ۲۹۳) (مسوده برٹش میوزیم - ش ۱۸۹۲)

در باب قضیه آن خان ستوده فطرت ناسنجیده قضا تاثیر به
بنده‌های دولت مرقوم فرموده‌اند نقل فرمان عالی شان که
اعلی حضرت خاقان زمان در باب قضیه علامة العصر
ولد دوران وزیر اعظم سعدالله خان به امرای والا
شان علی مردان خان امیر الامرای بهادر فرمودند
درین ایام خجسته و فرجام که در دار الخلافه حضرت شاهجهان آباد
مستور رایات جاه و جلال بود نسیم بهار شمیم عیش و نشاط
بمشام فیض التئام میرسانید بحسب تقدیر سبحانی گردش
آسمانی زبده ارباب راز نقاوه نقاوه محرمان دمساز
یگانه دانشوران جهان قدوه خردمندان زمان وزیر
بی نظیر با تدبیر دستور حق شناس حقیقت پذیر سرامد
امرای حقیقت آیین سر دفتر وزرای صاحب تمکین
دستور العمل دانایان روزگار علامه دوربین دانش
شعار جامع معقول و منقول حاوی فروع و الاصول مظهر

۲- مراسلۂ شاہ جہاں

بنام علی مردان خاں ۔ سعداللہ کے انتقال پر اس کی خوبیوں کا اعتراف اور تاسف کا اظہار کیا گیا۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۲۹۳) (مسودہ برٹش میوزیم - ش ۱۸۹۲)

کمالات صوری و معنوی کو مستجمع صفات کسبی و وهبی
محک علوم نقاد سخن ادراک حقایق کشاف دقایق
گنج علم دریای معانی دستور اعظم در زیر معظم یار تمام
عیار مرز احمدان سعدالله خان که بعنایتهای گوناگون و مراحم
روز افزون تربیت پدر قدسی در خدمت فیض موهبت مقدس معلی
یافته بمدارج علیا و مراتب اقصی فایز گردیده بود و خود در شاه
راه وفا و اخلاص قدم ساخته استرضای خاطر اقدس را بر جمیع مطالب
مقدم میداشت و حاصل مرادات دو جهانی و سرمایه عمر و زندگانی خود را
منحصر در حصول رضای فیض مآثر اقدس می انگاشت روز سه شنبه
شهر جمادی الثانی سنه ۲۳ از جلوس میمنت مانوس جهان گذران
را گذاشته از تنگنای عالم جسمانی گذشته بعالم روحانی
شتافت از وقوع این واقعه و سنوح این سانحه غبار حزن
و ملال بر آئینه ضمیر آفتاب مثال نشست و طبع نشاط آگین بی
اختیار مکدر متوحش گشت کاش در حیز قابلیت و استعداد
و کمالات از هدای فیاض کسوت:

عمر دراز و از حیات مستعار بهره کامل می یافت تا در عهد
ابد قرین سعادت آئین مصدر خدمات نمایان گردیده
در راه قبله و مرشد خود جانفشانیها می نمود و افسوس که
ترکیب عنصری را ثباتی و بقائی نیست و کاخ دنیای نا
پایدار را اساس و استحکامی چون همواره ارتضا بتقدیرات
ایزدی پیش خاطر ملکوت ناظر است نهمت برای رضا
و تسلیم خرامیده از جناب کبریا آمرزش آن رهرو ملک بقا
مسألت نمودیم و خاطر فیض اثر را السلامتی ذات ملکی
ملکات اقدس که باعث امنیت و جمعیت جهان و
جهانیان و موجب آسایش و رفاهیت عالم و عالمیان
است تسلی بخشیدیم

نقل پروانه حضرت [illegible] چودهریان و قانونگویان و زمینداران و رعایا

پرگنه رحیم آباد سرکار لکهنو مضاف صوبه اوده بدانند چون بموجب حکم ارفع اعلی

خدمت امینی پرگنه مزبور از ابتدای فصل خریف توشقان ئیل سنه بکفایت آثار

عبدالغفار مقرر و مفوض گشته باید که شما اینرا امین مستقل آن محال دانسته

از سخن صلاح و صوابدید حسابی او که متضمن کفایت سرکار والا و رفاهیت حال

رعایا باشد بیرون نروند سبیل مومی الیه آنکه در لوازم خدمت مأموره دقیقه از دقایق

نامرعی نگذاشته از روی راستی و دیانت بتقدیم رساند و در ازدیاد آبادی

و کثرت زراعت و پیشرفت امر جمع سعی کما ینبغی بکار برده بکند که یک جبه زمین قابل

زراعت افتاده نماند و رعایا را از حسن سلوک خود راضی نگاه دارد و نهجی که

مال سرکار والا بسرکار عاید گردد و رعایا بحق خود برسد و بر وقت تشخیص نموده نوشته

کاغذ را موافق ضابطه بدفتر معلی ارسال دارد و خبردار باشد که عامل طلبه بلادستی

برداشت نتواند کرد و همچنین از فوطه دار نیز خبردار باشد که هرچه تحویل نموده او

از مال و سایر شود یکدام بی سند معتبر خرج نکند و تصرف در مال سرکار ننماید

گرد از انجا که محافظت زر تحویل فوطه دار بعهده امین است هرگونه احتیاط که

باید بکار برد که فی الحال جواب آن بذمه اوست درین باب تاکید عظیم

شناسد و از سطر صدر تخلف نورزد

۳- نقل پروانهٔ تقرر

پرگنه رحیم آباد (لکھنو) کے لئے امین کے تقرر اور پرگنۂ متعلقه کے حکام و عوام کی اطلاع کے لئے پروانه جاری کیا گیا۔ (مسوده برٹش میوزیم - تتمه ٦٥٨٥)

فرمان دستک راهداری گذریان و متصدیان و جاگیرداران
و زمین داران و چوکیداران و گذربانان راه کابل بعنایت
خسروانه امیدوار بوده بدانند در اینولا سعادت نصاب خواجه یادگار
یکی از معتقدان درگاه گیتی پناه بولایت میرود در اسباب سوداگری
از سرکار خالصه شریفه و قدری پارچه از خود همراه دارد باید که
بعلت زکوات وغیره مزاحم حال او نگردند و هر جا که نزول نماید
از چوکی و پهره خبردار بوده از مخاطره راه در حدود خود ها سلامت
بگذرانند اصلا و مطلقا تغافل ننمایند اگر احیانا در حد حدود کسی
امری ناشایسته واقع خواهد شد از عهده آن جواب خواهند کرد

۴- دستک راہ داری (پاسپورٹ)

اس میں سرکاری افسروں ، جاگیرداروں اور زمینداروں کو ہدایات دی گئی ہیں کہ حامل ہذا کو اپنے حلقوں میں سے کابل کی طرف گذرجانے کی اجازت دی جائے - (مسودہ برٹش میوزیم - ش ۲۶۱۳۰)

نقل پروانه زمین مدد معاش درینولا بظهور پیوست که سماة زینب وغیره

کثیر العیال و پریشان احوال اند و از عدم وجه کفاف اوقات را بعسرت

میگذرانند لهذا اراضی بیست بیگه زمین بنجر افتاده خارج جمع لایق زراعت

بگز الهی بتصدق فرق مبارک بندگان حضرت قدر قدرت خدیو زمین

و زمان خداوند زمین و مکان ظل سبحان خلیفة الرحمانی من ابتدای فصل خریف

او دئیل سنه فلان حسب الضمن وجه مدد معاش بمشار الیها از پرگنه [illegible]

سرکار صوبه فلان مقرر نموده شد باید که متصدیان پرگنه مذکور اراضی مذکوره را از محال

نیک پیموده و چک بسته بتصرف او واگذارند که مزروع ساخته محصولات

آن را صرف احتیاج خود نموده بدعای بقای دولت ابد اتصال مواظبت و اشتغال

داشته باشد درین باب تاکید دانند

۵- نقل پروانه

اراضی مدد معاش کے عطا کرنے کے لئے -

(مسودہ برٹش میوزیم - تتمہ ۶۵۸۰)

شرح پروانهٔ باغ چون احداث باغ موجب رونق ملک بادشاهی و باعث
استفادهٔ خلایق است لهذا اراضی ده بیگه زمین قابل زراعت بگز الهی
بموجب استدعای فضایل پناه نجابت دستگاه میر حبیب الله تصدق فرق
مبارک من ابتدای فصل خریف توی ئیل سنه فلان از رقبهٔ قصبهٔ رحیم پور
مضاف سرکار و صوبهٔ دار الخلافه شاهجهان آباد مقرر نموده شد باید که متصدیان
پرگنهٔ مذکور اراضی مذکوره از محل نیک پیموده و چک بسته حوالهٔ مشار الیه
نمایند که در آنجا نهال اشجار میوه دار ترتیب نشانده و محصولات از او در معیشت
نهال مذکوره در ترتیب و احداث چاه صرف نماید که مسافرین و مترددین
از سایه و آب آرام یافته بدعای بقای عمر و دولت ابد طراز مواظبت و اشتغال
می نموده باشند بر در چون ترتیب باغ و احداث چاه رونق ملک
بادشاهی و موجب آسایش و آرام مسافرین و مترددین است بنابر آن
تصدق فرق مبارک بندگان حضرت خاقانی اعلی بوازی پنج بیگه زمین
زمین بنجر افتاده خارج جمع لایق زراعت بگز الهی از ابتدای فصل خریف
تخاقوی ئیل سنه فلان فصلی از سواد قصبهٔ پرگنهٔ فیض آباد سرکار و صوبهٔ دار الخلافه
شاهجهان آباد بجهت باغ فضیلت و حقایق آگاه شیخ رحمت الله مقرر نموده شد
باید که متصدیان پرگنهٔ مذکور اراضی مذکوره را پیموده و چک بسته بتصرف
مشار الیه واگذارند

۶- نقل پروانه

باغ لگانے کیلئے اراضی مدد معاش عطا کی گئی اس شرط پر کہ مسافروں کو پناہ اپنے اور کنوؤں کا پانی پینے کی اجازت دی جائے۔ (مسودہ برٹش میوزیم - تتمہ ۶۵۸۵)

شرح محضر چون بموجب آیه کریمه لا تکتموا الشهادة

ومن یکتمها فانه آثم قلبه ادای شهادت باعث سعادت و کتمان گواهی از جمله

مناهی است بنا بر آن سوال میکند و استشهاد حق میخواهد اضعف العباد محمد

جواد از سادات کرام و مشایخ عظام و قصبات اهل اسلام و اهالی و موالی

ذوی الاحترام و جمیع کافه انام از خاص و عام متوطنه قصبه بلگرام بر جمیعی که

بر هر یک تبیان و نشسته است که یکمنزل حویلی معلومه الحدود موروثی این

سایل در قصبه مذکوره متصل حویلی میر فضایل واقعه بکار واقع است هرگاه این کمترین

عباد الله بسبب روزگار از وطن جدا شده حویلی مذکور عاریتا بجهه سکونت حواله

بازید افغان که قبیله خود همراه داشت و بجهه آرام گله عیال و اطفال خود

جا بجا پریشان میگشت بقرار مرقوم عاریت نامه که عند الطلب حویلی را

خالی کرده به جای خود رفته بود درینولا که احقر در وطن رسیده موافق قرارداد

مسطور طلب حویلی مینماید افغان مذکور بزبردستی و تعدی از حویلی بر نمی آید

هرگاه از رجال و صدق این مقال آگاهی و اطلاعی باشد حسبة لله گواهی خود

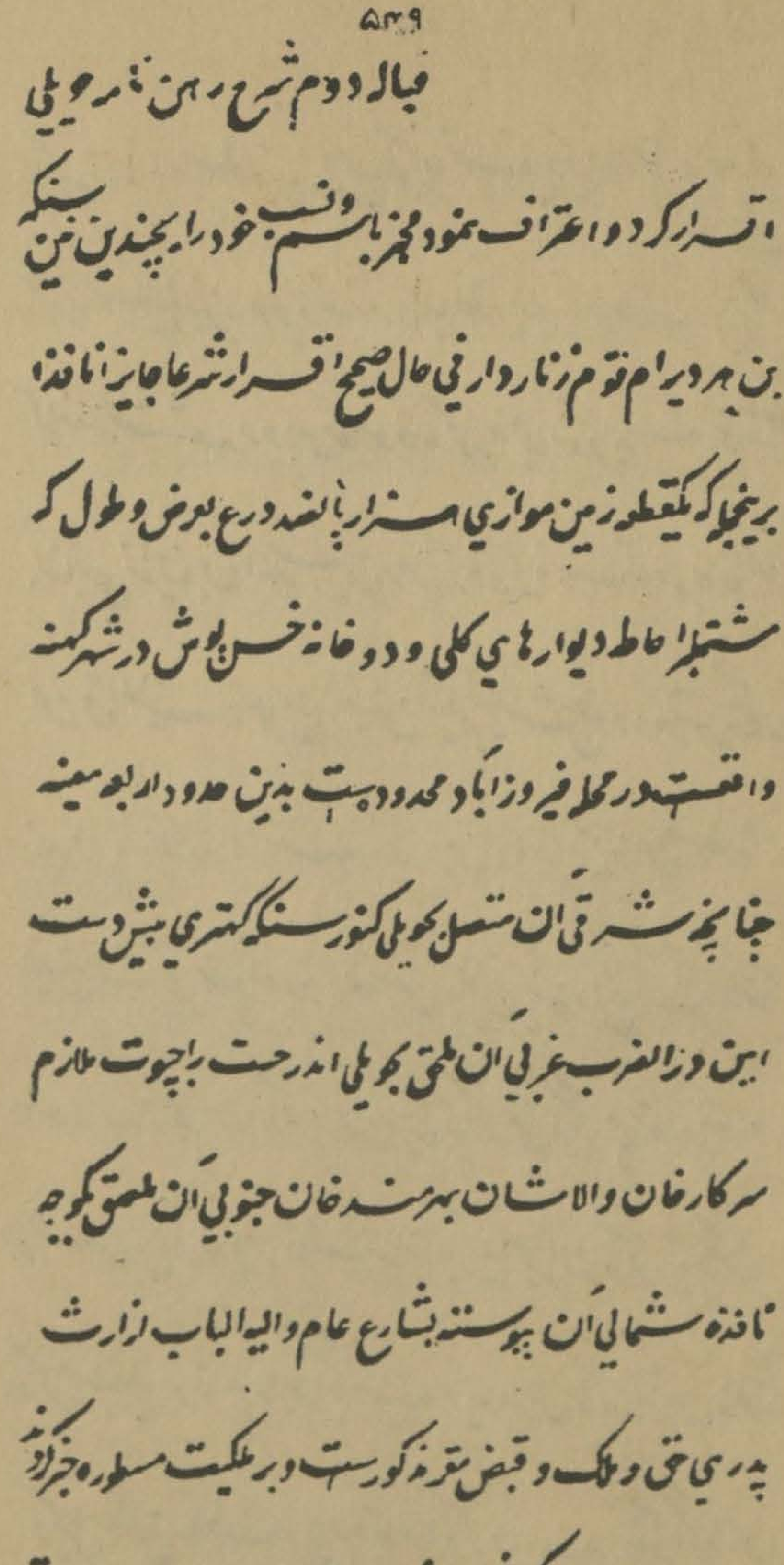
در ذیل این سوال نامه ثبت نمایند نوشتن اجازت فرمایند که عند الله ماجور

عند الناس مشکور گردد

۷- نقل عرضی دعویٰ

اس میں ایک مکان کی ملکیت کا دعویٰ کیا گیا ہے جو مدعا علیہ کے قبضے میں تھا۔

(مسودہ برٹش میوزیم - تتمہ ۶۵۸۵)



۸- رهن نامۂ مکان

ازاودے رام و جے کشن بعوض مبلغ بارہ سو روپے بحق بینی پرشاد وغیرہ۔
اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایسی صورتوں میں قانون اسلام کا اطلاق کس طرح کیا جاتا تھا۔
(مسودہ برٹش میوزیم۔ تتمہ ٦٥٨٥)

مذکور محدوده مسطوره را با جمیع توابع تحصیل و کثیر داخلی و خارجی
بمقابله مبلغ هزار و دو صد روپیه نقد جید تمام وزن رایج الوقت
که نصفش ششصد روپیه موصوفه مذکوره می‌شود بدست بنیارام
بن لجهمی نراین بن اندرسین رهن کرد و گرو نهاد مع خالیاً
عن حق الغیر و عما یمنع القبض و تسلیم تسلیمش نمود و مرتهن مذکور
محدوده مزبوره را از مقر مذکور رهن و باقباض راهن مسطوره
قبض شرعی خود آورد و تقابض بدلین بینهما واقع شده و ضامن
متعهد شده مخبران مذکوران برین که اگر حق دیگری ظاهر شود
و استحقاق آرد یا از خالصه شریفه برآید مخبران مذکوره به مرتهن
مذکور مبلغ مرقوم را جوابگو باشند و نیز راهن مذکور مرتهن مزبور را
وکیل مطلق ساخت و قایم مقام خود گردانید بر اینکه اگر راهن
مذکور مبلغ مذکور را بعد مضی مدت وعدت رهن که شش ماه

مقرر شده بمرتهن مذکور رسانده مرتهن مذبوره وکالتاً محدوده

مذبوره را بقیمت، فروخته مبلغ وجه رهن خود را بگیرد و تتمه را

براهن مسطور رساند و اینخط که عند الحاجت سند کرده بازدهم

شهر ربیع الاول سنه قلمی شد حلیه راهن و مرتهن و هردو مجر

[م جھ ر ل]